پاکستان میں جسم فروشی

صرف بالغان کیلئے:

تحریر:
شبنم سلطانہ

پاکستان میں جسم فروشی

(ایک تلخ حقیقت، ایک چشم کشا جائزہ)

تحقیق و تحریر

شبنم سلطانہ

ٹائیگر بکس

گلشن اقبال کراچی

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب . . . . . پاکستان میں جسم فروشی
مصنف . . . . . شبنم سلطانہ
ناشر . . . . . ٹائیگر بکس
اشاعت ۲۰۰۱ء
قیمت . . . . . ۱۰۰/- روپے ایک سو روپے

فہرست

پیش لفظ
جسم فروشی اور پاکستانی سیاست 5
جسم فروشی اور تعلیمی ادارے 17
لاہور کی ہیرا منڈی میں قائم کوٹھی خانے 22
عتیقہ کا کوٹھی خانہ 22
رحمانے کا کوٹھی خانہ 39
سلطانے کا کوٹھی خانہ 45
فیاض کا کوٹھی خانہ 55
نازلی کا کوٹھی خانہ 60
تنویری کا کوٹھی خانہ 65
جانی بیگم کا کوٹھی خانہ 71
خالدہ کا کوٹھی خانہ 77
طاہرہ بیگم کا کوٹھی خانہ 81
جسم فروشی کی ابتداء 84
پاکستان میں مردانہ جسم فروشی 113
لاہور میں ہیجڑوں کے اڈے 133
گوشی کا اڈہ 134
گڈو رانی کا اڈہ 142
شاہد عرف نائلہ کا اڈہ 145
رحیم عرف ریما کا اڈہ 147
بازار حسن میں ہیجڑوں کے دیگر اڈے 149

آزاد ہیجڑے اور جسم فروشی 152
لاہور---- عام آبادیوں میں جسم فروشی 163
کلیم کا ڈیرہ 173
چاند کا ڈیرہ 175
چوہدری صاحب کا ڈیرہ 177
خالدہ کا ڈیرہ 180
راشدہ کا ڈیرہ 181
بالے کا ڈیرہ 186
ناصرہ کا ڈیرہ 188
رمضانے کا اڈہ 190
کوثری کا اڈہ 192
پٹھانی کا اڈہ 193
گڈوی محلہ 195
کشمیر بلاک 196
کریم پارک کے اڈے 197
والٹن میں شریف کا اڈہ 200
اندرون لاہور کے اڈے 202
نگارخانے اور جسم فروشی 203
دیگر کاموں کی آڑ میں جسم فروشی 225
پرائیویٹ کلینک 230
شادی دفاتر 239
پرائیویٹ دفاتر 244
پرائیویٹ سکولز 247
اشتہاری کمپنیاں اور ادارے 253
ٹریول ایجنسیاں 254

جسم فروشی اور پاکستانی سیاست

بہت سی کتب منظر عام پر آگئی ہیں جن میں بہت زیادہ تفصیل کے ساتھ پاکستانی سیاست کے اہم کرداروں کے ذاتی کردار کے بارے میں ان گنت کہانیاں موجود ہیں۔ بعض لکھنے والوں نے حد سے بڑھی ہوئی دیدہ دلیری کے ساتھ مقتدر سیاستدانوں کے معاشقوں کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ بڑے بڑے اور اہم افراد میں خاں زادہ لیاقت علی خان، ایوب خان، غلام محمد، یحییٰ خان، سکندر مرزا، ذوالفقار علی بھٹو، ضیاء الحق، محمد خان جونیجو، نواز شریف اور بے نظیر بھٹو وغیرہ کے معاشقوں اور ناجائز جنسی تعلقات کی داستانیں عام مل جاتی ہیں۔

ظاہر ہے ایسی داستانوں کو ثابت کرنا بہت مشکل ہے اور ایک طرح سے سینہ گزٹ کی صورت میں ایسی داستانیں ہمیشہ آگے کو بڑھتی رہتی ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نہ صرف ان میں جھوٹ کی آمیزش بڑھ جاتی ہے بلکہ بیان کنندہ کی سیاسی وابستگی یا مخالفت کے باعث ان داستانوں کی جزئیات تک تبدیل ہو جاتی ہیں۔ کون ہے جو ان داستانوں کو چیلنج کرے۔ ایسی داستانوں کے مندرجات کو چیلنج کرنے کا واضح ترین مطلب ہے کہ ذرائع ابلاغ ایسے لاتعداد لوگوں کو بھی معلومات فراہم کر دیں گے جو براہ راست کتب کا مطالعہ نہیں کرتے اور ایسی کہانیوں سے عموماً بے خبر رہتے ہیں۔

یہ بات ہمیشہ زبان زد عام رہی ہے کہ سیاستدان کا کردار داغدار ہوتا ہے۔ جب وہ مقتدر ہوتا ہے تو اس کیلئے لازم ہے کہ وہ اپنے جنسی جذبات جو طاقت کی اہلیت سے براہ راست منسلک ہوتے ہیں، ان کو تسکین پہنچانے کیلئے اپنی سی کوشش کرے۔ عوام یہ جانتے ہیں کہ مقتدر شخص جنسی بے راہ روی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسی لئے آج ہمیں اپنی 53 سالہ قومی تاریخ میں شاید کوئی بھی ایسا حکمران نہیں ملتا جس کے کردار کے بارے میں عجیب و غریب کہانیاں موجود نہ ہوں۔ ہمارے ملک کی غالب آبادی کا بڑا حصہ جنرل ضیاء الحق کی اسلامی طبع کا مکمل معترف رہا اور ضیاء الحق کی صورت میں ایک سچا پکا اور کردار کا غازی شخص ان کے سامنے رہا لیکن جب معلومات کا بہاؤ تیز ہوا تو معلوم ہوا کہ ایک سابق ڈی آئی جی پولیس حاجی

حبیب الرحمٰن کے مطابق ضیاء الحق نہ صرف خوبصورت عورتوں کا رسیا تھا بلکہ وہ غیر ملکی عریاں فلمیں بڑے شوق سے دیکھا کرتا تھا اور ایک بار اس نے یہ فلمیں دیکھیں تو صبح اپنے پرانے دوست عطا ربانی شیفتہ کو کہا "یار ہماری بیویاں تو گائیں بھینسیں ہیں، اصل عورتوں تو مغربی ممالک کی ہیں" عطا ربانی شیفتہ کے بارے میں یہاں تک کہا گیا ہے کہ وہ خود محترم صدر کیلئے خوبصورت اور نوجوان لڑکیوں کا بندوبست کرتا رہا۔ بہت عرصے تک یہ الزام بھی لگایا جاتا رہا کہ صدر ضیاء الحق نے معروف گلوکارہ شمسہ کنول کے ساتھ باقاعدہ شادی کر رکھی تھی لیکن شمسہ کنول نے کبھی بھی اس الزام کی تردید یا تصدیق نہیں کی۔

پاکستان میں اقتدار حاصل کرنے کیلئے عموماً جس نوعیت کی محنت کرنا پڑتی ہے اور اقتدار کی راہداریوں پر قابض ایسے ایسے اداروں میں سے راستہ نکالنا پڑتا ہے۔ اس تگ ودو میں جہاں بے تحاشہ اثر ورسوخ اور دولت کی ضرورت پڑتی ہے وہاں "نسوانی رابطوں" اور ان رابطوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارے کئی قابل احترام ریٹائرڈ فوجی افسران اپنی تحریری یادداشتوں اور زبانی گفتگو میں اس بات کا اقرار کر چکے ہیں کہ انہوں نے کس طرح اپنا مقصد حاصل کرنے کیلئے جسم فروش عورتوں کی عملی مدد حاصل کی۔ ان اعلیٰ عہدیداروں کو یقین ہے کہ ٹیڑھے مقاصد کی برآوری کیلئے اگر موقع محل کی مناسبت سے عورت کا استعمال کیا جائے تو ناکامی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا بلکہ نہ صرف بہتر کامیابی حاصل ہوتی ہے بلکہ مستقبل کے استعمال کیلئے ایک باقاعدہ ریکارڈ بھی دستیاب ہو جاتا ہے اور اگر اس ریکارڈ کا کچھ حصہ ذرائع ابلاغ کو تھما دیا جائے تو "تجربہ شدہ" شخصیت کا سیاسی کیریئر ختم بھی کیا جاسکتا ہے۔

سیاستدانوں اور حکمرانوں کے بارے میں میسر مواد کا معروضی جائزہ لیتے وقت اکثر اوقات یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے فاضل مصنفوں نے ان لوگوں کے جنسی تعلقات کی تشریح کرتے وقت پیشہ ور عورتوں کے ساتھ جنسی تعلقات اور ان کی دوستیوں میں آنے والی غیر پیشہ ور عورتوں کے تعلقات کو ایک ہی نظر سے دیکھا ہے۔ اس کی بڑی وجہ لکھنے والے کی وہ نظریاتی صفائی ہے جو دونوں اقسام کے تعلقات میں تفریق نہیں کرنے دیتی کیونکہ وہ ان تعلقات کو اسلام، قانون اور معاشرے کی نظر سے دیکھتا ہے اور معتوب شخصیت کے منجیے

ادھیڑتا چلا جاتا ہے۔ میرا موضوع خالصتاً پیشہ ور لوگوں سے تعلق رکھتا ہے اور میں نے حتی المقدور کوشش کی ہے کہ کسی بھی شخصیت کے جنسی تعلقات کے بارے میں تحقیق کرتے وقت اس کی ایسی دوستیوں کا ذکر نہ آنے دوں جن کو پیشہ ور جنسی تعلقات کا نام نہ دیا جا سکے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی طاقتور شخصیت کسی ایسی عورت کے ساتھ اپنے جنسی تعلقات استوار کرتی ہے جو باقاعدہ طور پر پیشہ ور نہ ہو اور نہ ہی اس کے خاندان کا تعلق، کسی پیشہ ور جسم فروش خاندان کے ساتھ ہو تو، اس تعلق کو دونوں کا ناجائز یا غیر اخلاقی تعلق تو قرار دیا جا سکتا ہے لیکن ان میں سے فریق ثانی کو پیشہ ور عورتوں کے طور پر نہیں دیکھا جا سکتا۔ ایسی لاتعداد مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں کہ ہماری سیاسی طور پر مقتدر شخصیات نے بعض گھریلو خواتین کے ساتھ نہ صرف اپنے جنسی تعلقات قائم کئے بلکہ بعض نے ان عورتوں کے ساتھ باقاعدہ شادیاں بھی کیں اور یا تو ان شادیوں کو خفیہ رکھا گیا یا پھر ان کے افشاء ہونے کی پرواہ نہ کی گئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے پاس یہ اختیار نہیں کہ میں اس قسم کے تعلق یا شادیوں کو پیشہ ور عورتوں کے ساتھ جنسی تعلقات کے زمرے میں لاؤں۔

البتہ یہ بات بھی زیر غور رہے کہ بعض عورتوں نے اپنے پہلے جنسی تعلق کے بعد باقاعدہ پیشہ ورانہ انداز میں اپنے تعلقات کو آگے بڑھایا اور فوائد حاصل کئے میں ایسی مثالوں کو بھی آپ کے سامنے لانے کی کوشش کروں گا لیکن چونکہ ہمارے مقتدر سیاستدانوں کو اپنی بے تحاشہ طاقت کا اس قدر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اندھا دھند جنسی تعلقات پر یقین رکھتے ہیں اور بعض اوقات ان کے تعلقات میں اتنا زیادہ تنوع آجاتا ہے کہ بیک وقت وہ گھریلو عورتوں کے بھی رسیا ہوتے ہیں اور باقاعدہ پیشہ ور عورتوں کے دیوانے بھی۔ ایسی مثالوں کو بھی سامنے لایا جائے گا۔

پاکستان کے پہلے وزیر اعظم نوابزادہ لیاقت علی خان کی زندگی کا اگر معروضی انداز میں جائزہ لیا جائے تو ان کی سیاسی کج فہمی اور غلطیوں سے قطع نظر ان کے کردار کے بارے میں شاید کوئی ایسا زاویہ نہیں ملتا جس سے ان کے ناجائز جنسی تعلقات کے بارے میں کوئی شک پروان چڑھے۔ ایک تحریر میں نوابزادہ لیاقت علی خان کی رعنا لیاقت علی خان کے ساتھ

شادی کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ سیاستدانوں کے معاشقوں کے ذکر پر مبنی اس کتاب میں مصنف یہ دعویٰ کرتا ہے کہ رعنا لیاقت علی خان آزاد خیال اور جدت کی دلدادہ خاتون تھیں اور لیاقت علی خان نے ایک تقریب کے دوران رعنا کو پھانس لیا تھا۔ لیکن دوسری شادی کرنا لیاقت علی خان یا کسی بھی دوسرے مسلمان کا قانونی حق ہے اور اگر یہ شادی پسند کی ہو تو بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔ اس طرح کی تحقیق کرتے ہوئے انتہائی محتاط انداز اختیار کیا جانا چاہئے تاکہ لکھنے والے کی غیر جانبداری کا تاثر محفوظ رہے۔ لیاقت علی خان کی پوری زندگی میں ایسا کوئی گوشہ نہیں ملتا جس میں کسی ایسے ناجائز تعلق کی آمیزش ہو جس کو غیر قانونی قرار دیا جاسکے۔ جہاں تک مذکورہ بالا نوعیت کی شادی کو معاشقہ قرار دیکر پسند کی شادی کو تنقید کا نشانہ بنانے کی کوشش کا تعلق ہے تو اس کی سمجھ نہیں آتی۔ البتہ اگر لیاقت علی خان کے دور حکومت میں اقتدار کی غلام گردشوں میں گردش کرنے والی پیشہ ور عورتوں کے بارے میں تحقیق کی جاتی تو یقیناً کراچی کی بعض ایسی خواتین کے بارے میں لکھا جاسکتا تھا جنہوں نے مقتدر لوگوں کے ساتھ تعلقات استوار کر کے آبادکاری، نئے پرمٹوں اور ٹھیکوں کے حصول میں کامیابیاں حاصل کیں۔ لیاقت علی خان کو باقاعدہ ایک درخواست بھی دی گئی جس میں انکشاف کیا گیا تھا کہ ان کے سیکرٹریٹ کے بعض اعلیٰ عہدیدار کس طرح ان پیشہ ور عورتوں کے جال میں پھنس کر منظور نظر افراد کو فوائد پہنچا رہے ہیں۔ انہی دنوں شائستہ نامی ایک خاتون نے، جو بھارتی شہر جالندھر سے نقل مکانی کر کے کراچی میں آباد ہوئی تھی، مدر کے علاقے میں باقاعدہ ایک قحبہ خانہ شروع کیا اور عورتوں کی سپلائی کے ناطے لیاقت علی خان کے سیکرٹریٹ میں رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ جب اس کا معاملہ وزیراعظم تک پہنچا تو اس عورت کے سیکرٹریٹ داخلے پر پابندی عائد کر دی گئی اور اس کو پھر کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

دوسرے گورنر جنرل پاکستان مسٹر غلام محمد اور ان کی سیکرٹری مس روتھ بورل کے جنسی تعلقات کے چرچے ہوئے اور غلام محمد پر اس غیر ملکی عورت کے حوالے سے شدید تنقید کی گئی۔ اگر اس بات کو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ مس روتھ بورل کے ساتھ غلام محمد جو

تقریباً معذور کی سی زندگی گزار رہا تھا اس کے جنسی تعلقات تھے، تو یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ غلام محمد کی یہ پرائیویٹ سیکرٹری باقاعدہ پیشہ ور عورت تھی اور اس کے غلام محمد کے علاوہ بھی، کئی لوگوں کے ساتھ جنسی تعلقات تھے۔ بہر حال غلام محمد ساری زندگی یہ وضاحت نہیں کر سکے کہ مس روتھ بورل کے ساتھ ان کے کس نوعیت کے تعلقات تھے؟

اسی طرح سابق وزیر اعظم محمد علی بوگرہ کے خلاف بھی وزیر اعظم آفس کی سوشل سیکرٹری لبنانی عورت کے حوالے سے مبہم سا مواد ملتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ محمد علی بوگرہ کے اس عورت کے ساتھ جنسی تعلقات تھے جو بعد میں شادی کا روپ دھار گئے۔ اس لبنانی عورت کے بارے میں مزید کوائف نہیں ملتے اور نہ ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس عورت کا سابقہ کردار کیا تھا۔ مندرجہ بالا سطور میں تین ایسی شخصیات کا حوالہ دیا گیا ہے جو نوزائیدہ پاکستان کی مقتدر ترین شخصیات تھیں۔ ان کی ذاتی زندگی کو حوالہ بنا کر بعض لوگوں نے ان کے کردار پر انگلی اٹھائی لیکن وہ یہ ثابت نہ کر سکے کہ انہوں نے باقاعدہ پیشہ ور عورتوں کے ساتھ کبھی کوئی میل جول رکھا یا ان عورتوں کو کوئی فائدہ پہنچایا؟

سابقہ تین شخصیات سے ملتا جلتا واقعہ سکندر مرزا کا بھی ہے۔ سکندر مرزا نے ایک ایرانی عورت ناہید کے ساتھ شادی کی۔ ناہید جو کہ پہلے سے شادی شدہ تھی اور اس کا خاوند ایک ایرانی سفیر تھا اس نے اپنے خاوند سے طلاق حاصل کر کے سکندر مرزا کے ساتھ دوسری شادی کی۔ ناہید کو نہ تو کوئی اپنے پہلے خاوند سے طلاق لینے سے روک سکتا تھا اور نہ دوسری شادی سے۔ سکندر مرزا کی اس شادی کے علاوہ کوئی بھی ایسا واقعہ نہیں ملتا جس سے ان کے کردار پر انگلی اٹھائی جا سکے۔ اس پس منظر میں یہ بات قابل غور ہے کہ ایک نئے ملک کے وسائل بہت تھوڑے تھے اور ابھی تک آبادکاری کے مسائل کا پورے ملک کو سامنا تھا اور ذرائع آمدن تقریباً نہ ہونے کے برابر تھے اس صورت میں کوئی بھی سرکاری یا سول عہدیدار بڑے پیمانے پر فضول خرچی نہیں کر سکتا تھا اور جب تک خزانہ لبالب نہ بھرا ہو، اقتدار بھی محض کھوکھلی سی چیز محسوس ہوتی ہے اس لئے اس زمانے تک اقتدار میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف موقع پرست لوگوں کا رجحان کچھ زیادہ نہ تھا۔ ایک وزیر اعظم باقاعدہ بچت مہم چلاتا ہو اور اس

کے آفس کے فنڈز بہت زیادہ محدود ہوں اور جب تک نئے مواقع میسر نہ ہو، وہ کسی کو بہتر طریقے سے اکاموڈیٹ نہ کر سکے تو اس صورت میں اس کی طاقت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کیونکہ بعد کے حالات ہمیں بتاتے ہیں کہ کس طرح جب وسائل بڑھے، ساتھ ہی اقتدار بڑھا، اختیارات بڑھے اور فنڈز کا ریلہ آیا تو پھر صاحب اقتدار لوگوں نے دولت اور اختیارات کی تقسیم کے بل بوتے پر اپنے حواریوں میں ایسے لوگوں کو بھی شامل کیا جو باقاعدہ پیشہ ور تھے اور ان کا پیشہ صاحب اقتدار لوگوں کے سامنے خوبرو عورتوں کو پیش کرنا اور اپنے مقاصد حاصل کرنا تھا لیکن ایوب خان سے پہلے تک یہ نوبت نہیں آسکی اور پیشہ ور جسم فروش عورتوں کو اقتدار کے ایوانوں میں رسائی حاصل نہیں ہو سکی تھی۔ ابتدائی حالات میں عیاشی کے لوازمات کی قلت کے باعث تقریباً تمام حکمرانوں نے دوسری شادی کرنے تک یا پھر نہایت خفیہ انداز میں کسی عورت کے ساتھ تعلقات قائم کرنے تک اپنے آپ کو محدود رکھا۔ خوش قسمتی سے ابھی تک اس تاثر نے اپنی جڑیں گہری نہیں کی تھیں کہ حکمران ناقابل یقین حد تک طاقتور ہیں اور اگر وہ چاہیں تو اپنے منظور نظر افراد کی قسمت تبدیل کر سکتے ہیں لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر نہ چل سکی اور پاکستان میں اقتدار طاقت کا ناقابل یقین حد تک منبع قرار پایا۔ برسر اقتدار لوگوں نے دوستوں اور دشمنوں کو مقتدر کی آنکھ سے دیکھنا شروع کیا اور سرکاری خزانے سے نوازشات کا سلسلہ شروع ہوا۔

ایوب خان کے زمانے میں پاکستان کی طاقت اور اقتدار کی نئی تعریف متعین ہوئی۔ طاقتور حکمران کو پاکستانی عوام نے پہلی بار اپنے سر پر مسلط ہوتے دیکھا۔ ایوب خان نے اپنے دور اقتدار میں اپنی طاقت اور اختیارات کے بل بوتے پر اپنے لاتعداد منظور نظر افراد کو مراعات سے نوازا۔ بے شمار بیوروکریٹس اور دیگر سرکاری عہدیداروں کو اراضی الاٹ کی گئی۔ انہی دنوں ایوب خان کے شبانہ نامی ایک طوائف کے ساتھ تعلقات کے بارے میں کھسر پھسر ہوئی لیکن زیادہ تفصیلات منظر عام پر نہ آسکیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ شبانہ نامی یہ خاتون کراچی کی ایک پیشہ ور طوائف تھی جس پر الزام لگایا جاتا رہا کہ اس کا تعلق بھارت کی ایک خفیہ ایجنسی کے ساتھ ہے۔ ایوب خان شبانہ کے عزیزوں اور رشتہ داروں کو مراعات دیتے

ہے اور خود شبانہ کو صدارتی مہمان کا سا پروٹوکول دیا جاتا رہا۔ شبانہ کے علاوہ کرسٹائن کیلر کا م بھی ایوب خان کے "تعلق داروں" کی فہرست میں شامل رہا ہے لیکن اس عورت کو باقاعدہ پیشہ ور عورت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ایوب خان کو پہلا پاکستانی حکمران قرار دیا جا سکتا ہے جس نے اپنے اقتدار کے دوران ایک پیشہ ور جسم فروش عورت کے ساتھ تعلقات قائم کئے اور س کو سرکاری خزانے سے مالی امداد اور مراعات دیں۔ ایوب خان کا دفاع کرنے والے اس کے نمک خوار سابق بیوروکریٹس نے اگرچہ اپنی یادداشتوں میں ایوب خان کو فرشتہ صفت حکمران کے طور پر پیش کیا ہے لیکن ایوب خان کے شبانہ کے ساتھ تعلق کے بارے میں ان کے پاس بھی کوئی وضاحت یا دلیل نہیں۔ بعض لوگ یہ الزام بھی لگاتے ہیں کہ شبانہ کا تعلق بھارتی ایجنسی کے ساتھ تھا اور وہ ایوب خان کے ساتھ اس لئے راتیں گزارتی تھی کہ وہ اہم ترین معلومات اور راز حاصل کر کے بھارت کو پہنچائے اور وہ خاتون اس معاملے میں خاصی کامیاب ہوئی۔ اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ شبانہ کا تعلق کسی بھارتی ایجنسی کے ساتھ تھا البتہ یہ ضرور معلوم ہوا ہے کہ شبانہ کراچی کی رہنے والی تھی اور اس نے کراچی کے بعض کاروباری افراد کے ساتھ بھی اپنے تعلقات استوار کر رکھے تھے۔ جب اس کا تعلق ایوب خان کے ساتھ مضبوط ہوا تو اس نے کراچی کے پرانے تعلقات ختم کر لئے اور ایوب خان تک محدود ہو کر رہ گئی۔ شبانہ کے بارے میں اس سے زیادہ معلومات نہیں ملتیں۔ ایک دھائی پہلے کراچی سے شائع ہونے والے ایک ہفت روزہ میگزین نے اپنی ایک تحقیقاتی رپورٹ میں یہ انکشاف کیا کہ اورنگی ٹاؤن کے علاقے میں کراچی کا سب سے بدنام قحبہ خانہ ہے جس کو پولیس اور مقامی انتظامیہ کی مکمل سرپرستی حاصل ہے اور اس اڈے سے شبانہ نامی ایک خاتون نہ صرف اعلیٰ عہدیداروں کو لڑکیاں سپلائی کرتی ہے بلکہ ایم کیو ایم (حقیقی) کے بعض مرکزی رہنماؤں کو بھی لڑکیاں فراہم کی جاتی ہیں۔ مذکورہ ہفت روزہ نے شبانہ نامی خاتون کو اس جسم فروشی کے اڈے کی مالکن ظاہر کیا اور اس کی داستان بیان کرتے ہوئے انکشاف کیا کہ ایوب خان کے دور میں اس کی رسائی اعلیٰ ترین سرکاری عہدیداروں تک تھی۔ ہفت روزہ نے الزام لگایا کہ شبانہ نامی اس خاتون نے ایوب خان کی دوستی کی وساطت سے کراچی کے مہنگے ترین علاقوں میں

قیمتی پلاٹ حاصل کئے اور صدر میں ایک عدد جدید ترین پلازہ بھی اس کی ملکیت ہے جس کی مالیت 15 کروڑ سے زائد ہے۔

اس ہفت روزہ میگزین نے اپنی اس اشاعت میں یہ دعویٰ بھی کیا کہ شبانہ جسم فروشی کے اڈے کیلئے پنجاب اور سرحد سے لڑکیاں لاتی ہے۔ اس کی عمر 60 سال کے قریب لیکن وہ ایک متحرک رہنے والی خاتون ہے جس کو اپنے روابط بڑھانے اور ان سے کام لینے کا خوب ڈھنگ آتا ہے۔ شبانہ نے اپنے پرانے تعلقات کی اس طرح "لاج" رکھی کہ جب بھی مرحوم ایوب خان کا سپوت گوہر ایوب کراچی جاتا ہے تو اس کو ایک فائیو سٹار ہوٹل میں شبانہ عیاشی کا پورا سامان فراہم کرتی ہے۔ یہ ایک عشرہ پہلے کی بات ہے نجانے اب یہ شبانہ زندہ ہے یا مر گئی اور اس کے جسم فروشی کے اڈے کا کیا حال ہے، اس کے بارے میں بالکل معلومات نہیں ملتیں۔

ایوب خان اور شبانہ کے تعلق کے بارے میں ایوب دور میں بہت کم معلومات سامنے آئی ہیں لیکن بعد میں بہت سے لکھنے والوں نے شبانہ اور ایوب خان کے اس تعلق کو بھرپور انداز میں اچھالا۔ ایوب خان کے بعد نئے حکمران یحییٰ خان کا نام اس حوالے سے زیادہ شہرت کا حامل ہے۔ یحییٰ خان کے دور حکومت کو اصل میں 12 عورتوں کی حکمرانی کے دور سے یاد کیا جاتا ہے۔ ایوان صدر میں جسم فروش عورتوں کا باقاعدہ میلہ لگا رہتا اور یحییٰ خان ہر وقت ان عورتوں سے دل بہلاتے رہتے۔

یحییٰ خان ایک کمزور اور تماشبین قسم کی شخصیت کے مالک تھے وہ بے تحاشہ شراب نوشی کرتے اور ہر وقت جسم فروش عورتوں میں گھرے رہتے۔ یحییٰ خان کے دور میں جس عورت نے بہت زیادہ شہرت پائی وہ گجرات کی رہائشی اقلیم اختر عرف جنرل رانی تھی۔ جنرل رانی جو بذات خود حسین و جمیل عورت تھی اس نے باقاعدہ عورتوں کی ایک لاٹ یحییٰ خان کیلئے فراہم کی۔ جنرل رانی کا لقب اس کو جنرل یحییٰ خان کے ساتھ تعلق کی وجہ سے دیا گیا۔ یحییٰ خان کی دیگر تعلق دار عورتوں میں بیگم کے حسین اور فلمسٹار ترانہ کا نام بھی آتا رہا۔ بہر حال یحییٰ خان نے برسر اقتدار ہوئے ہوئے باقاعدہ جسم فروش عورتوں کے ساتھ تعلق قائم کیا اور ان کو

رکاری خزانے سے بے تحاشہ مراعات بخش دیں۔

جسم فروش عورتوں کے جھرمٹ میں یحییٰ خان کی لاتعداد تصاویر اخبارات وجرائد میں شائع ہوئیں اور ان کے دور حکومت میں بعض اعلیٰ سرکاری عہدیداروں نے بھی جسم فروش عورتوں کے ساتھ تعلقات قائم کیئے اور یوں پہلی بار اعلیٰ سطح کے مقتدر طبقوں نے جسم فروشی کے ساتھ اپنے تعلق کا آغاز کیا اور اس دھندے سے تعلق رکھنے والوں کو اقتدار کی راہ داریوں سے روشناس کرایا۔ یحییٰ خان کے دور میں ان کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ماتحت ان کیلئے باقاعدگی کے ساتھ عورتوں کا اہتمام کرنے لگے اور "صاحب" کو خوش کرنے کیلئے پیشہ ور عورتوں کا "سرکاری" استعمال شروع ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ یحییٰ خان کی ترجیحات پاکستان کی ترجیحات سے قطعی طور پر مختلف تھیں اس لئے پاکستان کو نہ صرف اپنے سلامتی سے متعلقہ امور میں نقصان اٹھانا پڑا بلکہ انتظامی حوالے سے بھی اس عہد کو برے لفظوں سے یاد کیا جاتا ہے۔ اصل میں حکمرانوں کو خوش کرنے کیلئے عورتوں کی فراہمی کا سلسلہ پاکستان میں باقاعدگی کے ساتھ یحییٰ خان دور میں شروع ہوا اور جو اس وقت نہ صرف سب سے موثر طریقہ قرار دیا جاتا ہے بلکہ سب سے زیادہ منافع بخش اور کم رسک والا کاروبار بھی قرار دیا جاتا ہے۔

یحییٰ خان کے دور میں ہی اس کی منظور نظر اقلیم اختر عرف جنرل رانی نے اس کے ساتھ تعلقات قائم کیئے اور اس کی وساطت سے یحییٰ خان کو عورتوں کی سپلائی کا کام ہونے لگا۔ یحییٰ خان کے دور میں ریاست کے عہدیداروں کا جسم فروش عورتوں کے ساتھ تعلقات بننے کا آغاز ہوا اور یہ سلسلہ تادم تحریر جاری ہے۔ بھٹو دور میں بھی ان کی کابینہ کے بعض ارکان کو اس وقت کی مشہور طوائفیں فراہم کی جاتی رہیں اور یوں جسم فروشی کا یہ کاروبار آگے بڑھتا رہا۔ یہی صورتحال ضیاء الحق دور میں بھی قائم رہی اور اس دوران اعلیٰ عہدے حاصل کرنے والے سیاستدانوں نے باقاعدہ جسم فروش عورتوں کے ساتھ تعلقات قائم کیئے اور ان سے حظ اٹھایا۔

1988ء میں بننے والی بے نظیر حکومت میں بھی اعلیٰ سیاسی عہدیداروں کی طرف سے ایسی معلومات ملتی رہیں کہ انہوں نے باقاعدہ جسم فروش عورتوں کے ساتھ تعلقات قائم

کرنے اس پیشے کی ایک طرح سے معاونت کی اور اس میں اپنا حصہ ڈالا۔ خود وزیر اعظم بے
نظیر آصف علی زرداری پر بھی الزامات لگائے گئے کہ اس نے اسلام آباد، کراچی اور لاہور
بعض جسم فروش عورتوں کے ساتھ تعلقات استوار کئے۔ یہی صورتحال نواز شریف
دونوں حکومتوں کے دوران بھی رہی اور ان حکومتوں کے اعلیٰ عہدیداروں پر بالکل اسی نوعیت
کے الزامات عائد کئے گئے جس طرح کے بے نظیر کی دونوں حکومتوں کے دوران اعلیٰ
عہدیداروں پر عائد کئے گئے تھے۔

اس دوران اس رجحان نے بہت زیادہ زور پکڑا کہ سیاستدانوں اور اعلیٰ بیوروکریٹس
فلم سے تعلق رکھنے والی باقاعدہ جسم فروش عورتوں کے ساتھ تعلقات استوار کئے۔
عورتیں فلموں میں ہیروئن کے طور پر بھی کام کرتی تھیں لیکن ان کی اصل کمائی ان کے جسم
کرتے تھے اور انہوں نے پوری قوت کے ساتھ اپنے جسم استعمال کئے۔ ان عورتوں کو چونکہ
میڈیا بہت زیادہ کوریج دیتا تھا اس لئے ان کے بارے میں ایک ایسا تاثر تھا جو ان کی شخصیت
پر کشش اور جاذب بناتا تھا۔ فلمی ہیروئنوں اور اداکاروں نے چونکہ جسم فروشی کے پیشے
کو کھلی طرح اپنا لیا تھا اس لئے انہوں نے اس کام کی غرض سے باقاعدہ سیکرٹری بھرتی
رکھے ہوئے تھے جو ان کے گاہکوں کے ساتھ وقت اور معاوضہ طے کرتے اور اس طرح یہ کاروبار
ہوتے تھے۔ سیاستدان ان کے اصل گاہک تھے جو ان کو بعض اوقات حکومتی عہدے کے دباؤ
کے تحت حاصل کر لیتے۔

پاکستانی سیاست میں جسم فروشی کے عمل دخل سے انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس
روایت نے سیاست اور سیاستدانوں پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں۔ البتہ یہ حقیقت
ضرور مدنظر رہنی چاہئے کہ برسر اقتدار جماعت کے ارکان اور عہدیدار اس روایت کو آگے
بڑھانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں چونکہ اپوزیشن عموماً زیر عتاب ہوتی ہے اس لئے اس
کے ارکان حزب اختلاف کے طور پر عام زندگی میں زیادہ متحرک نہیں ہوتے اور اسی وجہ
سے ان کا براہ راست رابطہ طوائفوں، فلمی ہیروئنوں اور دیگر جسم فروش عورتوں کے
ساتھ نہیں ہوتا۔

پاکستانی سیاستدانوں میں سے 70 فیصد کا تعلق ان جسم فروشوں سے ہے جو ان کو گھروں، ہوٹلوں اور گیسٹ ہاؤسز وغیرہ میں لڑکیاں فراہم کرتی ہیں۔ یہ ارکان عموماً اس کام کو نہایت رازداری کے ساتھ سرانجام دیتے ہیں لیکن پھر بھی جسم فروشوں کے آپسی رابطوں کے باعث ان سیاستدانوں کے تعلقات کے بارے میں خبریں منظر عام پر آجاتی ہیں۔ ان خبروں کو عموماً اخبارات وغیرہ میں شائع نہیں کیا جاتا کیونکہ اس صورت میں سیاستدان اور اخبار مالکان کے درمیان ٹکراؤ کا خطرہ ہوتا ہے اور اگر جسم فروش عورتوں سے تعلق رکھنے والا شخص حکومت میں بیٹھا ہے تو اس صورت میں اخبار کو نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔ اس طرح کی خبریں یا تو رسالوں وغیرہ میں اشاروں کے ساتھ شائع کی جاتی ہیں یا پھر یہ سینہ بہ سینہ سفر کرتی ہیں اور رفتہ رفتہ تاریخ کا حصہ بن جاتی ہیں۔ سیاستدانوں کو پوچھنے والا کوئی نہیں ہوتا اور جسم فروش عورتوں کی پشت پناہی اس طرح کے طاقتور لوگ کر رہے ہوتے ہیں لہٰذا یہ واقعات اور ان کی تفصیلات بہت کم سامنے آتی ہیں۔

ایک اداکارہ نے بتایا کہ اس نے سو میں سے شاید پانچ فیصد ایسے لوگ دیکھے ہیں جو سیاستدان ہوں اور ان کی جماعت برسر اقتدار ہو اور وہ جسم فروش عورتوں کے ساتھ رابطہ نہ رکھیں اور ان سے لطف نہ اٹھائیں۔ البتہ ایسے لوگ بھی مل جاتے ہیں جو ان جسم فروش عورتوں کو باقاعدہ رکھیل بنا کر رکھتے ہیں اور اکثر تو اس دوران اولاد بھی پیدا کر لیتے ہیں اور اگر ان کا کیریئر اور مجبوری سامنے ہو تو ان عورتوں کے ساتھ خفیہ شادی بھی کر لیتے ہیں۔ یہ شادیاں زیادہ دیر نہیں چلتیں اور دونوں میں علیحدگی ہو جاتی ہے۔ علیحدگی کی صورت میں عموماً مرد اولاد اپنے پاس رکھ لیتے ہیں اور عورتیں آزاد ہو کر دوبارہ اپنے سابقہ دھندے سے وابستہ ہو جاتی ہیں۔

اس سے انکار نہیں کہ پاکستانی سیاستدان جسم فروش عورتوں کے ساتھ تعلقات رکھتے ہیں اور ان کو فوائد پہنچاتے ہیں۔ ایسی عورتوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جو سیاستدانوں کو لڑکیاں فراہم کرتی ہیں اور اس کے بدلے میں لاکھوں کروڑوں روپے کے مفادات حاصل کرتی ہیں۔ سیاستدانوں کی جنسی کرپشن کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور اب اس پر مزید لکھنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ بہت سے لکھنے والوں نے مختلف حوالوں کے ساتھ پاکستانی

سیاستدانوں کے اس کردار کے بارے میں لکھا ہے لیکن اب اس لکھے ہوئے کو ثابت کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ لکھنے والوں نے لوگوں کے تاثرات اور انکشافات کو تاریخ بنادیا ہے لیکن اگر اس کو ثابت کرنے کی کوشش کی جائے تو ثبوت ملنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہیں۔ اگر یہ سیاستدان عدالتوں میں چلے جائیں تو لکھنے والے ان کے خلاف جو ثبوت لائیں گے ان کی حقانیت اور سچائی کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ عام لوگوں کا خیال ہے کہ اس طرح کے زیادہ تر انکشافات سیاسی مخالفت کی بنیاد پر یا تو کئے گئے ہیں یا پھر کرائے گئے ہیں اور اس سارے عمل کے پیچھے خفیہ اداروں کا بھی اہم کردار ہے۔

جسم فروشی اور تعلیمی ادارے

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بے روزگاری کے سیلاب نے پاکستانی معاشرے کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ تقریباً دو عشروں سے ملک میں بے روزگاری کا گراف تیزی سے بلند ہوا ہے۔ بے روزگاروں کی سب سے بڑی تعداد ملک کی اعلیٰ درسگاہوں سے تعلیم حاصل کر کے نکلی ہے۔ حکومت پاکستان کے ایک سروے کے مطابق اس وقت ملک میں 25 ہزار سے زائد ڈاکٹر اور 22 ہزار سے زائد انجینئر بے روزگار ہیں۔ ہر سال ہزاروں نئے ڈاکٹر اور انجینئر اپنی تعلیم مکمل کر کے بے روزگاروں کی فوج میں شامل ہو جاتے ہیں۔ حیران کن امر یہ ہے کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ملک کے اداروں میں ان اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی کھپت نہ ہونے کے برابر ہے، تعلیمی اداروں میں ان کی نشستیں کم نہیں کی گئیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ اگر معاشی طور پر مستحکم خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں تو بیرون ملک چلے جاتے ہیں اور اگر ان کا تعلق غریب خاندانوں سے ہے تو پھر ان کی اکثریت بے روزگاری سے تنگ آکر مختلف کام کرنے لگ جاتی ہے جن میں ڈکیتی اور اغواء تک کے "کام" شامل ہوتے ہیں۔

معاشرے میں تیزی کے ساتھ بڑھتی ہوئی غربت نے لاتعداد خاندانوں کو اپنے آبائی پیشے بدلنے پر مجبور کیا ہے کیونکہ مجموعی طور پر "مندے" کی کیفیت نے 80 فیصد خاندانوں میں غربت بانٹ دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج سمگلنگ اور دوسرے ایسے جرائم میں ملوث لوگوں کی تعداد ماضی کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ہے۔ معاشرے میں فراڈ اور دھوکہ دہی کا مرض بڑھا ہے اور لوگوں نے ایسے حربوں سے دولت کمانے کی کوشش کی ہے جن کو کوئی بھی معاشرہ جائز قرار نہیں دیتا۔

بے روزگاری کے نظر آتے ہوئے عفریت کے باوجود محض امید کی بناء پر تعلیم دلوانے کا سلسلہ جاری ہے اور والدین یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ تعلیم کے حصول کے بعد ان کی اولاد کوئی بہتر ملازمت حاصل نہیں کر سکے گی، تعلیم دلوانے کی کوشش کرتے ہیں۔ تیزی کے ساتھ

تبدیل ہوتے ہوئے معاشرے میں نوجوان نسل کی ضروریات بے تحاشہ بڑھ چکی ہیں چونکہ والدین کی آمدنی میں اتنی ہی تیزی کے ساتھ کمی ہوئی ہے اس لئے اولاد کی ضروریات پوری کرنا والدین کیلئے مشکل ہو گیا ہے اور اگر اولاد مہنگے تعلیمی اداروں میں زیر تعلیم ہو تو اس کی روزمرہ کی ضروریات اور بھی بڑھ جاتی ہیں۔ ذرائع ابلاغ اور الیکٹرانک میڈیا نے نوجوان نسل میں فیشن اور گلیمر جیسی چیزوں کو متعارف کرایا ہے۔ جس سے ماضی میں قائم رہنے والے توازن کا برقرار رہنا نہایت مشکل ہو گیا ہے۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اپنی ضروریات پوری نہیں کر سکتے۔ 95 فیصد لڑکے اور لڑکیوں کے والدین اتنی مالی سکت نہیں رکھتے کہ وہ ان کیلئے جدید وضع کے لباس خرید سکیں یا ان کی سواری کیلئے موٹر سائیکل یا کار کا بندوبست کر سکیں۔ یہ وہ موڑ ہے جہاں نوجوانوں میں احساس محرومی بڑھتا ہے۔ نوجوان طالب علم طلبہ تنظیموں میں شامل ہو کر اپنی خواہشات پوری کرنے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ لڑکیاں مالدار لڑکوں کے ساتھ تعلقات استوار کر کے اپنی خواہشات کی تکمیل اور احساس محرومی کا تدارک کرنے کی خواہش مند ہوتی ہیں۔

تعلقات کا یہ سلسلہ اس وقت اچانک ٹوٹ جاتا ہے جب معاشی طور پر مضبوط لڑکے کا سابقہ تعلق سے جی بھر جاتا ہے اور وہ نئے مواقع کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے چونکہ نئے دوست تلاش کرنے کیلئے اس کو کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا اس لئے وہ اپنے پرانے تعلق سے قطعی لاتعلق ہو جاتا ہے۔ وہ لڑکی جس نے اپنی حالت سدھارنے کیلئے یہ تعلق قائم کیا تھا، اس کا کوئی پرسان حال نہیں رہتا اور وہ ناامیدی اور مایوسی کے عالم میں یا تو خودکشی کا سوچتی ہے یا پھر اپنے آپ کو حالات پر چھوڑ دیتی ہے۔ اس نوعیت کے تعلق کی بنیادی شرط جنسی تعلقات پر منحصر ہوتی ہے اور عموماً لڑکیاں حاملہ ہو جانے کے بعد چوری چھپے اسقاط حمل کے ناگزیر عمل سے گزرتی ہیں اور ان کے وجود میں شامل ایک قدرتی خوف ختم ہو جاتا ہے۔ اب انہیں زندہ رہنے کیلئے زیادہ بے باکی کا مظاہرہ کرنا ہوتا ہے اور وہ اپنے وجود کو پیش کرنے کیلئے بالکل تیار ہوتی ہیں۔ والدین عموماً ان حالات سے بے خبر ہوتے ہیں اور ان کے سامنے ان کی اولاد کے شاندار اور تابناک مستقبل کی جھلک ہوتی ہے جس کو وہ ہر وقت دیکھتے رہتے ہیں۔

مذکورہ بالا سطور میں ایک خاکہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کس طرح نوجوان لڑکیاں غربت اور محرومی کے باعث جسم فروشی پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ یہ لڑکیاں بالآخر پیشہ ور لوگوں کے ہاتھ لگتی ہیں اور ساری زندگی اس پیشے سے جان نہیں چھڑا سکتیں۔ یہ سلسلہ آگے بڑھتا ہے اور ان کی اولاد گھر سے ہی "تربیت" لیکر جوان ہوتی ہے اور والدین کے پیشے کو آگے بڑھانے میں جت جاتی ہے۔

تعلیمی اداروں میں جسم فروشی کے رجحان کا جائزہ لیتے وقت یہ بات مد نظر رکھنا ضروری ہے کہ تعلیمی ادارہ کس قسم کی آبادی کے لوگوں کے بچوں کو تعلیم دیتا ہے۔ آبادی کی معاشی و سماجی حالت کیسی ہے؟ اگر تعلیمی ادارہ اپنا ہوسٹل بھی رکھتا ہے تو پھر اس ادارے کی کیفیت کیا ہوگی؟ ہوسٹل میں رہائش اختیار کرنے والی لڑکیوں کا تعلق کس سماجی حیثیت کے حامل خاندانوں سے ہے؟ جہاں تعلیمی ادارہ اور اس کا ہوسٹل واقعہ ہے اس کے اردگرد کس قسم کی آبادی ہے؟ اور ہوسٹل کی انچارج کس طرح کی خاتون ہے؟ یہ تمام چیزیں ملحوظ خاطر رکھنا لازمی ہے۔

جب ہم اس حوالے سے تحقیق کرتے ہیں تو مختلف قسم کے نتائج اور حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر کراچی کے تعلیمی اداروں میں جسم فروشی کا رجحان لاہور کے تعلیمی اداروں میں پائی جانے والی جسم فروشی کی روایت سے مختلف ہے، اسی طرح اسلام آباد کے تعلیمی اداروں میں اور راولپنڈی کے تعلیمی اداروں میں جسم فروشی کی روایت اور زیادہ مختلف ہے۔ پشاور اور کوئٹہ کے تعلیمی اداروں میں بھی جسم فروشی کے آثار ملتے ہیں لیکن ایک سخت گیر سماج کے باعث ان کی روایات بہت زیادہ مختلف ہیں۔ خصوصاً پشاور کے تعلیمی اداروں میں موجود اس روایت کو جسم فروشی سے زیادہ عادتاً جنسی تعلقات کا نام دیا جا سکتا ہے جس میں بعض اوقات تحفے تحائف کا تبادلہ بھی شامل ہوتا ہے جو لڑکی اور لڑکے کو آپس میں جوڑے رکھتا ہے۔ اس کی دوسری بڑی وجہ وہ سماجی خوف بھی ہے جو لڑکی اور لڑکے کو اپنی حدود سے تجاوز کرنے سے روکتا ہے۔ خاندانوں کی آپسی دشمنیاں، ان دشمنیوں میں مارے جانے والے لوگوں کی داستانیں اور خصوصاً ایسی دشمنیوں کے بارے میں مبالغہ آمیز داستانیں جو

عزت کے نام پر شروع ہوئیں اور کسی ایک عورت کی بے حرمتی کے باعث درجنوں لوگوں کو بے دردی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا جیسے قصے عموماً طالب علم لڑکیوں اور لڑکوں کو آپس میں جنسی تعلقات استوار کرنے سے باز رکھتے ہیں۔ اسی طرح کی روایت سرحد اور بلوچستان سے منسلک ہے لیکن پنجاب کے تعلیمی اداروں میں زیر تعلیم لڑکے لڑکیوں کے سامنے اس طرح کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ انہیں عموماً یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی بھی قسم کے افشاء کے بعد ان کی ذاتی زندگیوں کو خطرہ ہو سکتا ہے لیکن ان کے خاندان محفوظ رہیں گے۔ اس کے علاوہ سماجی لحاظ سے سرحد اور بلوچستان کی لڑکیوں کی نسبت زیادہ آزادی کے باعث بھی مذکورہ بالا خطرے کے امکانات کم ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر لاہور کے کسی تعلیمی ادارے کا ہوسٹل میں مقیم لڑکی اسقاطِ حمل کیلئے دو تین روز کیلئے کسی ڈاکٹر یا نرس کے پاس زیر علاج رہ سکتی ہے لیکن سرحد اور بلوچستان کی لڑکیوں کیلئے شاید ایسا قدم اٹھانا آسان نہیں، ہاں البتہ ہوسٹل میں مقیم لڑکیوں کیلئے ایسا کرنا چنداں مشکل نہیں۔

کراچی کے تعلیمی اداروں میں زیر تعلیم لڑکیوں اور لڑکوں کے آپسی تعلقات کے بعد عموماً نوبت لڑکی کی طرف سے جسم فروشی کی طرف مائل ہونے تک آتی ہے۔ کراچی کی گنجان آبادی اور متنوع سماجی حالات عموماً پیشہ ور عورتوں کو تحفظ دیتے ہیں اس لئے باقاعدہ جسم فروشی کے دھندے کیلئے بظاہر کوئی خطرات نظر نہیں آتے۔ کراچی کے جسم فروشی کے اڈوں کا ایک سروے بتاتا ہے کہ 60 فیصد پیشہ ور عورتیں جو اندرون سندھ کے پسماندہ علاقوں سے تعلق رکھتی ہیں پہلے کراچی کے تعلیمی اداروں میں (مخلوط تعلیم والے ادارے) زیر تعلیم تھیں جہاں ان کی غربت نے انہیں بااثر خاندانوں سے تعلق رکھنے والے لڑکوں کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرنے پر مجبور کیا۔ یہ تعلقات ہمیشہ عارضی نوعیت کے ثابت ہوتے ہیں۔ ان بے چاری لڑکیوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا اور ان کی اکثریت حاملہ ہو گئی۔ اسقاطِ حمل کے بعد 95 فیصد لڑکیوں نے جسم فرشی کے باقاعدہ اڈوں سے رجوع کیا اور تعلیم ادھوری چھوڑ کر جسم فروشی کا دھندہ شروع کر دیا۔ ان کے خاندان ان کی تلاش میں ناکامی کے بعد انہیں بھول گئے اور یہ لڑکیاں جسم فروشی کے اڈوں پر انتہائی کسمپرسی کی زندگی گزارتی رہیں۔

تعلیمی اداروں میں جسم فروشی کا رجحان بہت زیادہ نہیں لیکن پھر بھی لاہور اور کراچی کے بعض میڈیکل کالجوں کی لڑکیاں جن کا تعلق ایسے خاندانوں سے تھا جن کی روایات مستحکم نہ تھیں وہ اس پیشے کی طرف مائل ہوئیں اور یہ سلسلہ اس وقت بھی جاری ہے اور شاید اس کو روکنا ممکن نہیں۔ نوجوان لڑکیاں مختلف نوعیت کی سماجی و معاشی محرومیوں کے باعث اس پیشے کی طرف مائل ہو جاتی ہیں اور وہ اپنے گاہک کی تلاش کر لیتی ہیں۔ زیادہ تر ان لڑکیوں کے گاہک وہ لوگ ہوتے ہیں جو ان کو شروع میں سنہرے خواب دکھا کر اس پیشے کی طرف آنے پر مجبور کر دیتے ہیں اور جب وہ اس گرداب میں پھنس جاتی ہیں تو پھر ان کا کوئی پرسان حال نہیں رہتا۔

لاہور اور کراچی کے تعلیمی اداروں اور میڈیکل کالجوں میں پڑھنے والی لڑکیوں میں سے بعض اس دھندے کے ساتھ وابستہ ہیں اور ان کے گاہک زیادہ تر ان کو ان کے ہوسٹلوں سے ساتھ لے جاتے ہیں اور تسکین حاصل کرنے کے عوض ان کو شاپنگ اور دیگر تحفے تحائف وغیرہ دیتے ہیں۔ یہ لڑکیاں جب اپنی تعلیم مکمل کر کے ان اداروں کو چھوڑتی ہیں تو ان میں سے اکثریت کی ان کے والدین شادی کر دیتے ہیں اور یوں ان کا عارضی دھندہ ان سے چھوٹ جاتا ہے۔ لیکن بہت تھوڑی تعداد اس کے بعد بھی جسم فروشی کے دھندے کے ساتھ منسلک رہتی ہے۔

لاہور کی ہیرا منڈی میں قائم کوٹھی خانے

عتیقہ کا کوٹھی خانہ

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ ہیرا منڈی کی مشہور طوائف عتیقہ نے ٹبی گلی کے کنارے پر بازار شیخوپوریاں میں باقاعدہ ایک کوٹھی خانہ قائم کر رکھا ہے۔ اس کوٹھی خانے پر 24 گھنٹے جسم فروشی کا کاروبار اپنے عروج پر رہتا ہے۔ چوبیس گھنٹے کھلے رہنے والے سرکاری اداروں کی طرح اس کوٹھی خانے پر بھی آٹھ آٹھ گھنٹے پر مشتمل تین شفٹیں چلتی ہیں۔ عتیقہ کے کوٹھی خانے پر دلال کے طور پر کام کرنے والے ایک شخص الیاس نے بتایا کہ اس وقت کوٹھی خانے پر جسم فروخت کرنے والیوں کا بہت زیادہ رش ہے۔ اس سے پہلے کبھی اتنی زیادہ تعداد میں یہ پیشہ ور عورتیں اڈے پر نہیں آئیں۔ ان عورتوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے باعث عتیقہ کے اڈے کے ریٹ بہت کم ہو گئے ہیں۔ پہلے اس اڈے پر بلکہ کوٹھی خانے پر تھوڑی تعداد میں عورتیں پیشہ کرنے کیلئے آتی تھیں لیکن بے روزگاری اور بڑھتی ہوئی مہنگائی کے باعث ان اڈوں پر عورتوں کی تعداد بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔

عتیقہ ایک 45 سالہ طوائف ہے جو گزشتہ بیس پچیس برسوں سے باقاعدگی کے ساتھ جسم فروشی کر رہی ہے۔ اس نے محکمہ انکم ٹیکس کے ایک عہدیدار کے ساتھ شادی کر رکھی ہے۔ اس کے بارے میں اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ اس نے مذکورہ آفیسر کے ساتھ شادی نہیں کی بلکہ وہ اس کے ساتھ اپنے آپ کو نتھی کر کے لوگوں پر رعب ڈالتی ہے۔ عام لوگوں کے مطابق عتیقہ کا یہ دوست اس کے "کاروبار" میں حصہ دار ہے اور اس کی وساطت سے عتیقہ کے کوٹھی خانے سے لڑکیاں انکم ٹیکس کے افسروں کو سپلائی کی جاتی ہیں۔

عتیقہ نے جسم فروشی کا دھندہ ایک پیشہ کرنے والی عورت کی حیثیت سے لاہور کی ہیرا منڈی کے علاقے نیواں چیت رام روڈ سے شروع کیا۔ اس نے آسیہ نامی ایک طوائف کے ہاں ناچنے، گانے اور پیشہ کرنے والی عورت کے طور پر نوکری کی۔ اس کے بارے میں مشہور

ہے کہ وہ بہت اچھا ڈانس کرنے والی اور گانے والی عورت ہے۔ نیواں چیت رام روڈ کے اس اڈے پر اس کو بہت زیادہ پذیرائی ملی اور اس نے لاہور کے کئی شرفاء اور بیوروکریٹس کو اپنا جسم پیش کیا اور خوب دولت کمائی۔ آسیہ نے اس اڈے پر عتیقہ کے علاوہ سات لڑکیاں بھرتی کر رکھی تھیں اس نے ان لڑکیوں کے ساتھ ملکر تقریباً تین سال تک مسلسل اس اڈے پر پیشہ کیا اور ہیرا منڈی کے علاقے میں اپنے ڈانس اور آواز سے دھوم مچادی۔ اس دوران لاہور کے ایک مشہور فلم ساز نے اس کو ایک پنجابی فلم میں کاسٹ کیا لیکن یہ فلم باکس آفس پر ہٹ نہ ہو سکی اور عتیقہ اس فلم کی ناکامی کے بعد دوبارہ ہیرا منڈی لوٹ آئی۔ لیکن وہ اب آسیہ نامی نائکہ کا اڈہ چھوڑ کر بازار شیخوپوریاں میں نسیم نامی ایک طوائف کے پاس آگئی اور یہاں پر دھندہ شروع کر دیا۔ نسیم کے ڈیرے پر عتیقہ کے کاروبار نے مزید ترقی کی اور اس نے ملک کے دور دراز شہروں تک بکنگ پر جانا شروع کر دیا۔ نسیم کے ڈیرے میں موجود ایک بوڑھی نائکہ نے اپنا نام ظاہر نہ کرنے کی شرط پر بتایا کہ عتیقہ ایک بہت خوبصورت اور ہنر مند طوائف ہے اس نے ناچ گانے کی باقاعدہ تربیت لاہور کے ایک مشہور استاد سے حاصل کی اور شروع میں اس نے ریڈیو پاکستان کے لاہور سینٹر سے گانا بھی شروع کیا لیکن جلد ہی ہیرا منڈی کی طرف آگئی۔ یہ ایک غلط فیصلہ تھا کیونکہ جتنی اچھی اس کی آواز تھی اس کو گانا چاہئے تھا اور جیسے اس نے ریڈیو پاکستان پر گانا شروع کیا اس کی جلد ہی ٹی وی پر پہچان بن سکتی تھی اور اس کو فلموں میں بھی اداکارہ اور گلوکارہ کے طور پر اچھا کام مل سکتا تھا لیکن اس نے گلوکاری اور اداکاری کو ترک کر کے جسم فروشی کی طرف رجوع کر لیا۔ اس نائیکہ کے بقول اگر عتیقہ تھوڑی دیر صبر کرتی اور جسم فروشی کی طرف نہ آتی تو اس کو بہتر مواقع مل سکتے تھے کہ وہ ایک باعزت فنکارہ کے طور پر اپنا آپ متعارف کراتی اور اس پر جسم فروشی کا یہ دھبہ نہ لگتا۔

اس عمر رسیدہ طوائف نے مزید بتایا کہ عتیقہ اس وقت ایک بڑا کامیاب کوٹھی خانہ چلا رہی ہے لیکن اس کو ہماری برادری میں اچھے لفظوں میں یاد نہیں کیا جاتا اور لوگ اس کو محض ایک ٹکیائی کے طور پر جانتے ہیں۔ اگر عتیقہ گانا ترک نہ کرتی تو اس کی صورتحال کچھ مختلف ہوتی کیونکہ جب اس نے گانا شروع کیا تو اس وقت کئی دوسری عورتوں نے بھی ریڈیو وغیرہ پر

گانا شروع کیا۔ عتیقہ تو ادھر چلی آئی لیکن دوسری عورتیں اپنا نام بنانے میں کامیاب ہو گئیں۔ آج یہ عورتیں عتیقہ سے بہتر زندگی گزار رہی ہیں اور کوئی بھی ان پر انگلی نہیں اٹھاتا۔

ایک دلال نے بتایا کہ اس نے اپنی ساری زندگی ہیرا منڈی میں گزار دی ہے۔ اس نے جب ہیرا منڈی میں دلالی شروع کی تو اس وقت عتیقہ نیواں چیت رام روڈ پر گانا گاتی تھی اور بعض اوقات بجنگ پر چلی جاتی تھی۔ اس کے گاہکوں میں لاہور کے کئی مشہور لوگ شامل تھے۔ ساری ہیرا منڈی میں اس کے گانے اور ڈانس کا چرچہ تھا۔ لوگ دور دراز شہروں سے اس کا گانا سننے کیلئے آتے تھے۔ اس کو اچھی طرح یاد ہے کہ لاہور پولیس کا ایک اعلیٰ عہدیدار اس کی وساطت سے عتیقہ کا گاہک بنا اور اس نے عتیقہ پر بہت زیادہ دولت لٹائی۔ اس نے مزید بتایا کہ عتیقہ نے اس پولیس آفیسر کے ساتھ خفیہ شادی بھی کر لی تھی لیکن جب اس کے خاندان والوں کو اور پہلی بیوی کو اس شادی کے بارے میں معلوم ہوا تو انہوں نے عتیقہ کو اغواء کر لیا۔ عتیقہ کئی دن اڈے سے غائب رہی اور انہوں نے طلاق پر دستخط کروا کر اس کو رہا کیا۔ اس کے بعد مذکورہ پولیس افسر کو لاہور سے تبدیل کر دیا گیا اور اس نے دوبارہ عتیقہ کے اڈے کا رخ نہ کیا۔ عاشق نامی اس دلال کے مطابق عتیقہ کا مجرا کرانے کیلئے بڑے بڑے آفیسروں کے سیکرٹری اور وزیروں کے لوگ یہاں آتے تھے اور عتیقہ کو ساتھ لے جاتے۔ عتیقہ مری اور دوسرے پہاڑی علاقوں پر کئی کئی دن لوگوں کی مہمان رہتی اور بہت زیادہ پیسے لیکر واپس آتی۔ اس نے مزید بتایا کہ عتیقہ مزاج کی ایک چڑچڑی عورت ہے جو ہر کسی کے ساتھ لڑتی جھگڑتی رہتی ہے یہی وجہ ہے کہ ہیرا منڈی کے دیگر لوگ اس کے ساتھ زیادہ تعلق نہیں رکھتے۔

عتیقہ نے آسیہ کے بعد نسیم اور نسیم کے بعد شاہدہ بیگم کے اڈے پر ملازمت حاصل کی۔ اس نے شاہدہ کے اڈے پر اپنی چھوٹی بہن نورین کو بھی بٹھا لیا اور اس کو بھی اپنے ساتھ ناچ گانے اور جسم فروشی میں مصروف کر لیا۔ اس اڈے پر دونوں بہنوں نے پانچ سال سے زائد عرصہ کام کیا اور اس دوران عتیقہ لاہور کے ایک معروف سیاستدان، جو بعد میں وزیر بھی بنا، کی رکھیل رہی۔ اس نے صرف گانا اور ڈانس جاری رکھا جبکہ اس کا جسم صرف اس کے مالک کیلئے مخصوص ہو کر رہ گیا تھا۔ مذکورہ وزیر کے عتیقہ کے ساتھ تعلق کے بارے میں ان

دنوں اخبارات میں بھی بہت زیادہ شور و غل ہوا لیکن اس نے اس وزیر کے ساتھ اپنے تعلقات بحال رکھے اور اپنا زیادہ تر وقت مال روڈ پر واقع اس کی شاندار سرکاری رہائش گاہ پر گزارتی رہی۔ جب ایک بار عتیقہ کو اس وزیر کی بیوی نے دیکھ لیا تو اس نے اپنے خاوند کو پریس کانفرنس کی دھمکی دی۔ اس دھمکی کا خاطر خواہ اثر ہوا اور مذکورہ وزیر نے عتیقہ کے ساتھ کیا ہوا معاہدہ ختم کر دیا لیکن اس کے بعد ایک دلچسپ اور حیران کن واقعہ ہوا اور اس وزیر کے چھوٹے بھائی نے جو خود صوبائی اسمبلی کا ممبر تھا عتیقہ کے ساتھ تعلقات قائم کر لئے۔ مذکورہ صوبائی رکن اسمبلی نے عتیقہ کو ایک عالیشان کوٹھی لے دی اور عتیقہ نے وہاں رہنا شروع کر دیا۔ بعض ذرائع یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ عتیقہ اور اس صوبائی رکن اسمبلی نے شادی کر لی اور ان کا ایک بیٹا بھی ہے جس نے ایچی سن کالج سے تعلیم حاصل کی اور ان دنوں اپنے باپ کے ساتھ امریکہ میں رہائش پذیر ہے۔ اس رکن اسمبلی کے ساتھ بھی عتیقہ کا نبھا نہ ہو سکا اور تقریباً دو سال بعد دونوں نے ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کر لی اور مذکورہ رکن اسمبلی امریکہ چلا گیا۔

اس کے بعد عتیقہ نے علامہ اقبال ٹاؤن کے نیلم بلاک میں جسم فروشی کا اڈہ شروع کیا اور وہاں اپنے پرانے گاہکوں کو لڑکیاں سپلائی کرنے لگی۔ نیلم بلاک میں عتیقہ کا اڈہ پورے علاقے میں مشہور ہو گیا اور مقامی لوگوں نے جن میں بعض بااثر لوگ بھی تھے، ان کے اڈے کو بند کرانے کی کوشش کی لیکن اس کے اثر و رسوخ کے سامنے ان کا بس نہ چلا۔ عتیقہ نے اقبال ٹاؤن پولیس کو اپنے ساتھ ملا لیا اور اپنے معترض پڑوسیوں کو دھمکیاں دینے لگی۔ نیلم بلاک میں اس کا یہ اڈہ تقریباً ایک سال تک قائم رہا اور پھر ایک دن اس کے گھر میں ڈکیتی کی واردات ہو گئی۔ ڈاکوؤں نے تمام گھر والوں کو باندھ کر گھر کا سارا سامان لوٹ لیا۔ عتیقہ نے اس واردات کا الزام مقامی نوجوانوں پر لگایا لیکن پولیس ان سے کچھ بھی برآمد نہ کر سکی اور ان کو رہا کر دیا گیا۔ اس کے بعد عتیقہ نے نیلم بلاک والا مکان چھوڑ دیا اور واپس ہیرا منڈی آ گئی۔

ہیرا منڈی میں اس نے موجودہ مکان حاصل کیا اور پورے زور و شور کے ساتھ جسم فروشی کا کاروبار ایک بار پھر نئے سرے سے شروع کر دیا۔ اس نے ایک انکم ٹیکس افسر کے ساتھ تعلقات قائم کر لئے اور اس اڈے کو چلانے لگی۔ عتیقہ کے ساتھ اس کی بہن نورین بھی

اس اڈے پر آگئی اور دونوں بہنوں نے مذکورہ انکم ٹیکس آفیسر کے ساتھ ملکر اس اڈے کو ہیرا منڈی کا سب سے بڑا اڈہ بنادیا۔

اگر ٹکسالی دروازے کی طرف سے ہیرا منڈی کی طرف سفر کریں تو ٹبی گلی کی نکڑ کے بائیں طرف دو منزلہ مکان ملتا ہے جس کو بنے ہوئے تقریباً ستر سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس مکان کا مین دروازہ بازار شیخوپوریاں میں کھلتا ہے جبکہ اوپر کی منزل کا راستہ بھی ایک سیڑھی کی شکل میں اس بازار میں ہی کھلتا ہے۔ مین دروازے پر ایک سبز رنگ کی پلیٹ لگی ہوئی ہے جس پر جلی حروف میں لکھا ہوا ہے کہ بغیر اجازت اندر آنا منع ہے لیکن حقیقت میں اس مکان میں داخلے کیلئے کسی اجازت کی ضرورت نہیں پڑتی کیونکہ اس دروازے سے اندر داخل ہونے سے ہی مالک مکان کا کاروبار چلتا ہے۔ مین دروازے سے نچلی منزل میں جائیں تو بائیں ہاتھ چھوٹے سے صحن کے ساتھ ایک طویل برآمدہ ہے جس کے پیچھے سات آٹھ بوسیدہ کمرے قطار کی صورت میں بنائے گئے ہیں۔ ان کمروں میں رات کے وقت کوئی نہیں ہوتا جبکہ دن کو یہاں پیشہ کرنے والی عورتیں اپنے اپنے گاہکوں کے ساتھ وقت گزارتی ہیں۔ ان کمروں میں کوئی فرنیچر وغیرہ نہیں صرف ایک بان کی بنی ہوئی چارپائی ہر کمرے کا کل سامان ہے۔ یہ چارپائی جس پر ایک بوسیدہ سی چادر پڑی رہتی ہے اس کا واحد استعمال اس وقت ہوتا ہے جب کوئی گاہک کسی عورت کو پسند کرتا ہے۔ دیواروں کی سفیدی تقریباً جھڑ چکی ہے جبکہ ان دیواروں پر جگہ جگہ یہاں پیشہ کرنے والی عورتوں نے اپنی پسند کی فلمی اداکاراؤں جن میں اکثریت بھارتی اداکاراؤں اور اداکاروں کی ہے، ان کی اخبار کے کاغذ پر چھپی تصاویر لگا رکھی ہیں۔ ایک سو واٹ کا بلب اور ایک پرانے ماڈل کا بجلی کا پنکھا ہر کمرے میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ ان کمروں میں کوئی دوسرا سامان نہیں۔

اسی طرح اوپر والی منزل پر بھی پانچ چھ کمرے بنائے گئے ہیں ان کمروں میں البتہ نچلی منزل والے کمروں کی نسبت زیادہ سامان ہے اور ان کا رنگ بھی ابھی تک موجود ہے۔ ان کمروں میں سے ایک میں عتیقہ رہائش پذیر ہے جس میں ضرورت زندگی کی ہر چیز موجود ہے۔ عتیقہ نے اس کمرے میں ایئر کنڈیشنر بھی لگا رکھا ہے اور اس کمرے کو

خصوصی طور پر تیار کیا گیا ہے۔ اس کمرے میں صرف عتیقہ کا دوست یا اس کے خصوصی مہمان ہی آسکتے ہیں باقی لوگوں کو یہاں آنے کی اجازت نہیں ہے۔

اسی طرح ایک کمرہ ایسا ہے جس کو اس اڈے کے دلال استعمال کرتے ہیں یا اگر کوئی رشتہ دار مہمان آیا ہو تو اس کو دلالوں سے خالی کرا لیا جاتا ہے۔ اس میں دو بیڈ لگے ہوئے ہیں اور پرانی وضع کی چار پانچ کرسیاں اور ایک میز پڑی ہے۔ اس منزل پر بھی ایک چھوٹا سا صحن ہے جس میں صفائی نام کی کوئی چیز نہیں ملتی۔ ٹوٹی ہوئی کرسیاں اور چارپائیوں کی لکڑیاں بکھری پڑی ہیں۔ اس صحن کو سردیوں میں البتہ تھوڑا صاف کر لیا جاتا ہے اور فارغ عورتیں اس کو دھوپ سینکنے کیلئے استعمال کرتی ہیں۔ ایک طرف دو غسل خانے بنائے گئے ہیں جبکہ ساتھ ہی ایک چھوٹا سا کچن بھی ہے جہاں ہر وقت چائے وغیرہ تیار ہوتی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ اس گھر میں کوئی ایسی چیز نہیں جس کا یہاں ذکر کیا جائے۔

دن کو البتہ رات کی بجائے اس اڈے پر زیادہ رونق ہوتی ہے۔ لوگ آتے جاتے رہتے ہیں اور عتیقہ خود گاہکوں سے بھاؤ کر کے پیسے وصول کرتی ہے۔ پیشہ ور عورتیں سارا دن اپنے کام میں مصروف رہتی ہیں جبکہ ان کے دلال اکثر ان کے ساتھ لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ یہ جھگڑا عموماً دلال کو توقع سے کم کمیشن ملنے پر ہوتا ہے۔ دلال تمام کے تمام نشئی ہیں اور ان کی عمریں چالیس سے پچاس کے درمیان ہیں۔

صبح 9 بجے یہاں پر پیشہ ور عورتوں کی اپنے اپنے علاقوں سے آمد شروع ہو جاتی ہے۔ ہر عورت سب سے پہلے عتیقہ سے ملتی ہے اور اس کے بعد اپنے مخصوص کمرے میں جا کر بیٹھ جاتی ہے۔ ایک دلال نے بتایا کہ صبح 9 بجے سے شروع ہونے والی شفٹ میں 12 عورتیں اڈے پر آتی ہیں۔ ان میں سے اکثر عورتیں اندرون لاہور کے مختلف محلوں سے آتی ہیں۔ بارہ بجے کے قریب ان عورتوں میں سے اپنی طے شدہ باری پر کچھ عورتیں باقی لوگوں کیلئے کھانا تیار کرتی ہیں جبکہ دیگر اپنے اپنے گاہکوں کے ساتھ مشغول رہتی ہیں۔ صبح کی شفٹ میں گاہکوں کو نچلی منزل کے کمروں میں بٹھایا جاتا ہے۔ گرمیوں میں عموماً ان کو شربت پلایا جاتا ہے جبکہ سردیوں میں خاص گاہکوں کو بوتلیں اور عام گاہکوں کو سبز چائے دی جاتی ہے۔ یہ چائے خود گھر

کے کچن میں تیار کی جاتی ہے۔

صبح کی شفٹ میں آنے والی عورتوں کے نرخ عموماً دوسری شفٹوں پر کام کرنے والیوں سے کم ہوتے ہیں کیونکہ اس وقت جو گاہک اڈے پر آتے ہیں ان میں دہاڑی دار، مزدور، لاہور دیکھنے آئے شوقین مزاج دیہاتی اور دیگر عام طبقات سے تعلق رکھنے والوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ ان لوگوں کے ساتھ عام طور پر بازار میں گھومنے والے اڈے کے دلال سودا طے کرتے ہیں۔ یہ دلال راہ گزرتے لوگوں میں سے اپنا شکار تلاش کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اس کو بھاؤ بتانے کے ساتھ ساتھ، کو عورت کی خوبصورتی کے بارے میں اور اس کی "کم سنی" کے بارے میں معلومات بھی فراہم کرتے جاتے ہیں۔ شروع میں یہ گاہک کو دیکھ کر 200 سے 300 روپے کے درمیان ریٹ بتاتے ہیں اور اگر اس پر بھی گاہک ان کے قابو میں نہ آئے تو پھر آہستہ آہستہ ریٹ کو کم کرتے جاتے ہیں۔ اگر ان کی کوشش کے باوجود گاہک نہ مانے تو پھر گاہک سے علیحدہ ہونے سے پہلے یہ اس کو 100 روپے "سنہری آفر" کرتے ہیں اور بازار میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اگر ان کا گاہک 100 روپے کی پر تیار ہو جائے تو وہ ایک طرح کی بے زاری کے ساتھ اس کو اڈے پر لے جاتے ہیں اور اڈے پر موجود عورتوں میں سے سب سے زیادہ عمر والی اور تقریباً بد صورت عورت کے کمرے میں دھکیل دیتے ہیں۔ دلال کو اس کے طے کئے ہوئے ریٹ کا 10 فیصد ملتا ہے۔ یہ 10 فیصد اس کو اس وقت ملتا ہے جب گاہک فارغ ہو کر اڈے کی حدود سے باہر نکل جاتا ہے۔ تب دلال فوراً عتیقہ یا اس کی بہن نورین سے اپنا کمیشن وصول کر لیتا ہے۔

گاہک جب کمرے کے باہر کھڑی مالکن کو رقم ادا کرتا ہے تو وہ فوراً وہاں سے چلی جاتی ہے اور اس کو انتظار کرنے کا حکم دیتی ہے۔ ابھی گاہک کے پاس اصل عورت نہیں پہنچی ہوتی کہ ایک اور عورت اس کے پاس پہنچ جاتی ہے اور اس سے کمرے کا کرایہ طلب کرتی ہے چونکہ گاہک پہلے طے شدہ رقم ادا کر چکا ہوتا ہے اور عموماً خوفزدگی کے عالم میں ہوتا ہے اس صورت میں اس میں جرات نہیں ہوتی کہ وہ کمرے کا معمولی سا کرایہ ادا کرنے سے انکار کرے۔ یہ کرایہ عموماً بیس یا تیس روپے تک ہوتا ہے۔

کرایہ ادا کرنے کے بعد اس میں جلد یہاں سے فارغ ہو جانے کی خواہش تیز ہو جاتی ہے اور وہ بے چینی سے مطلوبہ عورت کا انتظار شروع کر دیتا ہے جس کو اڈے کی مالکن کمرے میں داخل ہونے سے پہلے ہدایت کرتی ہے کہ اس نے گاہک کی ادا شدہ رقم کے مطابق اس کے ساتھ برتاؤ کرنا ہے۔ جیسے ہی یہ عورت کمرے میں داخل ہوتی ہے گاہک جلدی میں اس کو رضامند کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس موقع پر وہ گاہک کی اضطراری کیفیت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پہلے اس سے اپنے انعام کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس موقع پر گاہک شدید الجھن کا شکار ہو جاتا ہے کیونکہ ابھی وہ اپنی "منزل" تک نہیں پہنچا ہوتا لیکن اس کو اصل ادائیگی کے علاوہ دیگر ادائیگیاں بھی کرنا پڑ رہی ہوتی ہیں۔ اگر گاہک اس موقع پر "انعام" دینے سے انکار کرے تو پیشہ ور عورت اس کو نفسیاتی طور پر زیادہ الجھانے کیلئے اپنا مطالبہ مزید تیز کر دیتی ہے۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ اس موقع پر اس کو اس کا انعام نہ دیا جائے اور گاہک اس کے ساتھ جنسی فعل شروع کر دے۔

ابھی پیشہ ور عورت گاہک کو مطمئن کرنے کیلئے دروازہ بند کر رہی ہوتی ہے کہ اس کو صحن میں سے آواز دیکر احساس دلایا جاتا ہے کہ وہ جلدی کرے۔ آواز دینے والا خصوصی طور پر ایک خوفزدگی کا تاثر آواز میں بھر کر ایسا کرتا ہے تاکہ گاہک خوفزدہ ہو کر اس عورت کو جلد چھوڑ دے۔ اس وقت گاہک کی حالت دیدنی ہوتی ہے وہ محسوس کرتا ہے کہ پولیس کا چھاپہ یا کوئی مصیبت ابھی آئی کہ ابھی آئی۔ اس صورتحال میں وہ اس کوشش میں ہوتا ہے کہ جتنی جلدی ہو سکے وہ اڈے سے چلا جائے۔ جب وہ "آزاد" ہو کر باہر نکلتا ہے تو پھر اس کی پہلی کوشش یہ ہوتی ہے کہ فوراً یہاں سے بھاگ نکلے۔ اس سارے عمل میں عموماً دس سے پندرہ منٹ صرف ہوتے ہیں اور نیم خوفزدہ گاہک فارغ ہو کر بازار شیخوپوریاں میں نکل جاتا ہے۔

اس ساری کارروائی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ گاہک کسی طرح بھی زبردستی یا تشدد پر نہ اتر

ایک طوائف نے بتایا کہ بعض اوقات لوگ ان کو غیر ضروری طور پر تنگ کرتے

ان کے ساتھ پیشگی یہ طریقہ اپنایا جاتا ہے تاکہ وہ خوفزدہ ہو جائیں او

کریں۔

اس ساری نفسیاتی کارروائی کے باوجود ایک بار یہاں آنے والا بار بار یہاں آتا ہے کیونکہ اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح بہت تھوڑے پیسے خرچ کر کے وہ کہیں سے بھی اپنی جنسی پیاس نہیں بجھا سکتا جس طرح اس اڈے پر بجھا سکتا ہے لیکن ایک بات ضرور ہے کہ ان اڈوں پر زیادہ تر وہ لوگ آتے ہیں جن کا زندگی میں یہ پہلا یا دوسرا چانس ہوتا ہے۔ ان کے اندر اشتیاق زیادہ ہوتا ہے لہٰذا وہ جلد ہی ان دلالوں کی باتوں میں آجاتے ہیں۔ ان کے یہ وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا کہ کوئی عورت مکمل طور پر اپنے آپ کو صرف ایک یا ڈیڑھ سو روپے میں ان کے حوالے کر دے گی۔ جب یہ لوگ جنسی عمل کے بعد ان اڈوں سے نکلتے ہیں تو عموماً ان کے تجربہ پر مبنی داستان میں مبالغہ آمیزی کا رنگ زیادہ ہوتا ہے۔ یہ اپنے دوستوں اور ملنے والوں کو اپنے ہیرا منڈی جانے کی داستان مزے لے لے کر سناتے ہیں اور خصوصاً یہ ضرور بتاتے ہیں کہ انہوں نے کس طرح اس طوائف کو زیر کر لیا اور وہ بالآخر منت سماجت پر اتر آئی اور میں نے اس کو بتایا کہ میں کوئی شہری جوان نہیں ہوں دیہاتی نوجوان ہوں۔ اس کے بعد ان کی پیش گوئی عموماً ان الفاظ میں ہوتی ہے کہ آئندہ وہ کسی دیہاتی جوان کے ساتھ سودا نہیں کرے گی۔ یہ تو البتہ یہاں سے کامیاب لوٹنے والے ایک عام آدمی کے خیالات ہیں جو اس تجربے کے بعد مزید تجربات کرنا چاہتا ہے۔

عتیقہ کے اڈے پر آنے والوں کی اکثریت کا تعلق نچلے طبقات کے ساتھ ہوتا ہے۔ اکثر دیہاڑی دار، مزدور، مالشیے، چوکیدار اور چپڑاسی وغیرہ یہاں آتے ہیں۔ ان کا اپنا مزاج ہوتا ہے جس کو اڈے کی عورتیں بخوبی جانتی ہیں اور ان کو ان کے مزاج کے مطابق ڈیل کرتی ہیں۔ مجھے ایک دلال نے بتایا کہ اس اڈے پر آنے والوں میں مستقل گاہک کم ہوتے ہیں جبکہ روزانہ نئے نئے لوگ یہاں کثرت کے ساتھ آتے ہیں۔ ان لوگوں کے ساتھ یہ عورتیں کوئی اچھا سلوک نہیں کرتیں بلکہ اکثر ان کو تنگ کیا جاتا ہے اور ان کے انجانے پن کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان سے جیبیں خالی کرائی جاتی ہیں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک سادہ سی طبیعت کے آدمی کو یہاں اس کے پاس موجود دولت کے باعث بہت اچھا ڈیل کیا جاتا ہے۔ عورتیں اس کے وارے نیارے کر دیتی ہیں اور اس کو احساس دلاتی ہیں کہ اس

نے جو سابقہ زندگی گزاری ہے وہ نہایت بد مزہ اور بد صورت ہے۔ سادہ طبیعت آدمی ان عورتوں کی اداؤں اور ان کے بے باکانہ خیالات اور دوران جنسی عمل خاص لذت پر مبنی گفتگو کرنے کے انداز سے بہت زیادہ متاثر ہوتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ اس کی سابقہ زندگی رائیگاں گئی، اس کی بیوی تو اس کے ساتھ کلام ہی نہیں کرتی جبکہ یہاں اس کو احساس ہوا ہے کہ واقعی وہ ایک مرد ہے اور عورت کو کس طرح مرد کی خدمت کرنا چاہئے۔ ان عورتوں کے پاس چونکہ خاص مہارتیں اور ہنر ہوتا ہے لہٰذا یہ اچھے بھلے آدمی کو بیوقوف بنالیتی ہیں جبکہ عام آدمی تو ان کیلئے معمولی کھیل ہوتا ہے۔

عتیقہ کے اڈے پر دوسری شفٹ 6 بجے شام شروع ہوتی ہے جو رات تقریباً ایک بجے تک چلتی ہے۔ اس شفٹ میں گاہکوں کو مد نظر رکھتے ہوئے عتیقہ نے صبح کی شفٹ کی نسبت زیادہ جوان اور ان سے زیادہ پر کشش عورتیں بھرتی کر رکھی ہیں۔ عتیقہ کو معلوم ہے کہ شام کے وقت ایسے لوگ بھی گھروں سے نکلتے ہیں اور اس علاقے کا رخ کرتے ہیں جن کی مالی حالت قدرے بہتر ہوتی ہے اور وہ اپنے سکون کیلئے بہتر عورتوں کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ عتیقہ کے اڈے کی اس شفٹ میں 8 لڑکیاں کام کرتی ہیں۔ شام کے کھانے کے بعد لوگ آنے لگتے ہیں اور گھر میں رونق ہو جاتی ہے۔ زرق برق لباس زیب تن کئے ہوئے عورتیں سارے گھر میں کلکاریاں مارتی پھرتی ہیں۔ اور آنے جانے والوں کو ساتھ لیکر اپنے مخصوص کمروں کا رخ کرتی ہیں۔

شام کی شفٹ میں نچلی منزل کو بند کر دیا جاتا ہے اور تمام پیشہ کرنے والیاں اوپر والے حصے میں آجاتی ہیں۔ لوگ مین دروازے کی بجائے گلی میں کھلنے والی سیڑھی کو استعمال کرتے ہیں اور عتیقہ خود ان کا استقبال صحن میں کرتی ہے۔ شام کو آنے والوں میں سے اکثر پرانے گاہک ہوتے ہیں۔ اس وقت پیشہ کرنے والیوں کا ریٹ عموماً 500 سے 1000 روپے تک ہے۔ دلال 500 سے 1000 کے درمیان سودے بازی کر سکتا ہے لیکن 500 سے کم گاہک نہیں پکڑ سکتا۔ اس کو سختی کے ساتھ تاکید کی جاتی ہے کہ عام گاہکوں کو روپے پر راضی کرے۔ اس شفٹ میں کام کرنے والے دلالوں کو بھی

فیصد کمیشن ملتا ہے۔

غلام رسول نامی ایک ادھیڑ عمر دلال نے بتایا کہ وہ گزشتہ سات سال سے عتیقہ کے کوٹھی خانے پر نوکری کر رہا ہے۔ اس کو کل معاوضے کا 10 فیصد کمیشن ملتا ہے جبکہ دو وقت کی روٹی بھی عتیقہ دیتی ہے۔ اس نے اعتراف کیا کہ وہ ہیروئن پیتا ہے اور اس کا تعلق فیصل آباد کے ایک کھاتے پیتے زمیندار گھرانے سے ہے۔ اس نے مزید دعویٰ کیا کہ تقریباً سات سال پہلے وہ اس ڈیرے پر آیا تھا اور اس نے یہاں خوب عیش کی۔ اس کے پاس 2000 روپے تھے۔ جب یہ 2000 روپے طوائفیں نگل گئیں تو پھر اس نے لاہور کے بعض علاقوں میں مزدوری تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن اس کو کوئی اچھی مزدوری نہ مل سکی۔ اس نے اپنی دردناک کہانی کو اس طرح شروع کیا: "کیا بتاؤں جی! یہاں مجھے شہناز نامی ایک لڑکی کے ساتھ عشق ہو گیا تھا۔ میں نے تمام روپے اس کے قدموں میں رکھ دیئے اور جب یہ پیسے ختم ہو گئے تو اس نے بھی مجھ سے منہ موڑ لیا۔ میں نے اس کے ساتھ شادی کا وعدہ کیا لیکن جب تک میرے پاس پیسے تھے یا اس کو یقین تھا کہ میں پیسے لاؤں گا یہ شادی کا وعدہ کرتی رہی لیکن ایک دن عتیقہ نے مجھے کوٹھے سے اتار دیا اور کوئی بہتر کام کرنے کا مشورہ دیا۔ میں دو دن تک ناصر باغ میں پڑا رہا جب مجھے بھوک نے نڈھال کر دیا تو میں نے داتا دربار ڈیرہ لگا لیا اور کھانے کے بعد یہیں سونے لگا۔"

اس نے بتایا کہ وہ کچھ دن دربار پر گذارنے کے بعد دوبارہ یہاں آ گیا اور عتیقہ کی منت سماجت کی کہ وہ شہناز کے ساتھ ملنے دے۔ عتیقہ نے نفرت کے ساتھ مجھے دوبارہ یہاں سے نکال دیا۔ میں اپنے گھر فیصل آباد گیا اور گھر سے زیور چوری کر کے یہاں لے آیا۔ رنگ محل میں یہ زیور 10,000 روپے میں فروخت کیا اور پیسے لیکر عتیقہ کے اڈے پر آ گیا۔ یہاں میں نے عتیقہ کا سودا کیا۔ اس نے 1000 مانگا جو میں نے اس کو ادا کر دیا اور شہناز کے ساتھ رات بسر کی۔ اگلی صبح میں نے شہناز سے ملاقات کی اور اس کو بتایا کہ میرے پاس اتنے پیسے ہیں اس کو شروع میں یقین نہ آیا تو میں نے اس کو پیسے دکھا دیئے۔ ہم دونوں نے منصوبہ بندی کی اور اگلے دن دونوں کراچی بھاگ گئے۔ کراچی میں لانڈھی کے علاقے میں ایک کمرہ کرائے پر لیکر

رہنے لگے اور آس پاس کے لوگوں کو بتادیا کہ ہم شادی شدہ ہیں اور فیصل آباد سے یہاں کام کرنے کیلئے آئے ہیں۔

"میں کراچی میں مالشیے کے طور پر کام کرنے لگا جبکہ شہناز سارا دن گھر میں پڑی رہتی۔ ہم دونوں نے نکاح نہ کیا اور فیصلہ کیا کہ یہاں سے کسی دوسرے علاقے میں جا کر نکاح کر لیں گے اور رہنا شروع کر دیں گے۔ میں ساری رات ہوٹلوں اور بازاروں میں پھر کر مالش کرتا اور شہناز گھر میں رہتی۔ شروع میں اس کا اکیلے کمرے میں جی نہیں لگتا تھا لیکن جلد ہی وہ عادی ہو گئی۔ اس طرح رہتے ہوئے ہمیں دو ماہ ہو گئے۔ ایک دن شہناز نے مجھے بتایا کہ وہ حاملہ ہو چکی ہے لہٰذا انہیں فوراً نکاح کر لینا چاہئے۔ میں جب اگلے روز صبح سویرے کام سے گھر پہنچا تو دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ پڑوسیوں نے بتایا کہ وہ رات ایک شخص کے ساتھ چلی گئی جس کو وہ اپنا بھوئی بتاتی تھی۔ میں نے تالا توڑا تو گھر کا سارا قیمتی سامان غائب تھا۔ ساری نقدی جو ہمارے پاس محفوظ تھی وہ بھی غائب تھی۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ یا تو بھاگ گئی ہے اور لاہور سے عتیقہ کا کوئی آدمی اس کو واپس لے گیا ہے کیونکہ وہ میٹرک پاس تھی اور لکھنا پڑھنا آتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے عتیقہ کو خط لکھ دیا ہو اور ساری بات بتادی ہو لیکن مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ اس طرح مجھے چھوڑ کر غائب ہو جائے گی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ شہناز محلے کے ایک لڑکے کے ساتھ کہیں بھاگ گئی ہے۔ میں نے عتیقہ کے اڈے پر بھی معلوم کیا لیکن یہاں وہ نہ گئی تھی۔ عتیقہ نے بتایا کہ اس کے والدین نے میرے خلاف تھانہ مصری شاہ میں اغواء کا مقدمہ درج کرا دیا ہے۔ میں تھانے سے بہت زیادہ ڈرتا تھا لہٰذا میں دوبارہ کراچی آ گیا اور یہاں مالش کرنے لگا۔ دو سال کے بعد میں جب لاہور میں عتیقہ کے اڈے پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ شہناز واپس آ گئی ہے اور اس نے کراچی کے ایک آدمی کے ساتھ شادی کر رکھی ہے۔ وہ کوٹھی خانے پر باقاعدگی سے آتی ہے اور اس کا خاوند بھی کوٹھی خانے پر دلالی کا دھندہ ہے۔ میں نے اس سے ملاقات کی لیکن اس نے میرے ساتھ بات نہ کی۔ میرا اب کوئی کام نہ تھا لہٰذا میں نے بھی 10 فیصد کمیشن پر یہاں دلالی شروع کر دی۔ دن میں اس کوٹھی خانے پر دلالی کرتا ہوں۔ میں نے شادی نہیں کی اور نہ ہی

کے ساتھ کوئی رابطہ یا تعلق ہے"۔

یہ دلال عتیقہ کے اڈے کا سب سے زیادہ مشہور دلال ہے اور اس کو گاہک کی پہچان میں خاص مہارت ہے۔ غلام رسول ایک بار جس گاہک کے ساتھ بھاؤ تاؤ کرتا ہے وہ پھر واپس نہیں جا سکتا۔ غلام رسول نے بتایا کہ شہناز بھی اس اڈے پر کام کرتی ہے لیکن اب اس کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی دونوں میں کوئی گفتگو ہوتی ہے۔ عتیقہ غلام رسول کی بہت زیادہ عزت کرتی ہے اور اس کو بھائی جان کہہ کر پکارتی ہے۔ غلام رسول کی ذمہ داری میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ گھر کے کچن اور سودے سلف کا خیال رکھے اور اگر کوئی گاہک یہاں شور و غوغا کرتا ہے یا کوئی مسئلہ کھڑا کرتا ہے تو وہ اس کے ساتھ معاملے طے کرے اور زیادہ بات بڑھ جانے کی صورت میں وہ پولیس کے ساتھ بھی رابطہ کر سکتا ہے۔ غلام رسول کے ذریعے ہی عتیقہ کے کوٹھی خانے سے ماہانہ بھتہ مقامی پولیس کو ملتا ہے۔ پیشہ کرنے والی تمام عورتیں غلام رسول کو عزت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں اور اس کے ذریعے اڈے پر آئے ہوئے گاہک کے ساتھ بہت اچھا سلوک کرتی ہیں۔

میرے ایک سوال پر غلام رسول نے بتایا کہ اب اس کے دل میں کوئی جنسی خواہش نہیں۔ اس نے بتایا کہ وہ چونکہ کوئی دوسرا کام نہیں جانتا اس لئے اس کام کو نہیں چھوڑ سکتا۔ غلام رسول کے بارے میں مشہور ہے کہ عتیقہ کے کوٹھی خانے کو اصل میں وہ چلا رہا ہے اگر وہ نہ ہو تو عتیقہ کا اڈہ ویران ہو جائے۔ لوگ غلام رسول کو جانتے ہیں اور اس کے پرانے گاہکوں کو یہاں صرف غلام رسول ہی لے کر آتا ہے۔

عتیقہ کے اڈے پر چلنے والی دوسری شفٹ میں پیشہ کرنے والی تمام عورتوں کا تعلق ہیرا منڈی کے علاقے سے ہے۔ یہ عورتیں ناچ گانا نہیں جانتیں۔ انہیں صرف جسم فروخت کرنے کا ہنر آتا ہے۔ ہیرا منڈی میں کچھ اپنے والدین اور کچھ اپنے خاوندوں کے ساتھ رہائش پذیر ہیں۔ ان کو روزانہ 200 سے 350 روپے تک ملتے ہیں۔ غلام رسول کے مطابق یہ عورتیں کل معاوضے کا 10 فیصد دلالوں کو دیتی ہیں اور 50 فیصد عتیقہ کو جبکہ خود 40 فیصد رکھتی ہیں۔ بعض اوقات ان کے پاس کوئی گاہک نہیں آتا تو ان کو فاقوں کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے جبکہ

بعض اوقات یہ 800 سے 1000 روپے تک بھی کما کر گھر لے جاتی ہیں۔ ان عورتوں کی عمر اوسطاً پچیس سال ہے۔ ایک عورت نے بتایا کہ ہیرا منڈی میں سب سے زیادہ عتیقہ کا اڈہ چلتا ہے اور ہر پیشہ ور عورت چاہتی ہے کہ وہ یہاں کام کرے لیکن بعض اوقات یہ اڈہ بھی مندے کا شکار ہوتا ہے اور کئی کئی دن فاقوں میں گزر جاتے ہیں۔ اس نے بتایا کہ اس کا تعلق کوچہ شہباز خان سے ہے۔ اس کا والد نشئی ہے جبکہ وہ تین بہنیں ہیں۔ تینوں پیشہ کرتی ہیں۔ ایک بہن سلطانے کے اڈے پر کام کرتی ہے جبکہ دوسری داتا دربار اور بھائی کے سٹاپ پر کھڑی ہوتی ہے اور اس کے گاہک اس کو اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ اس عورت نے اپنا نام بتانے سے انکار کر دیا اور مجھے تاکید کی کہ اگر میں یہ باتیں لکھوں تو اس کا حوالہ بھی نہ دوں کیونکہ اس صورت میں اس کی نوکری ختم ہو سکتی ہے۔

عتیقہ کے اڈے پر کام کرنے والی عورتیں عتیقہ کو بہت زیادہ طاقتور اور رابطوں والی عورت سمجھتی ہیں ان کا خیال ہے کہ اگر عتیقہ کے ساتھ انہوں نے کوئی چالاکی کی تو وہ ان کو تباہ کر دے گی۔ اس وقت عتیقہ کے اڈے پر کام کرنے والے دلالوں کی تعداد 20 سے زائد ہے۔ یہ تمام دلال ہیروئن کا نشہ کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر کی قریبی عزیز عورتیں بھی اس کوٹھی خانے پر پیشہ کرتی ہیں۔

ایک مقامی باشندے نے بتایا کہ آج تک اس اڈے پر صرف ایک بار چھاپہ پڑا ہے۔ یہ چھاپہ 97ء میں الیکشن کے بعد نئی بننے والی حکومت کے ایک اعلیٰ ترین عہدیدار نے مروایا۔ اس شخص کے بقول مذکورہ عہدیدار ہیرا منڈی سے امیدوار تھا اور اس کی عتیقہ نے سپورٹ نہیں کی تھی جبکہ پوری ہیرا منڈی نے اس کو ووٹ دیا تھا۔ چھاپے کے دوران اس اڈے سے 9 لڑکیوں کو گرفتار کر لیا گیا جبکہ عتیقہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی۔ چھاپے کے بعد عتیقہ نے دو ماہ تک اڈے کو بند رکھا اور جب مذکورہ شخصیت کے ساتھ اس کی صلح ہو گئی اس نے تو دوبارہ پوری قوت کے ساتھ اڈہ شروع کر دیا اور کاروبار کیا جانے لگا۔ اس شخص نے مزید بتایا سیاستدانوں اور پولیس کے ساتھ تعلقات رکھنا ان عورتوں کی مجبوری ہے بصورت کاروبار نہیں کر سکتیں۔

عتیقہ کے کوٹھی خانے پر چلنے والی دوسری شفٹ دراصل اس کا اصل کاروبار ہے۔ اس شفٹ سے اس کو بہت زیادہ منافع ہوتا ہے اور اس شفٹ میں کام کرنے والی لڑکیاں بھی اچھے پیسے کماتی ہیں۔ ایک بجے رات کے بعد اس کوٹھی خانے پر تیسری شفٹ چلتی ہے۔ اس شفٹ میں زیادہ تر پرانی طوائفیں کام کرتی ہیں اور ان کا معاوضہ بھی بہت کم ہوتا ہے۔ رات کے پچھلے پہر عموماً بادامی باغ اور لاری اڈے سے ڈرائیور اور کنڈیکٹر یہاں آتے ہیں جو تھوڑے سے پیسے دیکر تسکین حاصل کرتے ہیں لیکن آج تک یہ نہیں ہوا کہ عتیقہ نے اس شفٹ کو بند کیا ہو یا اس شفٹ میں کام کرنے والی عورتوں کی تعداد میں کوئی کمی واقع ہوئی ہو۔ یہ شفٹ صبح 9 بجے تک چلتی ہے 9 بجے کے بعد دن کی شفٹ کی عورتیں اڈے پر پہنچ جاتی ہیں اور کاروبار ایک بار پھر پوری قوت کے ساتھ شروع ہو جاتا ہے۔

عتیقہ نے میرے ساتھ گفتگو کرنے سے معذرت کر لی اس کا عذر یہ تھا کہ اس کے مہمان آئے ہوئے ہیں اس لئے اس کے پاس وقت نہیں پھر کبھی جب میں آؤں گا تو وہ میرے ساتھ گفتگو کرے گی لیکن اصل میں وہ میرے ساتھ بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ جس معروف شخصیت نے مجھے اس کے کوٹھی خانے پر بھیجا تھا اس کا لحاظ کرتے ہوئے اس نے مجھے اجازت دیدی کہ میں جس عورت کے ساتھ چاہو گفتگو کر سکتا ہوں لیکن اس گفتگو کو ریکارڈ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے کوٹھی خانے پر کام کرنے والی عورتوں میں سے کسی ایک نے بھی مجھے اس کے مبینہ خاوند یا دوست کے بارے میں نہیں بتایا اور اس کے بارے میں مکمل لاعلمی کا اظہار کیا۔ مجھے بتایا گیا کہ اخبار والے ہمیشہ ان کو بلیک میل کرتے ہیں لیکن میں نے ان کو یقین دلایا کہ میں کسی اخبار میں کام نہیں کرتا میں صرف ایک سروے کر رہا ہوں جو کہیں بھی شائع نہیں ہو گا۔

عتیقہ کے کوٹھی خانے کی ایک خاصیت یہ ہے کہ یہاں پر ایک مخصوص انداز میں مالکن یا اس کے کارندوں کے بارے میں عورتیں آپس میں گفتگو کرتی ہیں اور ہر صورت میں عتیقہ کے اس کوٹھی خانے پر کام کرنا چاہتی ہیں۔ ان کو معلوم ہے کہ اگر ان کو یہاں کام نہ ملا تو پھر وہ کہیں بھی اس طرح آسانی کے ساتھ کام نہیں کر سکیں گی اور نہ ہی اتنا اچھا معاوضہ حاصل

کر سکیں گی۔ عقیقہ کے اڈے پر نئی آنے والی پیشہ ور عورتیں اس کو نقد روپوں کی صورت میں سلامی پیش کرتی ہیں اور اس کو خصوصی طور پر زردہ پکا کر کھلایا جاتا ہے جس میں میوے وغیرہ پڑے ہوتے ہیں۔ نئی عورت کو کام کرنے کی اجازت خود عقیقہ دیتی ہے اور اس موقع پر وہ عموماً اپنی جیب سے 500 روپے اس کو انعام دیتی ہے اور اس کے ہاتھوں پر مہندی لگائی جاتی ہے اگر عورت پہلے سے شادی شدہ ہو تو پھر اس کو اور اس کے خاوند کو ایک ایک جوڑا کپڑے کا دیا جاتا ہے۔ اگر عورت کنواری ہو تو اس کیلئے مالکن عموماً سونے کی انگوٹھی تیار کرواتی ہے جو اس کو پہنائی جاتی ہے۔ عورت قسم اٹھاتی ہے کہ وہ اڈے اور اس کی مالکن کی وفادار رہے گی اور کسی طرح بھی دھوکہ نہیں دے گی۔

اس موقع پر کام کیلئے آنے والی عورت کے والدین یا خاوند کو بھی بلوایا جاتا ہے۔ ان کو بھی اڈے کی ملازم عورتیں تحفے تحائف دیتی ہیں اور اچھا کھانا دیا جاتا ہے۔ آخر میں دعا کرائی جاتی ہے اور صدقے کے طور پر رقم یا کھانا غریبوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ نئی عورت کو اس کا نیا پیشہ ورانہ نام دیا جاتا ہے جو اس کی خواہش پر طے کیا جاتا ہے۔ اڈے پر کام کرنے والی عورتوں کو اپنے بچے ساتھ لانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اگر ان کو کچھ دن کیلئے کہیں جانا ہو یا مصروفیت کے باعث وہ کام پر نہ آسکیں تو چھٹی کیلئے باقاعدہ مالکن سے اجازت لینا پڑتی ہے بعض اوقات زیادہ کام کے دنوں میں مالکن عورتوں کی چھٹی کی درخواستیں مسترد کر دیتی ہے اور ان کو اگر پھر بھی جانا ہے تو وہ دوبارہ اڈے پر نہیں آسکتیں۔ شادی شدہ عورت سے حلف لیا جاتا ہے کہ وہ اڈے پر کام کے دوران حاملہ نہیں ہوگی اور اگر وہ حاملہ ہوگئی تو اس کو اڈے سے نکال دیا جائے گا۔ یہ ایسی شرائط ہیں جو خود ان کوٹھی کی عورتوں نے وضع کر رکھی ہیں جبکہ برصغیر میں جسم فروشی کی تاریخ میں اس طرح کی شرائط کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ عام کام کرنے والے لوگوں کی طرح ان پیشہ ور عورتوں کو اہم دنوں پر چھٹی نہیں ملتی۔ جب عام کاروبار اور اداروں میں چھٹی ہو تو ان لوگوں کا کاروبار زیادہ بڑھتا ہے اور گاہکوں کی زیادہ تعداد یہاں آتی ہے اس لئے ان کو عید، بقر عید، چودہ اگست، 6 ستمبر وغیرہ کی چھٹی نہیں ملتی۔ جبکہ محرم کے دس دن ان کی مکمل چھٹی ہوتی ہے۔ ان دنوں میں کوٹھی خانہ مکمل طور پر بند کر دیا جاتا ہے اور تیرہ

محرم کو کوٹھی خانہ شروع کیا جاتا ہے۔ یہاں کام کرنے والی عورتوں کی اکثریت شیعہ مسلک سے تعلق رکھتی ہے۔ اس لئے ان کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے پوری ہیرا منڈی کو بند کر دیا جاتا ہے۔

موسموں کی شدت کے دوران بھی ان اڈوں پر گاہک کم ہو جاتے ہیں۔ ان دنوں میں بھی بعض عورتیں کام سے چھٹی لے لیتی ہیں کیونکہ گاہک زیادہ نہیں ہوتے لیکن ان دنوں میں اڈے بند نہیں کئے جاتے۔ عتیقہ کے کوٹھی خانے سے لڑکی کو بک کر کے باہر لے جانے کی اجازت ہے لیکن اس کیلئے عموماً دگنا ریٹ دینا پڑتا ہے بعض اوقات مالکن لڑکی لے جانے والوں کی گارنٹی بھی مانگتی ہے اگر وہ ضمانت مہیا کر دیں تو لڑکی کو اس کے دنوں کے حساب سے ایڈوانس رقم لیکر ان کے ساتھ روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح جانے والی لڑکی کو ایک موبائل فون بھی اڈے کی طرف سے دیا جاتا ہے تاکہ وہ گاہے بگاہے اڈے کے ساتھ رابطہ رکھ سکے۔

عتیقہ کے اڈے کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ یہاں سے 20 ہزار روپے ماہانہ مقامی پولیس کو بھتہ ملتا ہے جبکہ پولیس والے اکثر اپنے لئے اور اپنے دوستوں کیلئے لڑکیاں یہاں سے لے جاتے ہیں اور ان کا معاوضہ ادا نہیں کرتے۔ وہ جس لڑکی کو ساتھ لے جانے کیلئے منتخب کرتے ہیں اس کا معاوضہ عتیقہ اس کو اپنی جیب سے ادا کرتی ہے۔ ایک دلال نے بتایا کہ لڑکیاں پولیس والوں کے ساتھ جانے سے ڈرتی ہیں کیونکہ پولیس والے ان پر تشدد کرتے ہیں۔ ان لڑکیوں کو سونے نہیں دیا جاتا اور اکثر اوقات انہیں بھوکا بھی رکھا جاتا ہے۔ ایک لڑکی نے بتایا کہ وہ پچھلے سال ایک پولیس افسر کے ساتھ مری گئی۔ لاہور سے دونوں گئے لیکن جب وہ مری پہنچے تو معلوم ہوا کہ اس کے دو دوست پہلے ہی مری پہنچے ہوئے ہیں۔ اس نے احتجاج کیا تو مذکورہ پولیس آفیسر نے اسے تھپڑ مارے اور سنگین نتائج کی دھمکیاں دیں۔ اس نے بتایا کہ مسلسل تین دن تک وہ پولیس والے اس کے ساتھ بے رحمانہ سلوک کرتے رہے۔ آخر چوتھے دن ان کو لاہور سے ایک ایمرجنسی فون کال گئی تو اس کی جان چھوٹی۔ اس نے بتایا کہ اس کو پولیس والوں سے بہت زیادہ خوف آتا ہے لیکن اس کی مجبوری ہے کہ اگر اس کی مالکن اس کو بھیجے گی تو پھر وہ انکار نہیں کر سکتی۔ انکار کی صورت میں اس کو اڈہ چھوڑنا پڑے گا اور اس

صورت میں اس کے لواحقین بھوکے مر جائیں گے لہٰذا ان کو بھوک اور تکلیف سے بچانے کیلئے وہ خود تکلیف برداشت کرنے کو تیار ہے۔

عتیقہ کے اڈے کے بارے میں ہیرا منڈی میں عام خیال یہی ہے کہ یہ اڈہ ہیرا منڈی کا سب سے بڑا اور کامیاب اڈہ ہے اور عتیقہ اس کو کامیابی کے ساتھ چلا رہی ہے۔ لوگوں کے مطابق عتیقہ ہیرا منڈی کی امیر ترین طوائف ہے اور اس کے اثر ورسوخ کے سامنے کسی دوسری طوائف کا بس نہیں چلتا۔ اب اس نے دوبئی اور دوسری خلیجی ریاستوں کی طرف بھی جانا شروع کر دیا ہے اور اگر اس کو وہاں موقع مل گیا تو پھر اس کا کاروبار مزید چمکے گا کیونکہ گزشتہ پانچ چھ برسوں کے دوران درجنوں طوائفوں نے دوبئی میں اپنا کاروبار شروع کیا ہے اور وہ وہاں بہت زیادہ پیسہ کما رہی ہیں۔ عتیقہ کے دوست کے بارے میں لوگ زیادہ نہیں جانتے البتہ اس کو عتیقہ کا شوہر قرار دیتے ہیں۔ عتیقہ کے اڈے کے ذکر کے بعد ہم دوسرے کوٹھی خانوں کے بارے میں بھی تفصیل کے ساتھ اگلے صفحات پر آپ کو معلومات دیں گے۔

رحمانے کا کوٹھی خانہ

عتیقہ کے کوٹھی خانے کے بعد لاہور کی ہیرا منڈی میں واقع سب سے بڑا کوٹھی خانہ عبدالرحمٰن عرف رحمانے کا کوٹھی خانہ ہے۔ اس کوٹھی خانے پر 30 سے زیادہ عورتیں جسم فروشی کے دھندے سے وابستہ ہیں اور اس کوٹھی خانے پر روزانہ آٹھ آٹھ گھنٹے کی دو شفٹیں چلتی ہیں۔ رحمانے کو پولیس کا ٹاؤٹ قرار دیا جاتا ہے۔ یہ شخص جسم فروشی کے ساتھ ساتھ چرس، ہیروئن اور شراب فروشی کا دھندہ بھی کرتا ہے۔

عتیقہ کے کوٹھی خانے سے چار قدم کے فاصلے پر مشہور ٹبی گلی شروع ہو جاتی ہے۔ اس گلی میں داخل ہوں تو یہ تقریباً پندرہ قدم چلنے کے بعد اچانک ایک چھوٹی سی گلی کی صورت میں بائیں ہاتھ مڑ جاتی ہے۔ تقریباً پچاس قدم چلنے کے بعد گلی کے تیسرے موڑ کے عین سامنے رحمان عرف رحمانے کا کوٹھی خانہ آباد ہے۔ اس کوٹھی خانے پر کام کرنے والی عورتیں عموماً مکان کے دروازے میں تین چار کی ٹولی کی صورت میں بیٹھی ہوئی ملتی ہیں۔ یہ عورتیں

راہ گزرتے لوگوں سے دریافت کرتی ہیں کہ وہ لڑکی چاہتے ہیں یا شراب؟

جب کوئی اجنبی راہ گیر اس اڈے کے سامنے سے گزرتا ہے تو اس کی وضع قطع دیکھ کر یہ عورتیں اندازہ لگا لیتی ہیں کہ وہ کس چیز کا خواہش مند ہے اگر ان کو شراب کا طلبگار محسوس ہو تو وہ دائیں ہاتھ کے انگوٹھے کو ہونٹوں کے ساتھ گلاس کی طرح لگا کر بغیر کچھ بولے ہوئے اس کو اشارہ کرتی ہیں اور اگر ان کو راہ گیر جنسی طلب کا شکار نظر آئے تو وہ اپنی شہادت کی انگلی کو اپنے ناک کے دائیں طرف لگا کر اس کو عورت اور خصوصاً خوبصورت عورت کے بارے میں پوچھتی ہیں۔ اگر ان دونوں اشاروں کے جواب میں کوئی رد عمل سامنے نہ آئے تو یہ اونچی آواز میں راہ گیر سے پوچھتی ہیں: "کینہ چاہیدا اے" (کیا چاہئے) اگر پھر بھی راہ گیر محض ان کی طرف دیکھتا ہوا گزر جائے تو ان میں سے کوئی ایک اٹھ کر اس کے ساتھ ساتھ گلی میں چلنا شروع ہو جاتی ہے اور اس وقت تک اس کو پھنسانے کی کوشش کرتی ہے جب تک وہ خود اپنی زبان سے انکار نہیں کر دیتا۔

رحمانے کے کوٹھی خانے پر عموماً زیادہ لوگ کم قیمت عورتوں سے اپنی جنسی بھوک مٹانے جاتے ہیں جبکہ رحمانا اور اس کی ملازم عورتیں اس کو شراب، چرس اور ہیروئن تک فروخت کرنے کی خواہش مند ہوتی ہیں کیونکہ ان سب کاموں میں ان کو 10 فیصد کمیشن حاصل ہوگا۔ رحمانے کے بارے میں عام لوگ یہ جانتے ہیں کہ اس کا تعلق امرتسر (بھارت) کے ایک چھوٹے سے گاؤں سے ہے۔ تقسیم کے بعد وہ پاکستان آیا تو اس کی عمر صرف 5 سال تھی۔ اس کے والدین نے مستی گیٹ کے علاقے میں ایک گھر حاصل کر کے اس میں رہنا شروع کر دیا۔ رحمانے کا کوئی اور بہن بھائی نہیں۔ جلد ہی اس کے والدین فوت ہو گئے۔ جب رحمانا بالکل یتیم ہو گیا یعنی اس کی ماں اور باپ انتقال کر گئے تو اس وقت اس کی عمر صرف 14 سال تھی۔

نو عمر رحمانے نے لاہور کے ہوٹلوں میں مزدوری کا آغاز کیا اور یوں اپنی زندگی گزارنے لگا۔ اس نے پچیس سال کی عمر تک لاہور کے تقریباً تمام علاقوں میں کام کیا اور ساتھ ساتھ اس نے کھانا پکانے میں بھی مہارت حاصل کر لی۔ تیس سال کی عمر میں رحمانا

نے لاہور ہیرا منڈی میں ایک طوائف کی لڑکی کو اغواء کر کے اس کے ساتھ شادی کر لی۔ یہ شادی کامیاب نہ ہو سکی اور رحمانے کو ایک دوسری طوائف سے شادی کرنا پڑی جس نے شادی کے بعد بھی پیشہ بر قرار رکھا۔ رحمانا اس کے ساتھ نیواں چیت رام روڈ پر رہنے لگا۔ اس طوائف سے رحمانے کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ رحمانے کی بیوی پچاس سال تک زندہ رہی اور اس کی موت ایک خطرناک بیماری کے باعث ہوئی۔ بیوی کے انتقال کے بعد رحمانے نے ٹبی گلی کی ایک پرانی طوائف شاہدو کے ساتھ شادی کر لی اور نیواں چیت رام روڈ والا مکان چھوڑ کر اپنی بیوی کے مکان پر چلا آیا۔

ٹبی گلی میں رہائش پذیر اس کی نئی اور تیسری بیوی ایک چھوٹا سا جسم فروشی کا اڈہ چلاتی تھی جہاں اس کے علاوہ تین اور عورتیں پیشہ کرتی تھیں۔ رحمانے نے اس اڈے کو وسعت دینا چاہی اور ہیرا منڈی کے مختلف علاقوں سے اس اڈے کیلئے لڑکیاں بھرتی کرنے لگا۔ جلد ہی رحمانے نے 16 لڑکیاں تلاش کر کے ان کو اپنے گھر میں پیشہ کرنے پر لگا دیا۔ یہ 1985ء کی بات ہے جب رحمانے نے اس اڈے کو کوٹھی خانے کا درجہ دیدیا اور ساتھ ہی شراب بھی فروخت کرنا شروع کر دی۔ 1990ء میں اس کی تیسری بیوی شاہدہ بھی انتقال کر گئی اور اس کی بیٹیاں اس کوٹھی خانے پر دھندہ کرنے لگیں۔ رحمانے کے اڈے پر کام کرنے والی ایک عورت نے بتایا کہ رحمانے نے بیوی کی زندگی میں اپنی بیٹیوں کی نتھ نہیں کھلوائی لیکن اس کے انتقال کے بعد رحمانے نے بڑی بیٹی کی نتھ کھولنے والے سے 50,000 روپے لئے جبکہ دوسری بیٹی کی نتھ اس نے دوبئی میں کھلوائی اور لوگ کہتے ہیں کہ اس نے اس کے 2,00000 روپے حاصل کئے تھے۔

جلد ہی ہیرا منڈی کے علاقوں میں رحمانے کا اڈہ شہرت حاصل کرنے لگا اور اس کو ایک باقاعدہ کوٹھی خانے کی حیثیت دی گئی۔ رحمانے نے دن اور رات کے آٹھ آٹھ گھنٹوں پر مشتمل دو شفٹیں چلا دیں اور دھڑا دھڑ نئی عورتوں کو اس اڈے پر بھرتی کرنے لگا۔ اس کے اڈے پر صبح کی شفٹ میں پیشہ کرنے والی عورتوں کا ریٹ 100 روپے سے 200 روپے تک جبکہ شام کی شفٹ میں کام کرنے والی عورتوں کا ریٹ 300 سے 500 روپے ہے۔ رحمانے

نے اپنے ایک بیٹے کو بھی اس کاروبار میں شامل کر لیا اور اس کے ذریعے لاہور کے شوقین مزاج لوگوں میں لڑکیاں اور شراب سپلائی کرنے لگا۔ اس کے بعد اس نے چرس اور ہیروئن بھی فروخت کرنا شروع کر دی اور یہ سلسلہ تادم تحریر بھی پوری قوت کے ساتھ جاری و ساری ہے۔

رحمانے کے ایک دلال نے بتایا: "رحمانا دراصل بہت تجربہ کار آدمی ہے اور اس نے ساری زندگی ہیرا منڈی میں گزار دی ہے۔ لوگ اس کو کئی برسوں سے جانتے ہیں اور اس کی عزت کرتے ہیں۔ اس کا تعلق بنیادی طور پر طوائفوں کے خاندان سے نہیں جبکہ اس نے طوائفوں کے ساتھ شادیاں کیں اور ہیرا منڈی میں رہنے لگا۔ یہاں اس نے پیشہ شروع کیا اور پھر اس کا اڈہ پوری ہیرا منڈی کا مشہور اڈہ بن گیا۔ پولیس اس پر اس لئے ہاتھ نہیں ڈالتی کہ یہ پولیس کو اس کا حصہ ادا کرتا ہے اور پھر پیشہ کرتا ہے۔ اس کے اڈے پر جو لڑکیاں کام کرتی ہیں رحمانا ان کا مکمل خیال رکھتا ہے اور اگر ان کو کوئی تکلیف ہو یا کسی چیز کی ضرورت ہو تو رحمانا ان کی ضرورت پوری کرتا ہے۔ رحمانا اصول کا پکا آدمی ہے جبکہ جو لوگ اس کی مخالفت کرتے ہیں وہ اس سے حسد کرتے ہیں اور ان کو رحمانے کی ترقی ہضم نہیں ہوتی"۔

رحمانے کا اڈہ بلکہ کوٹھی خانہ صبح 10 بجے شروع ہوتا ہے اور دو شفٹوں کی صورت میں رات 2 بجے تک چلتا ہے۔ یہاں لوگوں کی بڑی تعداد آتی ہے اور پیسے ادا کر کے جنسی تسکین حاصل کرتی ہے۔ کوٹھی خانے کا سارا انتظام وہ خود سنبھالتا ہے اور گاہکوں کے مکمل آرام کا خیال بھی خود رکھتا ہے۔ آج تک کسی گاہک نے اس کے اڈے پر غل غپاڑہ نہیں کیا اور نہ ہی کبھی اس کے اڈے پر پولیس نے چھاپہ مارا ہے۔ رحمانے کے اڈے پر کام کرنے والی عورتیں ہیرا منڈی، کریم پارک اور اندرون لاہور کے مختلف محلوں سے یہاں آتی ہیں۔ جب یہ عورتیں کوٹھی خانے پر آتی ہیں تو برقع اتار دیتی ہیں اور شوخ رنگوں کے کپڑے پہن کر میک اپ کر کے اپنے اپنے کمروں میں بیٹھ جاتی ہیں۔ ان کے دلال گاہکوں کو لیکر آتے رہتے ہیں اور وہ ان سے پیسے بٹور کر ان کو "جنسی سکون" بہم پہنچاتی رہتی ہیں۔

رحمانے کے کوٹھی خانے پر اس وقت 12 دلال کام کر رہے ہیں۔ ان دلالوں کی

کثریت ہیروئن کی عادی ہے اور دن بھر کی کمیشن کی کمائی کو ہیروئن پر لگا دیتی ہے۔ مزے کی
ت یہ ہے کہ ان کو ہیروئن بھی رحمانا ہی فراہم کرتا ہے۔ دلال سارا دن ٹبی گلی اور بازار
یخوپوریاں میں منڈلاتے رہتے ہیں، گاہک تلاش کرتے رہتے ہیں جب ان کو گاہک مل جاتا
ہے تو وہ خوشی خوشی اس کو کوٹھی خانے کے مین ہال میں لے آتے ہیں جہاں دلال کی طے کردہ
قم رحمانا یا اس کا بیٹا وصول کرتا ہے۔ اس کے بعد رحمانا دو تین عورتوں کو اس کے سامنے لے
تا ہے اور سوال کرتا ہے: "کس کے ساتھ بیٹھنا پسند کرے گا؟" گاہک آنکھ یا ہاتھ کے
شارے سے اس کو اپنی پسند کی لڑکی بتاتا ہے تو رحمانا دوسری لڑکیوں کو کمرے میں جانے کی
جازت دے دیتا ہے۔ گاہک کمرے میں داخل ہو کر چارپائی پر بیٹھنے کے بعد تیار ہوتا ہے کہ
یک دوسری عورت اس سے کمرے کا کرایہ لینے پہنچ جاتی ہے۔ جو عموماً 20 سے 30 روپے
کے درمیان ہوتا ہے۔ گاہک چاروناچار یہ کرایہ ادا کرتا ہے اور اپنی پسندیدہ عورت کو چند
روپے انعام کے طور پر دیکر مشغول ہو جاتا ہے۔

رحمانے کے بیٹے نے بتایا کہ اس اڈے پر ان کے مستقل گاہک زیادہ تعداد میں آتے ہیں۔
س کے بقول آج تک کبھی پولیس نے اس اڈے پر چھاپہ نہیں مارا کیونکہ ہم پولیس کی اجازت
سے یہ دھندہ کرتے ہیں، اس لئے وہ پھر چھاپہ کیوں مارے گی۔ رحمانے کے بیٹے نے مزید بتایا
لہ ہمارے گاہک کئی برسوں سے صرف ہمارے پاس ہی آرہے ہیں۔ ہم ان کو اچھی سروس
فراہم کرتے ہیں تو وہ دوبارہ ہمارے پاس آتے ہیں۔ اس نے مزید بتایا کہ جو لوگ عورتوں کو
یہاں سے کہیں اور لے جانا چاہتے ہیں ہم ان سے زیادہ فیس وصول کرتے ہیں اور ان کو عموماً
شخصی ضمانت پر لڑکی دی جاتی ہے کیونکہ بعض اوقات لوگ نہ صرف ان عورتوں کو ان کا
معاوضہ نہیں دیتے بلکہ ان کے ساتھ تشدد کرتے ہیں، ان کے پاس اگر کوئی پیسہ یا زیور ہو تو
وہ بھی اتار لیتے ہیں اور زیادہ وقت اپنے پاس رکھتے ہیں۔ اس لئے ہم صرف ان لوگوں کو
لڑکیاں ساتھ لے جانے دیتے ہیں جن کے بارے میں ہم جانتے ہوتے ہیں اور وہ ہمارے
پرانے گاہک بھی ہوتے ہیں۔

رحمانے کے کوٹھی خانے پر کام کرنے والی عورتوں میں سے 5 عورتیں بہاری

خاندانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان عورتوں نے 95ء کے شروع میں یہاں دھندہ کیا اور ان کا ریٹ دیگر عورتوں سے کم ہے۔ ایک دلال نے بتایا "لوگ ان عورتوں کو زیادہ پسند نہیں کرتے کیونکہ ایک تو یہ کمزور ہوتی ہیں دوسرا ان کے قد چھوٹے اور رنگ زیادہ سیاہ ہوتا ہے۔ ان عورتوں کی باری اکثر اس دن آتی ہے جب دوسری عورتیں بک ہو جاتی ہیں اور ان کے علاوہ اڈے پر کوئی موجود نہیں ہوتی تو لوگ مجبوراً ان کو ساتھ لے جاتے ہیں یا یہیں ان کے ساتھ بیٹھ جاتے ہیں۔ ان کا ریٹ بھی دوسری عورتوں سے سو پچاس روپے کم ہوتا ہے لیکن پھر بھی ان کی زیادہ بکنگ نہیں ملتی اور نہ زیادہ گاہک یہاں آکر ان کو پسند کرتے ہیں"۔

رحمانے نے بتایا کہ یہ بہاری لڑکیاں میاں چنوں کے بہاری کیمپ سے یہاں آئی ہیں۔ ان کے بقول ان کے خاندانوں کو حکومت پاکستان اوکاڑہ لائی اور پھر اوکاڑہ سے وزیر اعلیٰ غلام حیدر وائیں ان کو میاں چنوں کے قریب لے گئے۔ جہاں ان کیلئے ایک کالونی بنائی گئی ہے۔ ابھی کالونی نہیں بنی تھی کہ حکومت ختم ہو گئی اور بہاریوں کو کسی نے نہ پوچھا۔ جب بہاری بھوک سے مرنے لگے تو ان عورتوں کے مرد ان کو اوکاڑہ اور لاہور کی ہیرا منڈیوں میں چھوڑ کر خود کراچی بھاگ گئے۔ رحمانا کے بقول اس نے ان عورتوں پر ترس کھاتے ہوئے ان کو اپنے کوٹھی خانے میں نہ صرف ملازمت دی بلکہ ان کو یہاں رہائش بھی دیدی۔ اب جب یہ عورتیں پیسے کما رہی ہیں تو ان کے خاوندوں نے بھی ان کے ساتھ رابطہ کر لیا ہے اور جب بھی وہ ان سے ملنے آتے ہیں تو ان سے پیسے لیکر ان کو جلد ہی اپنے ساتھ لے جانے کا وعدہ کرتے ہیں لیکن پھر لمبے عرصے تک ان کا کچھ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کدھر ہیں اور ابھی تک ان کو لینے کیوں نہیں آئے۔

رحمانے کے اڈے پر جو عورتیں اس وقت کام کر رہی ہیں ان میں ایک ایسی عورت شامل ہے جس کے بارے میں بعض ذرائع دعویٰ کرتے ہیں کہ اس کا تعلق لاہور کے ایک بڑے معروف خاندان سے ہے۔ وہ 1980ء میں اپنے ایک ڈرائیور کے ساتھ کالج جاتے ہوئے بھاگ گئی تھی ڈرائیور اس کو لیکر کراچی اور دوسرے شہروں میں پھرتا رہا لیکن ایک دن اس نے تنگ آکر اس عورت کو ہیرا منڈی کی ایک طوائف کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔ اس

ڈرائیور نے اس کے 10,000 روپے حاصل کئے اور اس کو مذکورہ طوائف کے ڈیرے پر پہنچا دیا۔ اس طوائف نے اس عورت سے چار سال تک مسلسل پیشہ کرایا اور پھر اس کو آزاد کر دیا۔ جب یہ عورت آزاد ہوئی تو اس نے اپنے گھر والوں سے رابطہ کیا مگر انہوں نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

گھر والوں کے انکار کے بعد اس عورت نے داتا دربار پر رہنا شروع کر دیا لیکن وہاں بھی اس کا دل نہ لگا تو یہ ہیرا منڈی آگئی جہاں اس نے رحمانے کے ساتھ رابطہ کیا اور اس کو اپنی داستان سنائی تو اس نے ترس کھاتے ہوئے اس عورت کو اپنے کوٹھی خانے پر رکھ لیا۔ اس عورت کی عمر اس وقت 43 سال سے زیادہ ہے جبکہ اس کا جسم بہت زیادہ پھول چکا ہے اور سفید بالوں نے اس کو عمر رسیدہ بنا دیا ہے۔ مذکورہ عورت نے اپنی داستان خود سنانے سے انکار کر دیا اور دوڑ کر کمرے میں چلی گئی۔ رحمانے نے بتایا کہ وہ بہت کم بات چیت کرتی ہے، زیادہ تر خاموش رہتی ہے اور اس کو آج تک قہقہہ مار کر ہنستے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ اگر اس کو کہا جائے کہ وہ اپنے لواحقین کے بارے میں اصل کہانی سنائے تو وہ سختی سے انکار کر دیتی ہے اور لڑنے مرنے پر اتر آتی ہے۔ رحمانے کے بقول اب اس کو گاہک زیادہ پسند نہیں کرتے اس لئے اس کی پریشانیوں میں زیادہ اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ رحمانے کے کوٹھی خانے کے ایک گندے اور تاریک کمرے میں مستقل رہائش پذیر ہے۔

سلطانے کا کوٹھی خانہ

حقیقہ، رحمانے اور سلطانے کے اڈوں کو ہیرا منڈی کے سب سے بڑے تین کوٹھی خانے قرار دیا جاتا ہے۔ رحمانے اور سلطانے کے ناموں میں لفظی قربت سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے سلطانا رحمانے کا بھائی ہے لیکن ان دونوں کا آپس میں کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ دونوں چونکہ ایک ہی گلی میں اپنا اپنا کاروبار چلاتے ہیں، اس لئے دونوں ایک دوسرے کے شدید دشمن ہیں، ایک دوسرے پر عجیب و غریب الزام لگاتے اور ایک دوسرے کی مخالفت کرتے رہتے ہیں۔ سلطانے کا اڈہ رحمانے کی نسبت کم لڑکیاں ملازم رکھتا ہے اس لئے اس کو رحمانے

کے کوٹھی خانے سے چھوٹا کوٹھی خانہ کہا جا سکتا ہے۔ رحمانے کی طرح سلطانے کے کوٹھی خانے پر بھی صبح و شام دو شفٹیں چلتی ہیں اور جسم فروش عورتیں مختلف علاقوں سے آٹھ آٹھ گھنٹے کیلئے یہاں آتی ہیں۔

سلطانے کا کوٹھی خانہ 1986ء میں اس وقت وجود میں آیا جب اس کی بیوی نے اس سے طلاق لے کر اس کو اپنے گھر واقع بازار شیخوپوریاں سے نکال دیا۔ سلطانے نے بازار شیخوپوریاں کی ایک مشہور طوائف نذیراں بیگم سے شادی کر رکھی تھی۔ نذیراں جو پہلے علاقہ نواب صاحب کے قریب واقع ایک معروف گاؤں کے زمیندار کی رکھیل تھی۔ اس نے اس چوہدری کو کرائے کے بدمعاشوں سے قتل کروا کر ٹبی گلی کے سلطان عرف سلطانے کے ساتھ شادی کر لی تھی۔ اس شادی سے پہلے سلطانا ہیرا منڈی کے علاقے میں ایک ناجائز فروش کے طور پر مشہور تھا، لوگ اس کو پولیس کا ٹاؤٹ اور ایک اوباش شخص سمجھتے تھے۔ سلطانے نے نذیراں کے اڈے کی طوائف ثمینہ کے ساتھ عشق کیا اور تقریباً ایک سال تک اس کے ساتھ بغیر شادی کے رہتا رہا۔ ثمینہ نے لاہور برانڈرتھ روڈ کے ایک تاجر کے ساتھ شادی کر لی تو سلطانے نے اس کی مالکن نذیراں بیگم کے ساتھ تعلقات استوار کر لئے۔ دونوں نے ایک دن شادی کا اعلان کر دیا لیکن اس سے پہلے نذیراں اپنے پرانے دوست کو راستے سے ہٹا چکی تھی۔

نذیراں کے بارے میں بازار شیخوپوریاں کی ایک طوائف ناصرہ نے بتایا کہ نذیراں بیگم جھنگ کے علاقے شاہ جیونہ کی رہنے والی ہے۔ اس کا تعلق ایک معروف خاندان سے ہے جو علاقے کا بہت بڑا زمیندار خاندان ہے۔ نذیراں بیگم نے ایوب خان کے مارشل لاء کے دوران فوجی افسروں کے ساتھ تعلقات استوار کئے اور شاہ جیونہ سے اس نے اپنا گھر لاہور ماڈل ٹاؤن میں منتقل کر لیا۔ اس کے بیٹے اس وقت ایچی سن کالج میں پڑھتے تھے اور ان کو گھڑ سواری کا شوق تھا۔ نذیراں بیگم نے اپنے خاوند کے ساتھ مل کر ایک کلب بنایا جہاں اس وقت کے فوجی عہدیداران بیگمات کے ساتھ آتے تھے اور وہ اس کلب کے باقاعدہ ممبر تھے۔ اچانک حالات نے رخ بدلا اور نذیراں بیگم کو اس کے خاوند نے چال چلن کی خرابی کے باعث طلاق

دیدی اور اس سے بچے چھین لئے۔ اس زمیندار نے نذیراں بیگم پر طرح طرح کے الزامات لگائے اور ساری جائیداد فروخت کر کے بچوں کو ساتھ لے کر لندن چلا گیا۔ اس کے بعد وہ لندن میں ایسا بسا کہ آج تک پاکستان نہیں آیا۔

نذیراں بیگم کچھ عرصہ تک عدالتوں میں دھکے کھاتی رہی لیکن اس کو اس کا حق نہ مل سکا اور اس کے خاوند نے جس شخص کے ہاتھ زمین فروخت کی تھی اس کا نام پاکستان کی سیاست میں بہت بڑا تھا اس لئے نذیراں بیگم کی ساری کوششیں رائیگاں گئیں۔ اس کو کچھ بھی نہ مل سکا، نذیراں بیگم نے ایک سکول میں ٹیچر کی نوکری شروع کی لیکن کچھ عرصہ بعد یہ نوکری بھی چھوڑ دی۔ ان دنوں نذیراں بیگم کا کوئی پرسان حال نہیں تھا۔

اصل میں نذیراں بیگم کا کوئی آگے پیچھے نہیں تھا۔ لوگ بتاتے ہیں کہ نذیراں کے والد نے لاہور کی ہیرا منڈی کی ایک طوائف بسم اللہ بی بی کے ساتھ شادی کی تھی۔ بسم اللہ بی بی کے والدین تقسیم ہند کے وقت ہجرت کے دوران سکھ بلوائیوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے جبکہ اس کے دیگر رشتہ داروں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ زندہ رہے یا مر گئے۔ بسم اللہ کی بی بی وفات کے بعد اس زمیندار نے نذیراں بیگم کی منگنی قریب کے ایک گاؤں کے زمیندار کے لڑکے کے ساتھ کر دی جو اس وقت پاکستان کی سیاست میں نام بنانے کی کوشش کر رہا تھا یہ شادی بہت دھوم دھام کے ساتھ ہوئی اور نذیراں کے بطن سے تین بیٹے اور ایک بیٹی پیدا ہوئی لیکن ناچاقی کے بعد اس کے خاوند نے اسے طلاق دیدی۔ ساری جائیداد فروخت کر دی اور بچوں کو لیکر برطانیہ چلا گیا۔ نذیراں بیگم خاموشی کے ساتھ زندگی گزارنے لگی لیکن پے در پے ناکامیوں کے باعث وہ بہت زیادہ دل برداشتہ ہو گئی۔ اس نے لاہور کی ہیرا منڈی میں ایک طوائف عروج بیگم کے ہاں آنا جانا شروع کر دیا۔ عروج کا تعلق فلم انڈسٹری کے ساتھ بھی تھا اس لئے نذیراں کی ملاقات اداکاروں اور اداکاراؤں کے ساتھ ہونے لگی۔ ایک دن اس نے اپنا کرائے کا ایک کمرہ چھوڑا اور مستقل طور پر عروج بیگم کے ہاں بازار شیخوپوریاں چلی آئی۔

ہیرا منڈی کے کچھ لوگوں کا دعویٰ ہے کہ نذیراں بیگم نے عروج کے گھر میں، جسم

فروشی نہیں کی بلکہ ایک مہمان کے طور پر رہتی رہی، یہ لوگ وہ ہیں جن کی عمریں اس وقت 60 سال سے زائد ہیں اور وہ بیس تیس برس پہلے کی ہیرا منڈی کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ میاں یوسف نامی ایک مقامی رہائشی نے بتایا کہ یہ سب کو معلوم تھا کہ بسم اللہ بیگم کی بیٹی نذیراں بیگم عروج بیگم کے گھر میں رہائش پذیر ہے لیکن یہ کوئی نہ کہتا تھا کہ نذیراں بیگم نے بھی دھندہ شروع کر دیا ہے۔ اس دوران نذیراں بیگم کی ملاقات نوجوان سلطان احمد کے ساتھ ہو گئی جو ان دنوں ہیرا منڈی کا سب سے مشہور آدمی تھا اور لوگ اس کو اپنا رہنما سمجھتے تھے۔ اس کا تعلق لاہور کے بڑے معروف سیاستدانوں اور پولیس حکام کے ساتھ تھا۔ سلطان احمد ہیرا منڈی کے باسیوں کے مسائل حل کراتا اور ان کے کام آتا۔ نذیراں بیگم کا اس دوران سلطان احمد کے ساتھ تعلق شروع ہوا۔

ایک مشہور طوائف کے مطابق سلطان احمد اور نذیراں بیگم ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ سلطان احمد نذیراں بیگم سے دس پندرہ سال چھوٹا تھا لیکن نذیراں بیگم بھی ایک شاندار عورت تھی۔ دونوں نے ایک دن شادی کا اعلان کر دیا اور سلطان احمد نذیراں کے ساتھ عروج بیگم کے گھر میں رہنے لگا۔ عروج بیگم نے جب اپنے خاندان کے ہمراہ کراچی جانے کا فیصلہ کیا تو انہوں نے اپنا مکان انتہائی کم داموں سلطان احمد اور نذیراں بیگم کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔ شادی سے پہلے سلطان احمد عرف سلطانا نے کچھ نہیں کرتا تھا اور نذیراں بیگم بھی عروج کے ہاں مہمان کے طور پر رہ رہی تھی شادی کے بعد انہوں نے ایک چھوٹی سی کریانے کی دکان شروع کر لی لیکن یہ دکان نہ چل سکی اور انہوں نے اس کو جلد ہی بند کر دیا۔

واقفان حال کہتے ہیں کہ نذیراں بیگم جسم فروشی کا کاروبار نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن سلطانے نے گھر میں جسم فروش لڑکیاں رکھ لیں اور جسم فروشی کا دھندہ شروع کر دیا۔ آہستہ آہستہ یہ اڈہ نذیراں بیگم کا اڈہ کہلانے لگا اور اس کے گاہکوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ نذیراں بیگم جو شروع میں اس کاروبار کی مخالف تھی اس نے بھی اس کاروبار کو تسلیم کرنا شروع کر دیا اور ان دونوں کا اڈہ ہیرا منڈی کا مشہور اڈہ بن گیا۔ اس وقت نذیراں بیگم کے اڈے پر کام کرنے والی لڑکیوں کی تعداد 10 سے زائد تھی جو بظاہر مجرہ کرتیں لیکن اصل میں مجرے کی آڑ میں وہ جسم

فروشی کا دھندہ کرتیں۔ ان دنوں یہ بات بھی بہت مشہور ہوئی کہ نذیراں بیگم نے عروج بیگم کے گھر میں رہتے ہوئے رائے ونڈ روڈ کے ایک زمیندار کی رکھیل بننا قبول کر لیا تھا اور اس زمیندار کے قتل میں بھی نذیراں کو ملوث کیا جا رہا تھا لیکن بعد میں نذیراں بی بی کو پولیس نے بے گناہ قرار دیکر چھوڑ دیا اور اس طرح اس پر یہ الزام ختم ہو سکا۔

نذیراں بیگم اور سلطانا کی شادی زیادہ دیر نہ چل سکی۔ نذیراں نے جس شادی کے بعد بازار شیخوپوریاں والا مکان اپنے نام کروالیا تھا لہٰذا اس نے طلاق حاصل کر کے سلطانے کو گھر سے نکال دیا۔ سلطانے نے یہ مکان واپس لینے کیلئے کرائے کے بد معاشوں وغیرہ کا سہارا لیا لیکن اس کو کامیابی حاصل نہ ہو سکی کیونکہ نذیراں کے تعلقات بھی اسلام آباد تک پھیلے ہوئے تھے اور اس کو شکست دینا مشکل تھا۔

سلطانے نے نذیراں سے علیحدگی کے بعد ٹبی گلی میں ایک جسم فروشی کا اڈہ بنانے کا پروگرام بنایا۔ اس نے ٹبی گلی میں ایک پرانے مکان کی مرمت کروائی اور اس میں بیٹھے کرایہ دار دفتریوں اور موچیوں کو نکال دیا۔ تقریباً چھ ماہ کے بعد اس نے ایک بڑا کوٹھی خانہ شروع کر دیا۔ ادھر نذیراں بیگم نے بھی باقاعدگی کے ساتھ ایک مجرہ خانہ اور جسم فروشی کا اڈہ شروع کر دیا۔ لوگوں کی بڑی تعداد ان دونوں کے اڈوں پر جاتی اور یوں دونوں کا کاروبار یکساں طور پر کامیابی کے ساتھ چلنے لگا۔

نذیراں بیگم جوان دنوں شدید علیل ہے اور اس کو اس کی ملازم طوائفیں سنبھال رہی ہیں وہ عام لوگوں کے ساتھ ملنے سے کتراتی ہے۔ میں نے ہیرا منڈی کی ایک اہم سماجی اور سیاسی شخصیت کی خدمات حاصل کیں اور نذیراں بیگم کے ہاں چلا گیا۔ شروع میں اس نے بات کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ اب اپنا مردہ خراب نہیں کرانا چاہتی لیکن میری محترم شخصیت کی مداخلت پر اس نے اس وعدے کے ساتھ میرے ساتھ گفتگو شروع کی کہ میں اس سے اس کے خاندان، بچوں اور ماضی کے بارے میں کچھ نہیں پوچھوں گا۔ میں نے یہ وعدہ کر لیا اور اس کے ساتھ گفتگو شروع کر دی۔ اس نے کہا کہ اس کو آدمی پہچاننے میں کبھی غلطی کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا لیکن پہلی بار اس کو احساس ہوا کہ اس نے سلطانے کو پہچاننے میں غلطی کی

تھی کیونکہ سلطانے نے اس کے ساتھ تعلقات قائم کرتے وقت جھوٹ نہیں بولا تھا اور ساری زندگی کبھی جھوٹ نہ بولنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ اپنے اس وعدے پر قائم نہ رہ سکا اور اس نے جلد ہی جھوٹ کا سہارا لینا شروع کر دیا۔

"میں نے سلطانے کو جسم فروشی کا دھندہ کرنے سے روکا لیکن اس نے کہا کہ اس کی دکان بری طرح ناکام ہو گئی ہے اور اب اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی کاروبار نہیں رہا اور اگر اس نے یہ دھندہ شروع نہ کیا تو وہ دونوں بھوکے مر جائیں گے۔ اس نے دھندہ شروع کر دیا اور ظلم اس وقت ہوا جب اس نے دھندہ کرنے والی لڑکیوں سے خود بھی ناجائز تعلقات استوار کر لئے۔ میں نے اس کو خبردار کیا اور جس لڑکی کے ساتھ اس کا تعلق تھا اس کو اپنے گھر سے نکال دیا تو اس نے مجھے شدید تشدد کا نشانہ بنایا۔ سلطانا جانتا تھا کہ اس کا ہاتھ روکنے والا کوئی نہیں، اس لئے اس نے جی بھر کر مجھ پر ظلم کیا اور مجھے تقریباً اس گھر میں قید کر کے رکھ دیا۔ میں نے ایک دن گھر سے بھاگنے کی کوشش کی تو اس نے مجھے دروازے سے پکڑ لیا اور میرے پاؤں میں زنجیر ڈال دی۔ سارا دن مجھے کمرے میں بند رکھا جاتا اور شام کو میرے پاؤں کی زنجیر چارپائی کے ساتھ باندھ دی جاتی۔ میں نے اس حالت میں برطانیہ میں مقیم اپنے بچوں کے ساتھ رابطہ کیا میری یہ کوشش اس لئے کامیاب ہو گئی کہ میرا سابق خاوند "شاہ جی" انتقال کر چکا تھا۔ میں نے محض اپنی یادداشت کا سہارا لیکر ایک خط لکھ کر ایک عورت کے ذریعے پوسٹ کروا دیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میرا خاوند میرے بچوں کو لیکر لندن چلا گیا تو وہاں سے ایک بار اس نے میرے ساتھ رابطہ کیا تھا اور مجھے میری عزیز ترین اور اکلوتی بیٹی کی وفات کی اطلاع دی تھی۔ میں نے یہ خط سنبھال لیا تھا۔ یہ خط آج بھی میرے پاس موجود ہے۔ میں نے اس ایڈریس پر خط لکھ دیا اور اس میں اپنے بیٹے کو مخاطب کر کے ساری داستان لکھ دی۔ میں نے بیٹے کو بتایا کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے اور کس نے کیا کیا ظلم کیا ہے۔ ان کا باپ کیا کرتا تھا اور بالآخر اس نے مجھ سے میری اولاد بھی چھین لی (روتے ہوئے) میرے بیٹے نے فوراً میرے خط کا جواب مجھے گھر پر فون کی صورت میں دیا جب میں نے فون اٹھایا تو ایسے لگا جیسے "شاہ جی" بول رہے ہوں۔ میں نے روتے ہوئے، بیٹے کو مدد کیلئے پکارا۔ اس نے آنے کا

وعدہ کیا اور ٹھیک دس دن کے بعد میرا بڑا بیٹا میرے گھر پہنچ گیا۔ اس نے سلطانے کو بتایا کہ اگر اس نے میرے ساتھ کوئی زیادتی کی تو وہ اس کے ہاتھ توڑ دے گا۔ اس نے سلطانے کو ایک لاکھ روپیہ دیا اور مجھے اس سے طلاق لے دی۔ میرا بیٹا جو لندن میں ایک امیر پاکستانی کے طور پر جانا جاتا ہے اس نے پورا ایک ماہ میرے ساتھ گزارا۔ ہم دونوں ماں بیٹا لاہور کے فائیو سٹار ہوٹل میں رہے اور اس نے اس دوران میری زندگی کے بارے میں ایک ایک لفظ مجھ سے سنا۔ ایک ماہ کے بعد اس نے مجھے بازار شیخوپوریاں میں ایک اچھا اور چھوٹا مکان لے دیا اور میری یہ شرط مان لی کہ میں اب ساری زندگی اس علاقے میں رہنا چاہتی ہوں۔ جب وہ چلا گیا تو اس نے جا کر یہ داستان اپنے باقی دونوں بھائیوں کو سنائی۔ دونوں چھوٹے بیٹے ایک ماہ بعد میرے پاس پہنچ گئے اور انہوں نے بھی پورا ایک ماہ میرے ساتھ اسی گھر میں گزارا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے لیکن میں نے واپس جانے سے انکار کر دیا اور بقیہ زندگی اسی علاقے میں گزارنے کی خواہش ظاہر کی۔ اب میں اس گھر میں رہتی ہوں اور میرا ہفتے میں دو بار اپنے بچوں کے ساتھ فون پر رابطہ ہوتا ہے۔ میں بالکل اکیلی تھی اس لئے میں نے اس علاقے کی چند لڑکیوں کو اپنے پاس رکھ لیا ہے یہ لڑکیاں دھندہ نہیں کرتیں لیکن مجرا ضرور کرتی ہیں۔ میں ان کو منع نہیں کرتی اور نہ ہی میرے بیٹے اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ میں ویسے بھی زندگی کے آخری دن گزار رہی ہوں اور اب خوش ہوں کہ میری اولاد میرے ساتھ مل گئی ہے اور ان کو میرے بارے میں کوئی پشیمانی نہیں"۔

یہ تو تھی نذیراں بیگم کی داستان! دوسری طرف سلطانے نے بھی نذیراں بیگم کے جواب میں اپنی ایک الگ داستان سنائی۔ اس کو شکوہ ہے کہ لوگوں نے صرف نذیراں بیگم کی داستان پر یقین کر لیا اور اس کی بات نہیں سنی۔ سلطانے جو اپنے کوٹھی خانے کے بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتا، وہ نذیراں بیگم پر بے تحاشہ الزامات عائد کرتا ہے اور اس کو ایک خاندانی طوائف قرار دیتا ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ نذیراں بیگم کی ماں نے بھی دھوکے سے ایک جاگیردار کے ساتھ شادی کی تھی اس نے بھی دھوکے سے میرے ساتھ شادی کی اور مجھ کو جسم فروشی کے دھندے پر مجبور کیا۔ اس کا دعویٰ ہے کہ نذیراں بیگم اب بھی پیشہ کراتی

ہے اور اس نے اپنے اڈے پر سات لڑکیاں پیشے پر بٹھا رکھی ہیں اور ان کی کمائی کھاتی ہے۔ اس کے بچوں نے اس کو اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کی لیکن اس نے ہیرا منڈی چھوڑنے سے انکار کر دیا اور اب بھی اس کو پیشہ چھوڑنے کی استطاعت نہیں ہوئی حالانکہ اس کی قبر میں ٹانگیں ہیں۔

سلطانے کا اڈہ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے اس وقت ہیرا منڈی کے تین بڑے کوٹھی خانوں میں شامل ہے۔ اس کے اڈے پر مسلسل سولہ گھنٹے جسم فروشی کا دھندہ ہوتا ہے۔ اس کے کوٹھی خانے پر جو لڑکیاں کام کرتی ہیں وہ لاہور کی ہیرا منڈی اور دوسرے علاقوں سے یہاں آتی ہیں۔ سلطانے نے اپنے اڈے پر دس دلال بھرتی کر رکھے ہیں جو ساری رات اور دن اس کے اس اڈے کیلئے گاہک تلاش کرتے رہتے ہیں۔ اس کام کے عوض وہ گاہکوں کے معاوضے میں سے 10 فیصد کمیشن حاصل کرتے ہیں۔ سلطانے اس کے ساتھ ساتھ مقامی پولیس کے ایک متحرک ٹاؤٹ کا کردار بھی ادا کرتا ہے اور تھانے کے کاموں میں سے بھی سائلوں سے پیسہ بٹورتا ہے۔ وہ اپنے کوٹھی خانے سے پولیس والوں کو بھی لڑکیاں سپلائی کرتا ہے اور اس کا دعویٰ ہے کہ پولیس کبھی اس کے کوٹھی خانے پر چھاپہ نہیں مار سکتی۔

سلطانے کے کوٹھی خانے پر زیادہ تر ایک خاص ادارے کے ملازمین اپنی جنسی پیاس بجھانے آتے ہیں جن کو یہاں خصوصی مراعات دی جاتی ہیں۔ سلطانے کے دیگر گاہکوں میں پولیس والے، عام دیہاڑی دار مزدور اور سوں، ٹرکوں کے ڈرائیور اور کنڈیکٹر بھی شامل ہیں۔ جو معمولی رقم دیکر تسکین حاصل کرتے ہیں۔

سلطانے کے اڈے پر کام کرنے والی ایک عورت نے بتایا کہ اس کا خاوند نشئی ہے جبکہ اس کے سات بچے ہیں۔ ان بچوں کی کفالت کرنے والا کوئی نہیں۔ اس نے کوئی باعزت نوکری تلاش کرنے کی بہت کوشش کی لیکن اس کو کامیابی نہ ہوئی، اس لئے اس نے جسم فروشی کا دھندہ شروع کر دیا۔ اب اس کو روزانہ اس کوٹھی خانے سے اڑھائی تین سو روپے حاصل ہو جاتے ہیں اور اس کے بچوں کا پیٹ آسانی سے پل رہا ہے۔ اس عورت کے بقول زیادہ تر لوگ ہم عورتوں کے ساتھ تشدد اور زیادتی سے پیش آتے ہیں اور کوئی ان کا ہاتھ

وکنے والا نہیں ہوتا۔ وہ اگر کسی گاہک کو اس کی بلاوجہ زیادتی سے روکنے کی کوشش کریں تو ان
و اپنی نوکری چلے جانے کا خوف ہوتا ہے اور وہ کبھی ایسا نہیں کر سکتیں کہ ان کی یہ نوکری ختم
ہو اور ان کے بچے بھوکے مر جائیں۔ اس عورت نے مزید بتایا کہ بعض اوقات ایسے لوگ بھی
ن کے پاس آتے ہیں، جن کی شکل وصورت دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی مذہبی جماعت
سے تعلق رکھتے ہیں لیکن عموماً یہ لوگ آدھی رات کے بعد کوٹھی خانے پر آتے ہیں اور ان کی
زیادہ تر کوشش ہوتی ہے کہ وہ برقع پہنا کر ہمیں اپنے ساتھ لے جائیں۔

اسی طرح کے ایک "تجربے" کے بارے میں اس نے مجھے بتایا کہ ایک بار اس کو ایک
مولوی صاحب اور ان کے مسلح ساتھی اپنی بڑی سی گاڑی میں بٹھا کر علامہ اقبال ٹاؤن میں لئے
جا رہے تھے کہ راستے میں پولیس کا ناکا لگا ہوا تھا۔ جب پولیس والوں نے ہماری گاڑی روکی تو
انہوں نے مجھے مکمل پردہ کر لینے کی ہدایت کی اور ساتھ ہی دھمکی دی کہ اگر میں نے کوئی الٹی
سیدھی بات پولیس والوں کو بتائی تو وہ یہیں پر مجھے گولی مار دیں گے اور میرے خاندان کو قتل
کر دیں گے۔ اس نے بتایا کہ جب پولیس نے مولوی صاحب سے میرے بارے میں پوچھا تو
انہوں نے فوراً کہہ دیا کہ میں ان کی بہن ہوں اور وہ مجھے میرے سسرال سے لے کر آ رہے ہیں
پولیس والوں نے مزید تحقیق نہ کی اور ہمیں جانے دیا۔ جب ہم مطلوبہ جگہ پر پہنچے تو مسلح
لوگوں نے مجھے ایک کمرے میں پہنچا دیا اور خود وہاں سے چلے گئے۔ مولوی صاحب ساری
رات میرا جسم نوچتے رہے اور ان کو ذرا بھی احساس نہ ہوا کہ انہوں نے گاڑی میں پولیس کو
میرے بارے میں کیا کہا تھا۔ میں نے ان کو گاڑی والی ان کی بات یاد کرائی تو انہوں نے مجھے
تھپڑ مارے اور کنجری کا لقب دیا۔

اس طرح کے لاتعداد حیران کن اور عبرتناک واقعات ان عورتوں کی یادداشتوں میں
محفوظ پڑے رہتے ہیں جنہیں وہ گاہے بگاہے سناتی رہتی ہیں اور لوگوں کے مصنوعی پن کا مذاق
اڑاتی ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو مذکورہ بالا واقعہ اس عورت کیلئے اہمیت رکھتا ہے لیکن مولوی
صاحب نے اس کو ذرا بھی اہمیت نہ دی اور جب ان کو احساس دلایا گیا تو انہوں نے حیوانیت کا
مظاہرہ کیا اور اس بے سہارا اور مجبور عورت پر تشدد کیا۔

سلطانے کا اڈہ پوری آب و تاب کے ساتھ گاہکوں کی "خدمت" کر رہا ہے اور اس کو کسی پولیس وغیرہ کا کوئی خوف نہیں۔ اس کو معلوم ہے کہ وہ نہ صرف دس ہزار روپے ماہوار پولیس افسران کی خدمت مین پیش کرتا ہے بلکہ ان کے ٹاؤٹ کے طور پر بھی ان کی فلاح و بہبود کیلئے سرگرم رہتا ہے۔ سلطانے کے اڈے پر کام کرنے والی عورتوں کا تعلق غریب گھرانوں سے ہے اور تمام عورتیں شادی شدہ ہیں۔ ان عورتوں کے خاوند یا تو نشئی ہیں یا پھر چھوٹا موٹا جرم کر کے زندگی گزارتے ہیں اور اپنے خاندان کے بارے میں ان کو کوئی فکر لاحق نہیں ہوتی۔

اکرم نامی دلال نے مجھے ایک واقعہ سنایا۔ اس نے کہا کہ گزشتہ سال سلطانے کے اڈے پر کام کرنے والی ایک عورت شدید بیمار ہونے کے بعد مر گئی۔ اس عورت کا خاوند نشہ کرتا تھا۔ جب وہ مر گئی تو اس کے خاوند نے سلطانے کے ڈیرے سے نشہ حاصل کرنا شروع کر دیا اور جب ایک دن سلطانے نے اس کو نشہ مفت میں دینے سے انکار کر دیا تو وہ اپنی بارہ سالہ بیٹی کو ساتھ لے آیا اور اس کو سلطانے کے حوالے کر دیا۔ سلطانے نے لڑکی کو اپنے اڈے پر رکھ لیا لیکن اس سے پیشہ نہ کرایا۔ یہ لڑکی تقریباً ایک ماہ تک اڈے پر رہی اور اس کا باپ اس کے عوض روزانہ نشہ کیلئے پیسے سلطانے سے لے جاتا رہا۔ آخر سلطانے کے اندر کا شیطان جاگا اور اس نے معصوم لڑکی کے کنوارپن کا سودا پچاس ہزار روپے میں ایک رئیس زادے کے ساتھ کیا اور اس کے باپ کو روزانہ نشے کیلئے پیسے دینے لگا۔ ایک دن اس لڑکی نے سلطانے کو منع کر دیا کہ وہ اس کے باپ کو کوئی پیسہ نہ دے گا اور سارے پیسے وہ خود حاصل کر کے اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی کفالت کرے گی۔ اب سلطانہ سارے پیسے اس کو دیتا ہے اور اس نے اپنے بہن بھائیوں کیلئے اور اپنے لئے ٹبی گلی میں 800 روپے کرائے پر ایک کمرہ حاصل کر لیا ہے۔

سلطانے کا اڈہ ان دنوں پیشہ ور عورتوں کے شدید رش کی زد میں ہے کیونکہ مہنگائی اور بے روزگاری نے بہت سے غریب گھرانوں کو اس کاروبار کی طرف موڑ دیا ہے۔ عورتیں بہت کم معاوضے پر جسم فروشی کرنے کو تیار ہیں اور ان کو کام کیلئے کہیں جگہ نہیں مل رہی۔

فیاض کا کوٹھی خانہ

نیواں چیت رام روڈ کے بالکل شروع میں پرانی وضع کے گھروں میں سب سے پہلا گھر فیاض نامی ایک سابق دلال کا ہے۔ فیاض نے ساری زندگی بازار شیخوپوریاں کے اڈوں کیلئے دلالی کی ہے لیکن اس نے تین سال پہلے دلالی چھوڑ کر نیواں چیت رام روڈ پر ایک گھر کرائے پر لیا اور اس میں کوٹھی خانہ کھول لیا۔ فیاض کے کوٹھی خانے کی خاصیت یہ ہے کہ یہاں پر چوبیس گھنٹے جسم فروشی کا دھندہ چلتا رہتا ہے لیکن وہی عورتیں یہاں دھندہ کرتی ہیں جن کے خاندانوں کو اس نے یہاں پناہ دے رکھی ہے۔

فیاض نے یہ گھر کرائے پر حاصل کیا اور اس کے بڑے بڑے کمروں میں پارٹیشن کر کے انہیں چھوٹے چھوٹے کمروں میں تبدیل کر لیا۔ پھر اس نے ان چھوٹے کمروں میں ہیرا منڈی اور اس کے گردونواح میں بسنے والی ٹکیائیوں کو اکٹھا کر کے انہیں ان کے خاندانوں سمیت یہاں پناہ دیدی۔ ٹکیائیاں جو چل پھر کر انتہائی معمولی داموں جسم فروشی کا دھندہ کرتی تھیں انہوں نے فیاض کے کوٹھی خانہ کو نعمت جانا اور یہاں اٹھ آئیں۔

اس کوٹھی خانے کا سارا انتظام خود فیاض سنبھالتا ہے۔ وہ ان کسبی عورتوں سے گھروں کا کرایہ وصول نہیں کرتا جبکہ تمام رہائشی پانی، بجلی اور گیس وغیرہ کا بل آپس میں تقسیم کر کے ادا کر دیتے ہیں۔ فیاض صرف اڈے پر آنے والوں کا حساب رکھتا ہے اس نے اس مقصد کیلئے باقاعدہ ایک منشی بھرتی کر رکھا ہے جو آنے جانے والوں اور ان سے ملنے والی رقم کا حساب رکھتا ہے۔ فیاض کا منشی روزانہ رات کو فیاض کو حساب دیتا ہے اور باقی رقم عورتوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ فیاض کے کوٹھی خانے پر کام کرنے والی عورتوں کو ان کی کمائی کا نصف دیا جاتا ہے جبکہ باقی نصف فیاض کے حصے میں آتا ہے۔ فیاض کے منشی اقبال کے مطابق اس وقت ان کے کوٹھی خانے پر پندرہ عورتیں پیشہ کر رہی ہیں اور ان کو دس بڑے کمروں کو چھوٹا کر کے رہائش وغیرہ فراہم کی گئی ہے۔ دلال، عورتوں کے حصے میں سے 5 فیصد اور فیاض کے حصے میں سے بھی 5 فیصد کمیشن حاصل کرتے ہیں۔ اقبال نے بتایا کہ زیادہ تر دلال ان پیشہ ور

عورتوں کے خاوند اور بھائی ہیں جو نشہ کرتے ہیں اور سارا دن گاہک تلاش کرتے رہتے ہیں۔ منشی اقبال کے بقول جب ایک نشئی دلال نشے سے ٹوٹا ہوا ہوتا ہے تو وہ بہت محنت اور جانفشانی کے ساتھ کام کرتا ہے اور جب اس کو نشہ مل جاتا ہے تو وہ بھاؤ تاؤ کرنے والے گاہک کے ساتھ جھگڑے پر بھی اتر آتا ہے۔

فیاض کے کوٹھی خانے پر بعض اوقات پولیس چھاپہ مار لیتی ہے کیونکہ اس کوٹھی خانے سے پولیس کو باقاعدگی کے ساتھ بھتہ نہیں پہنچتا جب پولیس حکام کو معلوم ہوتا ہے کہ اس بار کوٹھی خانے سے بھتہ وصول نہیں ہوا تو وہ یاد دہانی کے طور پر یہاں چھاپہ مارتے ہیں اور کسبی عورتوں کو اٹھا کر تھانے لے جاتے ہیں۔ یہ عورتیں اور ان کا مالک فیاض ان کی گرفتاری کے بغیر بھتہ دینے کو تیار نہیں ہوتا کیونکہ جب یہ گرفتار ہو جاتی ہیں اور دونوں کا کاروبار رک جاتا ہے تو ان کو نقصان کا اندازہ ہوتا ہے اور دونوں دھڑے بھتہ دینے پر رضامند ہو جاتے ہیں۔

اقبال منشی نے مزید بتایا کہ پولیس والے ان کے اڈے سے عورتیں ساتھ نہیں لے جاتے اور نہ ہی اس اڈے پر عورتوں کیلئے رجوع کرتے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ ان اڈوں پر غریب اور بڑی حد تک کشش نہ رکھنے والی عورتیں ہیں۔ اسی لئے ان اڈوں پر آنے والوں کی اکثریت کے پاس بھی زیادہ پیسے نہیں ہوتے لیکن اگر یہ لوگ بھی نہ آئیں تو یقیناً یہ عورتیں بھوکی مر جائیں۔ اقبال اپنی تنخواہ نہیں بتاتا اور اس کو یقین ہے کہ اگر یہی حالات رہے تو پھر ایک دن گاہک ختم ہو جائیں گے اور پیشہ ور عورتیں محض ایک وقت کے کھانے یا سگریٹ کے ایک پیکٹ پر پیشہ کرنے کو مجبور ہو جائیں گی۔ اس کا خیال ہے کہ لوگوں کے پاس پیسہ نہیں ہے اور لوگوں کا گزارہ بہت مشکل سے ہو رہا ہے۔ اگر لوگ ان حالات میں بھی تھوڑے بہت پیسے اس عیاشی کیلئے نکال لیتے ہیں تو یہ ان کی ہمت ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی وجہ سے ہمارا اور کئی دوسرے غریب خاندانوں کا رزق لگا ہوا ہے۔

"اگر لوگ ان عورتوں کی طرف رجوع کرنا چھوڑ جائیں تو ہزاروں افراد بھوکے مر جائیں کیونکہ ان عورتوں اور دلالوں کے خاندانوں کا گزارہ تو محض ان پیسوں پر ہے جو لوگ اس عیاشی کیلئے خرچ کرتے ہیں۔ کوئی اس کے علاوہ چارہ کار نہیں کہ ان لوگوں کو زندہ

ا جا سکے۔ ایک مصیبت جو سر پر آن کھڑی ہوئی ہے وہ۔ ہیجڑے ہیں جو ان عورتوں سے کم
وں پر ہر طرح کی سہولت گاہک کو اس کے دروازے پر پہنچاتے ہیں۔ یہ ہیجڑے اب ہیرا
ی میں بھی آ گئے ہیں اور ان کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ ان کو کوئی روکنے والا
ں اور نہ ہی لوگوں کو کوئی یہ بتاتا ہے کہ یہ ہیجڑے تو بیماریوں کی چلتی پھرتی مشین
اور دوسرا ایک ہیجڑہ کیا کسی مرد کی پیاس مٹا سکتا ہے"۔ یہ گلے شکوے ایک طوائف کے
جس کا اپنا خاوند ایک ہیجڑے پر عاشق ہے اور وہ درزی کے کام سے جو کچھ کماتا ہے اس
ڑے پر خرچ کر دیتا ہے۔

بہت کوشش کے بعد فیاض سے ملاقات ہوئی تو شروع میں اس نے کوئی بات کرنے
انکار کر دیا اور بتایا کہ اس کو پہلے ہی صحافیوں نے بہت نقصان پہنچایا ہے اس کے مخالفین
فیوں کو پیسے دیکر اس کے پیچھے لگا دیتے ہیں اور صحافی اس کے بارے میں غلط ملط رپورٹیں
کر اس کی زندگی اجیرن کر دیتے ہیں۔ میں نے اس کو بتایا کہ میں کوئی صحافی نہیں ہوں بلکہ
تعلیم حاصل کر رہا ہوں اور میری تعلیم کا تقاضہ یہ ہے کہ میں آپ لوگوں کی زندگی اور
بار کے حوالے سے ایک سروے کروں اور اس سروے سے آپ لوگوں کو کوئی نقصان
ں پہنچے گا۔ اس جواب کے بعد اس نے مجھے بتایا کہ اس کو کوئی دوسرا کام نہیں آتا اس لئے اس
یہ اڈہ کھول لیا۔ اس کی ساری زندگی طوائفوں کے اڈوں پر دلالی کرتے ہوئے گزری
۔ دراصل فیاض معلومات کا ایک خزانہ ہے جو تمام طوائفوں کو، ان کے ملنے والوں کو اور
ں سابقہ حیثیت سے موجودہ حیثیت تک ہر چیز کو خوبی جانتا ہے لیکن اس کا موقف ہے کہ
س نے زبان کھولی تو پھر اس کی زندگی تباہ کر دی جائے گی اور بعید نہیں کہ اس کو خاندان
ت قتل کر دیا جائے۔

اس کا دعویٰ ہے کہ وہ اس ملک کے وزیر اعظم، جرنیل، سیاستدان، غرض ہر اس
، عہدیدار کو جانتا ہے اور اس کو معلوم ہے کہ ان لوگوں کا برسر اقتدار ہوتے ہوئے اور
ر سے باہر ہوتے ہوئے کن کن عورتوں کے ساتھ تعلق تھا۔ ان کے طور طریقے کیا
ور جب یہ لوگ برسر اقتدار آئے تو ان لوگوں نے طوائفوں اور ان کے دالوں کو کس

طرح نوازا۔

فیاض نے بتایا کہ وہ جس طریقے سے کاروبار کر رہا ہے اس سے اس کو کوئی فائدہ نہ پہنچ رہا بلکہ اس کو جو آمدن ملتی ہے اس سے بمشکل اس مکان کا کرایہ اور بل وغیرہ ادا ہو ہیں۔ اس نے بتایا کہ اگر وہ اڈہ بند کر دے تو کم از کم پندرہ بیس خاندان فاقوں کا ہو جائیں گے۔ آج جو لوگ ان اڈوں کو بند کرانے کا مطالبہ کرتے ہیں ان کے پاس خاندانوں کیلئے کیا ہے۔ کیا وہ ان خاندانوں کی کفالت کا ذمہ اپنے سر اٹھائیں گے، جن پاس اس کام کے سوا کوئی ہنر نہیں اور کوئی تعلیم نہیں۔ ان کو تو بس یہی کام آتا ہے اور لو ان سے یہ کام بھی چھیننا چاہتے ہیں۔ اگر کسی جسم فروش کو کوئی متبادل کاروبار دیا جائے جو کیلئے عزت کا باعث بھی بنے تو وہ ایک لمحہ کیلئے بھی جسم فروشی کا دھندہ نہ کرے۔ اس نے کہ میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ مجھے کوئی کاروبار نہ دیا جائے لیکن جو پندرہ خاندان اس اڈے پر جسم فروشی کا دھندہ کرتے ہیں ان کو متبادل کاروبار دینے کیلئے کوئی حکومت، تنظ مذہبی جماعت اعلان کرے، ابھی اس کا اعلان ختم نہیں ہوا ہوگا کہ میں اڈے کو بند کرد گا۔ اس نے کہا کہ مسئلہ یہ نہیں کہ ان عورتوں سے تسکین حاصل کرنے والے لوگ کد جائیں گے، مسئلہ یہ ہے کہ یہ عورتیں، ان کے بچے اور والدین کدھر جائیں گے کیا حکو یا کوئی ادارہ ان کو باعزت روزگار دے گا۔

فیاض کی ساری گفتگو سیاسی رنگ لئے ہوئے ہے۔ اس نے کہا کہ حکومت تو لوگ سے ان کا لگا ہوا روزگار چھین رہی ہے۔ بے روزگار لوگوں کو کہاں سے نیا روزگار فر کرے گی۔ یہ محض باتیں ہیں کہ لوگوں کو باعزت روزگار فراہم کیا جائے گا۔ غریب کی معاشرے میں پہلے ہی کوئی عزت نہیں اگر اس کو ایک بے عزت اور شرمناک کام کرنا ہے تو وہ اس لئے کرتا ہے کہ اس کام سے اس کے خاندان کا گزارہ ہوتا ہے۔ فیاض اس نقطے کا جواب میرے پاس تو کوئی نہیں، شاید کسی دوسرے کے پاس بھی اس کا جواب نہیں اور شاید کوئی حکومت بھی اس کا جواب نہیں دے سکتی۔

یہ جسم فروشی کا دھندہ، کیا غریبوں نے شروع کیا تھا۔ اس کی بنیاد ہمیشہ حکمرانوں

ایسے لوگوں نے ڈالی جو آسودہ حال تھے اور وہ اپنی دولت اور اقتدار کے ذریعے غیر عورتوں کا جسم حاصل کرنا چاہتے تھے۔ کون نہیں جانتا برصغیر میں یہ دھندہ نوابوں اور بادشاہوں نے پروان چڑھایا۔ ان لوگوں نے اپنی دولت اور طاقت کے بل بوتے پر عورتوں کو حاصل کرنے کی روایت شروع کی۔ اب ظاہر ہے جس کے پاس دولت اور طاقت نہیں وہ تو عورتوں کو حاصل نہیں کر سکے گا۔ دولت اور طاقت والوں نے ہمیشہ ایسے لوگوں کی عورتیں حاصل کیں جن کے پاس دونوں چیزیں نہیں تھیں۔ ایسا تو نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ ان لوگوں کی عورتیں حاصل کرتے جن کے پاس دولت بھی تھی اور طاقت بھی۔ کمزور کی عورت کو زبردستی یا دولت کے بل بوتے پر اپنے گھر میں ڈال لیا جاتا یا اس کو پیشہ کرنے پر مجبور کیا جاتا۔ اب ایسے لوگ کیا اس پیشے کو بند کریں گے جنہوں نے خود اس کو شروع کیا تھا؟

فیاض کا اڈہ شاید اسی "منطق" کے تحت چل رہا ہے لیکن اس کو ابھی تک روکا نہیں جا سکا۔ اس کو یقین ہے کہ جب تک تمام لوگوں کو یکساں حقوق اور دولت کمانے کے مواقع نہیں مل جاتے اس طرح کی سماجی نابرابریاں جاری رہیں گی اور جسم فروشی بھی ان کی ایک قسم ہے۔ فیاض کے بارے میں اس کے جاننے والے بتاتے ہیں کہ اس نے اسلامیہ کالج سول لائنز سے بی اے کیا اور اس کو غربت اور بے سفارش ہونے کے باعث نوکری نہ مل سکی۔ اس کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا۔ اس نے درزی کا کام سیکھا اور مزدوری کرنے لگا لیکن اس کا یہ کام بھی نہ چل سکا اور اس نے تنگ آکر ہیرا منڈی میں ایک مشہور طوائف کے اڈے پر دلالی کا کام شروع کر دیا۔ اس کو ایک ذہین اور سمجھدار دلال سمجھا جاتا رہا جو نہ صرف طوائفوں کیلئے گاہک کی تلاش کرتا تھا بلکہ طوائفوں کے حلقے میں اس کو ایک دانشور کی حیثیت بھی حاصل تھی۔ وہ ان کے لڑائی جھگڑے نمٹاتا اور ان کے تھانے کچہری میں پھنسے ہوئے کام کراتا۔ اس نے اپنی ساری جوانی ہیرا منڈی میں دلالی کرتے ہوئے گزار دی اور پھر یہاں چیت رام روڈ پر ایک مکان کرائے پر حاصل کر کے اس میں جسم فروشی کا اڈہ کھول لیا۔ فیاض کی ذاتی زندگی کے بارے میں لوگ اتنا جانتے ہیں کہ اس نے مشہور طوائف بانو بیگم کی بیٹی کے ساتھ شادی کی لیکن اس کے گھر میں اولاد پیدا نہیں ہوئی۔ یہ دونوں میاں بیوی

نیواں چیت رام روڈ کے ایک بوسیدہ مکان میں رہائش پذیر ہیں، اور اس کی بیوی ایک مکمل گھریلو خاتون ہے جو انتہائی درجے کی عبادت گزار ہے۔ فیاض اپنی بیوی کا نام بھی زبان پر نہیں لاتا اور اس کا کسی بھی صورت میں عام لوگوں میں ذکر نہیں کرتا۔ اس کے جاننے والوں کا خیال ہے کہ ان کی ازدواجی زندگی بڑی خوشگوار ہے اور دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کو بہت زیادہ چاہتے ہیں۔ فیاض کے منشی اقبال نے بتایا کہ استاد فیاض کسی کے ساتھ اونچی آواز میں بات نہیں کرتا اور کوشش کرتا ہے کہ اگر اس کے اختیار میں ہو تو لوگوں کی زیادہ سے زیادہ مدد کی جائے اور کمزور آدمی کے کام آیا جائے۔ یہ اس کی زندگی کا اصول ہے۔ اس کے بعد فیاض کے کوٹھی خانے پر کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

نازلی کا کوٹھی خانہ

35 سالہ نازلی نے مشہور طوائف آسیہ عرف اچھو بیگم کے مجرے خانے سے جسم فروشی کا آغاز کیا اور اپنی دوسری بہن کے ساتھ ملکر خلیجی ریاستوں میں ثقافتی طائفے لے جانے کا سلسلہ شروع کیا۔ نازلی کا والد ابراہیم کسی دور میں کارپوریشن میں سپرنٹنڈنٹ تھا۔ ابراہیم نے، جو کہ کوٹ خواجہ سعید کا رہنے والا تھا، 1963ء میں اپنی پہلی بیوی کو طلاق دیکر شادو کے اڈے پر مجرا کرنے والی طوائف رشیدی کے ساتھ شادی کرلی۔ شادی کے بعد وہ رشیدی کو لیکر چوبرجی کوارٹرز میں رہائش پذیر ہو گیا اور اس کے خاندان نے اس شادی کے باعث اس سے قطع تعلق کرلیا۔ ابراہیم دس سال تک مزید زندہ رہا اور ایک دن اس کو اس کی بیوی رشیدی کے ایک پرانے آشنا نے رشیدی کے ساتھ ملکر زہر دیدیا۔ زہر خورانی سے ابراہیم کی موت واقع ہو گئی۔ اس کیس میں رشیدی اور اس کے آشنا کو دس دس سال قید ہوئی۔ رشیدی کا آشنا جو جیل میں ہیروئن پینے لگا تھا، اس نے بعد میں رہائی حاصل کی۔ رشیدی کے جیل جانے کے بعد اس کی دونوں بیٹیوں کو آسیہ عرف اچھو بیگم نے اپنی سرپرستی میں لے لیا اور ان کو ہیرا منڈی لے آئی۔

آسیہ نے دونوں لڑکیوں کو میٹرک تک تعلیم دلائی اور ان کو جسم فروشی کی طرف

لائی۔ رشیدی قید کاٹ کر رہا ہوئی تو اس نے بھی آسیہ کے ہاں رہنا شروع کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد رشیدی نے اپنی بیٹیوں کے ساتھ ملکر آسیہ کے کوٹھی خانے پر بیٹھنا شروع کر دیا نازلی اور جمیلہ آسیہ کے کوٹھی خانے پر مجرا کرتیں اور اس کے بعد اپنے گاہکوں سے بھاری رقوم لیکر ان کو اپنے جسم پیش کرتیں۔

آسیہ کی موت کے بعد تینوں ماں بیٹیوں نے شاہی قلعے کی دیوار کے ساتھ واقع آبادی میں ایک گھر لیکر یہاں پر اڈہ کھول لیا۔ رشیدی نے کئی دوسری لڑکیوں کو بھی اس اڈے پر ملازمت دیدی اور خود اس اڈے کے معاملات کو سنبھالنے لگی۔ شروع میں رشیدی کے اس نئے اڈے کو کوئی خاص پذیرائی نہیں ملی اور عام ہیرا منڈی سے ہٹ کر واقع ہونے کی وجہ سے لوگوں کا اس طرف زیادہ رجحان نہ ہوا لیکن پھر بھی اکا دکا گاہکوں کی مدد سے اور رشیدی کے پرانے جاننے والوں کی وجہ سے ان کا اڈہ چلتا رہا۔ انہی دنوں رشیدی کی بڑی بیٹی جس کی خوبصورتی اور آواز کا بہت زیادہ چرچا تھا وہ راوی روڈ کے ایک تاجر کی رکھیل بن گئی۔ اس تاجر کا رشیدی کے گھر میں آنا جانا ہوا تو اس اڈے کے نصیب کھلنے لگے تاجر کے کئی دوست بھی اس کی وساطت سے اس اڈے پر آنے لگے۔

1990ء میں رشیدی دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئی تو اس کی چھوٹی بیٹی جمیلہ نے ایک محلے دار لڑکے کے ساتھ بھاگ کر شادی کر لی۔ رشیدی کی موت اور جمیلہ کی اس شادی نے اس اڈے کو ویران کر دیا۔ ادھر راوی روڈ کا تاجر بھی اپنی رکھیل سے دور دور رہنے لگا اور اس نے نازلی کو چھوڑ کر ٹی وی کی ایک مشہور اداکارہ، جو ٹی وی پر اداکاری کے ساتھ ساتھ جسم فروشی کا دھندہ بھی کرتی تھی، کے ساتھ تعلقات پیدا کر لئے اور نازلی کو چھوڑ دیا۔

نازلی نے اس تاجر کی بے وفائی کے بعد چند دن لاہور کے ایک فائیو سٹار ہوٹل میں جسم فروشی کرتے ہوئے گزارے۔ اس ہوٹل میں نازلی کی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جو اس کو اپنے ساتھ دوبئی لے گیا۔ نازلی دوبئی چلی گئی اور جمیلہ کو اس کے شوہر نے طلاق دیدی۔ جمیلہ نے دوبئی میں نازلی کے ساتھ رابطہ کیا تو اس نے اسے بھی دوبئی بلا لیا۔ دونوں بہنیں دوبئی میں ایک کوٹھی خانہ چلانے لگیں۔ انہوں نے دوبئی کے شہر العین میں اپنے

کوٹھی خانے کو وسعت دی اور ہیرا منڈی سے اپنے جاننے والی تین لڑکیاں بھی وہیں بلوالیں۔ ان کا کاروبار چمکنے لگا اور ان کے اڈے کی کمائی دیگر اڈوں سے بڑھ گئی۔

1993ء میں ان کے اڈے پر ایک پاکستانی نوجوان نے ایک مقامی باشندے کو قتل کر دیا۔ اس واقعہ کے بعد مقامی لوگوں میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی اور مقامی حکومت نے نازلی کے اڈے کو بند کر کے تمام عورتوں کو گرفتار کر لیا۔ قاتل کی گرفتاری ہوئی تو حکومت نے ان عورتوں کے بارے میں سوچا کہ ان کو قید کی سزا دیکر جیل بھیج دیا جائے۔ مقامی عدالت نے ان لڑکیوں کو ایک ایک سال کی قید سنائی اور جب ان کی قید ختم ہوئی تو ان کو جیل ہی سے ایئرپورٹ لے جایا گیا اور وہاں سے پاکستان آنے والی ایک پرواز میں سوار کرا دیا گیا۔

نازلی نے بتایا کہ انہوں نے جو کچھ کمایا تھا وہ دوبئی میں ہی رہ گیا اور ان کی ایک جاننے والی، جو دوبئی میں اپنا اڈہ چلا رہی تھی، نے اس کا سارا مال کھا لیا اور ان کو ایک روپیہ بھی دینے سے انکار کر دیا۔ دوبئی کی حکومت نے ان عورتوں پر پابندی لگا دی تھی کہ وہ زندگی بھر دوبئی نہیں آسکتیں اس لئے وہ دوبئی نہ جا سکتی تھیں۔ اس صورت میں ان کے نقصان کا ازالہ کرنے والا کون تھا، لہٰذا دونوں بہنوں نے صبر شکر کر کے لاہور میں دوبارہ قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا اور حیدری سٹریٹ میں ایک پرانا مکان کرائے پر لیکر کوٹھی خانہ کھول لیا۔ انہوں نے شروع میں انہی تین لڑکیوں کے ساتھ یہ کوٹھی خانہ شروع کیا جو ان کے ساتھ دوبئی میں قید ہوئی تھیں۔ پانچوں لڑکیاں پوری تندہی کے ساتھ کوٹھی خانے پر بیٹھنے لگیں اور جلد ہی انہوں نے اپنے اس اڈے کو پورے لاہور میں مقبول بنا دیا۔ لوگوں کی بڑی تعداد ان کی طرف متوجہ ہوئی اور ان کا کاروبار تیزی کے ساتھ ترقی کرنے لگا۔

اس کے بعد نازلی نے اس اڈے کو وسعت دی اور مکان کا اوپر والا پورشن بھی کرائے پر حاصل کر لیا، جب کاروبار مزید تیز ہوا تو انہوں نے پورا مکان ہی خرید لیا اور اس کو جدید سہولیات سے لیس کر دیا۔ دونوں بہنوں نے اس کوٹھی خانے کے پانچ کمروں میں اعلیٰ ترین بیڈ اور فرش پر قالین بچھا دیئے جبکہ گرمیوں میں گاہکوں کی سہولت کیلئے ایئرکنڈیشنر بھی لگا دیئے گئے۔ نازلی کا کوٹھی خانہ ہیرا منڈی کا واحد کوٹھی خانہ ہے جس پر ایئرکنڈیشنر لگائے گئے

۔اس نے خصوصی طور پر اس بات کی کوشش کی کہ عام کوٹھی خانوں کی طرف ہیرا منڈی
آنے والے گاہکوں کو اپنی طرف متوجہ نہ کیا جائے کیونکہ ان کو معلوم تھا کہ اس طرح ان کو
نرخ گرانے پڑیں گے اور گاہکوں کی بہتات کے باوجود کچھ بھی نہیں کما سکیں گی۔

نازلی نے اس کوٹھی خانے پر ٹیلی فون کی تین لائنیں حاصل کیں اور ایک پڑھی لکھی
ور عورت کو سیکرٹری اور آپریٹر کے طور پر ملازمت دیدی۔ ان کا رابطہ عموماً شہر کے
تین لوگوں کے ساتھ ہوتا جو ان کو یہاں سے ساتھ لے جانے کی بجائے ان کے جدید
ن گھر میں آرام کرتے اور انہیں بہت زیادہ معاوضہ دیتے۔

نازلی کا کوٹھی خانہ پوری قوت کے ساتھ کاروبار کرنے میں مصروف ہے اور اس کے
ں میں بڑے بڑے سیاستدانوں کے علاوہ جنوبی پنجاب سے تعلق رکھنے والے سیاستدان
ز زمیندار، بیوروکریٹس، تاجر اور دیگر امراء شامل ہیں۔ اس اڈے پر کوئی دلال نہیں کیونکہ
لو دلال کی ضرورت نہیں پڑتی۔ رابطے کیلئے ان کے پاس تین پی ٹی سی ایل فون اور لاتعداد
ئل فون ہیں جن کے باعث ان کو کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔

نازلی نے بتایا کہ اس نے اپنے اڈے کو جدید سہولیات سے لیس کیا ہے تاکہ لوگوں کو
طرف مائل کیا جا سکے۔ لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات تھی کہ طوائفیں عموماً اندھیرے
لندے گھروں میں رہتی ہیں اس لئے کوئی بھی ہیرا منڈی آکر اچھا معاوضہ دینے کو تیار
ں ہوتا تھا جبکہ ان کے گاہک فائیو سٹار ہوٹل چھوڑ کر ان کے اڈے پر آتے ہیں اور یہاں
لو ہر طرح سے سہولت فراہم کی جاتی ہے۔ نازلی اس سوال کا جواب نہیں دیتی کہ اس کا
ضہ کیا ہے اور وہ پولیس والوں کو بھتے کے طور پر کتنی رقم دیتی ہے۔ نازلی نے بتایا کہ وہ
ایک ٹی وی ڈرامہ سیریل بنانا چاہتی ہے جس میں کہانی یہ ہوگی کہ کس طرح لوگ خلیجی
لک میں جا کر جسم فروشی کا دھندہ کرتے ہیں اور وہ معزز پاکستانی جو اپنے آپ کو پاکستان میں
ی وغیرہ کا معزز تاجر کہلواتے ہیں، اصل میں وہ وہاں کیا کرتے ہیں اور ان کی آمدن کے ا
ذرائع کیا ہیں۔ نازلی کے عزائم بڑے خطرناک ہیں کیونکہ اب وہ کسی کی مرہون منت
، اس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ اس کے پاکستان مسلم لیگ کی اعلیٰ قیادت کے

ساتھ مکمل رابطے ہیں اور اس کا تعلق ایک اہم شخصیت کے ساتھ بھی رہا ہے۔ مذکو
شخصیت نے نازلی کو ایک جدید ماڈل کی گاڑی بھی لیکر دی جو اب بھی اس کے زیر استع
ہے۔ واضح رہے کہ نازلی نے اس دوران سیاست بلکہ عملی سیاست میں بھی حصہ لینے
کوشش کی اور مسلم لیگ حکومت کے خاتمے کے بعد اس نے ایک اعلیٰ شخصیت سے ملاقا
کر کے اپنے محبوب رہنما کیلئے آسانیاں پیدا کرنے کی درخواست کی لیکن اس بات کی ابھی
کسی حلقے کی طرف سے تصدیق یا تردید نہیں ہو سکی۔

نازلی اور جمیلہ ایک بار پھر اپنا بزنس چمکا رہی ہیں اور ان کے رابطوں میں کرکٹ کا
سٹار کھلاڑی بھی ہے۔ بعض حلقے یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ نازلی مذکورہ کرکٹر کے ذریعے
فکسنگ میں بھی ملوث ہے اور کراچی کے ایک بکی کے ساتھ اس نے شراکت کر رکھی۔
لیکن یہ باتیں مجھے محض زیب داستان محسوس ہوتی ہیں کیونکہ ایک جسم فروش عورت
کے بہت زیادہ تحفظات بھی ہوتے ہیں، وہ اس طرح متحرک نہیں ہو سکتی کیونکہ بالآخر
نے اپنا کاروبار بھی کرنا ہوتا ہے جو اس کا واحد لوڑھنا بچھونا ہوتا ہے۔

ایک مقامی باشندے کے بقول نازلی کے پاس بہت زیادہ پیسہ ہے اور اس کے تعلقا
دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس نے گلبرگ اور ڈیفنس میں قیمتی پلاٹ حاصل کئے ہیں اور وہ ڈیفنس
کے پلاٹ پر گھر بنانے کیلئے تیاریاں کر رہی ہے۔ اس شخص کے مطابق اگر اس کو وہ بیسی
حادثہ پیش نہ آتا تو شاید وہ اس وقت وہاں کی امیر ترین پاکستانی شخصیات میں سرفہرست
لیکن اس نے تھوڑے سے عرصے میں جس طرح پاکستان میں اپنا نیٹ ورک پھیلایا ہے اس
محسوس ہوتا ہے کہ وہ مزید ترقی اور دولت اکٹھی کرے گی۔

نازلی کے کوٹھی خانے پر کام کرنے والی عورتوں میں فلم کی دو چوٹی کی اداکارائیں
شامل ہیں۔ ان اداکاراؤں کی نازلی اپنے جاننے والوں میں بکنگ کراتی ہے اور ان کو بعض اوقا
اپنا گھر بھی پیش کرتی ہے۔ ذرائع کے مطابق اردو اور پنجابی فلموں کا ایک مشہور ہدایتکا
فلمساز بھی اس کے رابطوں میں ہے۔ نازلی اس فلمساز کے ساتھ مل کر فلم بنانے کا ارادہ
رکھتی ہے جبکہ مذکورہ فلمساز خود بھی اعلیٰ پائے کا سپلائر ہے وہ اس کام میں نازلی کی خدمات

حاصل کرتا ہے۔ نازلی نے اس فلمساز کی گزشتہ برس ریلیز ہونے والی فلم کی ایڈورٹائزمنٹ کیلئے ٹی وی کی ایک اہم شخصیت سے بھی رابطہ کیا تھا اور اس کی ایڈورٹائزمنٹ میں اس نے بھی رقم لگائی تھی۔ مذکورہ فلمساز کے ساتھ اس کے رابطوں کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ گزشتہ سال نازلی اور اس کی بہن کے ساتھ یورپی ممالک کی سیر کیلئے گیا لیکن پاکستان میں یہ خبر پھیلادی گئی کہ موصوف یورپ میں اپنی اگلی فلم کی لوکیشن دیکھنے کو گئے ہیں جبکہ نازلی، اس کی بہن جمیلہ، فلمساز اور ان کے دو مزید دوست بھی اس قافلے میں شامل تھے، انہوں نے روانگی سے پہلے ایک اہم شخصیت سے بھی ملاقات کی تھی۔ ذرائع کا خیال ہے کہ دراصل یہ ایک بزنس ٹرپ تھا اور دونوں بہنوں اور اس فلمساز نے اس دورے میں لاکھوں کمائے۔ ان کے ساتھ جانے والوں میں کراچی کے دو امیر ترین تاجر تھے جن کا براہ راست تعلق اس فلمساز کے ساتھ ہے۔

تنویری کا کوٹھی خانہ

تنویر بیگم عرف تنویری کے کوٹھی خانے کے بارے میں لاہور اور اسلام آباد کے سیاسی حلقوں میں سے کون واقف نہیں۔ تنویری کے کوٹھی خانے کی اصل وجہ شہرت پر ہونے والا کروڑوں روپے کا ہوا ہے اور تنویری کی دوست وہ ماڈرن لڑکیاں ہیں جو اس کے اشارے پر برسر اقتدار اور طاقتور شخصیات کے ساتھ تعلقات قائم کرتی ہیں، پھر ان کی مدد سے کام نکلوائے جاتے ہیں۔ تنویری نے اپنا اصل ہیڈ کوارٹر بازار شیخوپوریاں میں قائم کر رکھا ہے جبکہ یہ زیادہ تر اپنے گاہکوں کو ان کے گھروں یا فائیو سٹار ہوٹلوں میں مال سپلائی کرتی ہے۔ اس کے علاوہ تنویری نے ڈیفنس کے جدید ترین علاقے میں ایک عالیشان کوٹھی کرائے پر لے رکھی ہے جس کے باہر ایک سکیورٹی کمپنی کے دو مسلح ملازمین خصوصی طور پر بنائے گئے کیبن میں موجود رہتے ہیں۔

تنویری کا بھائی، جو ایک سیاسی جماعت کا سرگرم کارکن ہے لیکن اس نے کبھی انتخابات میں حصہ نہیں لیا اور نہ ہی کبھی اس نے ذاتی تشہیر کی ہے۔ پرائم منسٹر ہاؤس سے لیکر ایوان

صدر اور جی ایچ کیو تک رابطوں کیلئے مشہور ہے۔ اس کی دولت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر اس کو مخالف سیاستدانوں اور حکومتوں کا خوف نہ ہو تو یہ اپنے ذاتی جہاز اور دیگر سازوسامان رکھ سکتا ہے۔ آجکل یہ امریکہ میں ہے کیونکہ اس کا اصل دوست اور محسن نواز شریف مشکل ترین حالات کا شکار ہے اور اگر وہ اس دوران پاکستان آکر اپنے دیرینہ دوست کیلئے متحرک ہوگا تو اس کا نقصان نہ صرف اسے ہوگا بلکہ اس کی بہن اور دیگر اہل خانہ بھی متاثر ہوں گے۔ جو نامساعد سیاسی حالات کے باوجود کامیاب ترین حالات کا شکار ہے اور اگر وہ اس دوران پاکستان آکر اپنے دیرینہ دوست کیلئے متحرک ہوگا تو اس کا نقصان نہ صرف اسے ہوگا بلکہ اس کی بہن اور دیگر اہل خانہ بھی متاثر ہوں گے۔ جو نامساعد سیاسی حالات کے باوجود کامیاب ترین اور خوشگوار زندگی گزار رہے ہیں۔

تنویری کی داستان ایک طویل داستان ہے لیکن میں نے کوشش کی ہے کہ حتیٰ المقدور اختصار سے کام لوں اور صرف ان باتوں کو ہی احاطہ تحریر میں لاؤں جو اس کتاب کی ضرورت ہیں۔ اس کے علاوہ میں کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا لہٰذا میں نے جان بوجھ کر کرداروں کے نام تبدیل کر دیئے ہیں تاکہ بلاوجہ کی پریشانی سے دور رہ سکوں اور آسانی کے ساتھ کام کر سکوں۔

تنویری کا تعلق جنوبی پنجاب کے ایک بڑے شہر کے ساتھ ہے۔ اس کا والد ایک معروف زمیندار تھا اور اس نے تحریک پاکستان کی جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اس کو تحریک پاکستان کے حوالے سے اچھے لفظوں میں یاد کیا جاتا ہے۔ اس کی والدہ ایک معروف سماجی شخصیت تھیں اور انہوں نے لاہور اور بیرون ملک سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ تنویری نے خود بھی گریجویشن کی ہے جبکہ اس کا اکلوتا بھائی جس کے بارے میں مذکورہ بالا سطور میں تھوڑی سی بات کی گئی ہے، اس نے بیرون ملک سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر رکھی ہے اور اس نے لندن میں شادی کی ہے۔ لندن میں اس کا اپنا گھر ہے، جہاں ایک سیاسی جماعت کے کارکنوں کی اکثریت جاتی ہے جبکہ اس جماعت کی اعلیٰ قیادت بھی اکثر و بیشتر اس کی مہمان ہوتی ہے۔

تنویری نے دس سال پہلے فلمسازی کی طرف توجہ دی لیکن اس کی کوئی بھی فلم تیار نہ ہو سکی اور اس نے اس شعبے کو خیرباد کہہ دیا۔ فلمسازی سے الگ ہو کر اس نے لاہور کے علاقے گلبرگ میں ایک بیوٹی پارلر بنایا اور بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ یہ بیوٹی پارلر اصل میں اس کی ملکیت تھا لیکن اس نے اس کو ایک راز ہی رہنے دیا اور کسی کو بھی اس کے بارے میں نہ بتایا۔ تنویری نے جس عورت کو اس پارلر کا چارج دیا اس کو آج اکثر لوگ جانتے ہیں، جب بیوٹی پارلر کو بند کیا گیا تو تنویری کے رابطے ہر سو پھیل چکے تھے۔ اس نے شروع میں گلبرگ میں ایک کوٹھی کرائے پر لیکر ایک جدید ترین گیسٹ ہاؤس بنایا۔ گیسٹ ہاؤس بنانے کی اصل وجہ وہ رابطے تھے جن کے ذریعے وہ دولت کمانا چاہتی تھی۔ یہ گیسٹ ہاؤس دراصل جسم فروشی کا ایک باقاعدہ اڈہ تھا جہاں لوگوں کو جدید علاقوں میں رہنے والی پوش خاندانوں کی لڑکیاں سپلائی کی جاتی تھیں۔ گیسٹ ہاؤس نے توقع کے مطابق نتائج دیئے اور تنویری کے حوصلے بلند ہوتے گئے۔ اس نے اگلا قدم اٹھایا اور اسلام آباد میں ایک جدید گیسٹ ہاؤس خرید بنا دیا۔ اصل میں گیسٹ ہاؤس کی خدمات کے ذریعے تنویری اقتدار کے ایوانوں تک پہنچنا چاہتی تھی چنانچہ اس لئے اس نے لاہور کے بعد اسلام آباد کو منتخب کیا۔

تنویری کو اس سلسلے میں کامیابی نصیب ہوئی اور اس نے اسلام آباد میں رہائش اختیار کر لی۔ جب اس کے بھائی کے دوستوں کی حکومت آئی تو اس گیسٹ ہاؤس کا خوب سیاسی استعمال کیا گیا اور لاہور فلم انڈسٹری سے چن چن کر اداکاراؤں کو اس گیسٹ ہاؤس میں لایا گیا پھر ان کو مقتدر سیاستدانوں کے حوالے کر دیا گیا۔ تنویری ان اداکاراؤں کو معاوضہ اپنی جیب سے دیتی اور ان کی سپلائی کے بدلے میں اچھے سودے کرتی۔ ایک بار اس نے متحدہ عرب امارات کے ایک شیخ کو بھی ایک نوخیز اداکارہ فراہم کی تھی جس کے بدلے میں اس شیخ نے خوش ہو کر گیسٹ ہاؤس کی جگہ جو کرائے پر تھی وہ تنویری کو خرید کر دیدی۔ تنویری کی یہ زبردست کامیابی تھی۔

اس کے بعد تنویری متحدہ عرب امارات اور دیگر خلیجی ریاستوں کی طرف متوجہ ہوئی اور اس نے نئے پراجیکٹس پر کام شروع کیا۔ بعض ذرائع یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ تنویری خود

ایک اعلیٰ حکومتی عہدیدار کی رکھیل تھی اور وہ اس کو اس کام کے بدلے بہت زیادہ معاوضہ اور سہولیات فراہم کرتا تھا۔ متحدہ عرب امارات میں اس نے کیا کام کیا اس کے بارے میں کوئی اہم معلومات نہیں ملتیں بس لوگوں کی تیار کردہ داستانیں ہیں، جن میں سیاسی مخاصمت زیادہ نظر آتی ہے۔

12 اکتوبر 99ء کو تنویری کی قسمت نے پلٹا کھایا اور حکومت کے خاتمے کے ساتھ ہی اس کے کاروبار کو بھی شدید دھچکا لگا۔ تنویری نے اسلام آباد والا گیسٹ ہاؤس بند کر دیا اور اس کوٹھی کو کرائے پر چڑھا دیا۔ لاہور میں بھی اس نے گیسٹ ہاؤس کو بند کر دیا اور اس عمارت کو فروخت کر دیا۔ تین چار ماہ تک اس نے اپنی سرگرمیوں کو محدود رکھا اور پھر آہستہ آہستہ اس نے نئے سرے سے روابط کا جال پھیلانا شروع کیا۔ اس کے روابط کا سلسلہ آگے بڑھنے لگا اور اس نے بازار شیخوپوریاں میں ایک نیا مکان کرائے پر حاصل کیا اور اس کے نچلے پورشن میں اپنے ایک عزیز کو ٹھہرا دیا۔ ان لوگوں کے اس گھر میں رہائش اختیار کرنے کے انداز عام لوگوں کو یہی تاثر ملتا ہے کہ یہ ایک عام گھر ہے جس میں پردہ دار خواتین بھی رہائش پذیر ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ نچلے پورشن میں جن لوگوں کو ٹھہرایا گیا ہے دراصل وہ اوپر والے پورشن کے غلط استعمال کے خلاف ایک ڈھال کا کام کرتے ہیں اور اس گھر میں داخل ہونے والی گاڑی ایسے محسوس ہوتی ہے، جیسے نچلے پورشن والوں کا کوئی مہمان ہے، دراصل وہ مہمان نہیں ہوتا بلکہ عیاشی کی غرض سے آیا ہوا کوئی بااثر، طاقتور شخص یا اعلیٰ بیوروکریٹ ہوتا ہے جس کو تنویری اس کی مرضی کی لڑکی فراہم کرتی ہے اور پھر دونوں کو اس گھر کے اوپر والے پورشن میں آزادی کے ساتھ رہنے اور "آرام" کرنے کیلئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔

ذرائع کے مطابق حالات کے تھوڑے سے خراب رویئے کے بعد ایک بار پھر تنویری پر مہربانیوں کا دور شروع ہو چکا ہے اور اس نے اپنے رابطوں کے ذریعے اپنا سارا خوف اور ڈر ختم کر دیا ہے، وہ دوبارہ پوری قوت کے ساتھ سرگرم ہونے کے آخری مراحل میں ہے۔ تنویری نے بازار شیخوپوریاں میں جو دفتر بنا رکھا ہے اس کو اصل میں اس کا ہیڈ کوارٹر سمجھا جاتا ہے کیونکہ وہ ایک باپردہ خاتون کے طور پر اس علاقے میں جاتی ہے اور زیادہ تر وقت اسی گھر میں

گزارتی ہے۔اس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح نئی حکومت میں راہ تلاش کر رہی ہے اور جیسے ہی اس کو اس مقصد میں کامیابی حاصل ہو گئی وہ اپنے اصل روپ میں آجائے گی اور معاشرے میں اس کی عزت ایک دم بہت زیادہ بڑھ جائے گی۔

بازار شیخوپوریاں کے اس دفتر میں اس کے پاس تمام سہولیات ہیں اور وہ بعض اوقات اپنے "خاص" مہمانوں کو یہاں بھی لے آتی ہے جبکہ اگر مہمان زیادہ باوقار اور عزت دار ہوں تو وہ مال روڈ پر واقع ایک بڑے ہوٹل کے اعلیٰ عہدیدار کو فون کر کے تمام سہولیات کا بندوبست اسی ہوٹل میں کر دیتی ہے یوں مہمان کو اس کے گلبرگ والے گیسٹ ہاؤس (سابقہ) ڈیفنس والے گھر یا بازار شیخوپوریاں میں نہیں جانا پڑتا اور اس کو اس کا مطلوبہ مال اس کے رہائشی کمرے میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ان دنوں تنویری ایک اداکارہ کو بہت زیادہ استعمال کر رہی ہے جس نے پرانے پنجابی گانوں پر رقص کر کے شہرت حاصل کی ہے جبکہ اس سے پہلے وہ بھی فلموں میں کام کرتی رہی ہے لیکن اس کو اتنی شہرت نہ مل سکی تھی۔

مجھے ایک بااثر ذریعے نے بتایا کہ تنویری جیسی عورتوں پر ہاتھ ڈالنا کسی قدر مشکل ہوتا ہے کیونکہ جب یہ عورتیں انتقام کے جذبے کے تحت مقابلے پر آتی ہیں تو یہ چاروں طرف سے حملہ آور ہوتی ہیں اور اپنے رابطوں کو مخالف کی تذلیل کیلئے بھرپور انداز میں استعمال کرتی ہیں پھر ان کو روکنا بہت مشکل ہوتا ہے۔اس ذریعے نے مزید بتایا کہ یہ بات وفاق اور صوبے کا ہر ایوان جانتا ہے کہ اگر طاقتور شخص کیلئے تنویری متحرک ہو جائے تو وہ اس کی طاقت کو بکھیرنے کی اہلیت رکھتی ہے لیکن جب تنویری اپنا کام نکلوانا چاہتی ہے تو اس کو اس کیلئے کوئی مشکل نہیں ہوتی اور وہ آسانی کے ساتھ اپنا کام نکلوا لیتی ہے اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ تنویری کو اپنی طاقت اور اہلیت کا مکمل ادراک ہے۔

تنویری کے بارے میں اس کے ایک عزیز نے بتایا کہ اس کے پاس اتنی دولت ہے کہ اگر وہ تمام کاروبار اور دھندے چھوڑ دے تو بھی اس کی کئی نسلیں آرام کے ساتھ بیٹھ کر گزارہ کر سکتی ہیں۔اس کے بھائی کے پاس بھی اس سے زیادہ دولت ہے اور اس کو بھی مزید کام کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کے بقول تنویری کو جنون کی حد تک شوق ہے کہ اس کے

بر سر اقتدار لوگوں کے ساتھ روابط قائم ہوں اور وہ اس مقصد کیلئے بہت زیادہ آگے بھی نکل سکتی ہے۔

تنویری کا اصل اڈہ ان دنوں بازار شیخوپوریاں ہے جہاں وہ اپنا زیادہ وقت گزارتی ہے، اس کے خدمت گار اور نوکر اس کے ایک اشارے کے منتظر ہوتے ہیں، وہ اس کی خاطر اپنی جان بھی قربان کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ ان دنوں اس کا کاروبار صرف ڈیفنس کے علاقے میں چل رہا ہے لیکن وہ بھنگ وغیرہ پر لڑکیوں کو اسلام آباد، کراچی، کوئٹہ وغیرہ بھیجتی رہتی ہے۔ پاکستان کی ایک ٹاپ ماڈل گرل اس کے ساتھ بازار شیخوپوریاں میں رہائش پذیر ہے۔ یہ ماڈل گرل کبھی پرائم منسٹر ہاؤس اور دیگر اعلیٰ بیوروکریٹس کی محفلوں میں دیکھی جاتی تھی۔

تنویری کے بارے میں جاننے والے اس بات پر مکمل یقین رکھتے ہیں کہ وہ حالات کا مقابلہ کرنے کی مکمل صلاحیت رکھتی ہے۔ اس نے لاہور ڈیفنس میں جو کوٹھی حاصل کی ہے اس میں اس وقت بھی چار ماڈل گرلز ہمیشہ پیشہ کر رہی ہیں جبکہ اس کوٹھی میں کروڑوں روپے کا روزانہ جواء ہوتا ہے۔ گوالمنڈی کا ایک مشہور جواری اس اڈے پر جواء کراتا ہے اور اس کی ساری آمدن تنویری کو دیتا ہے۔ اس جوئے خانے کے بارے میں ایک پولیس اہلکار نے بتایا کہ یہاں جب ان کا آئی جی جواء کھیلنے آئے گا تو پھر اس پر کون چھاپہ مار سکتا ہے۔ جیتے ہوئے جواریوں کی خدمت کیلئے جن ماڈل گرلز کی خدمات حاصل کی گئی ہیں وہ دن رات اس کوٹھی میں رہتی ہیں جبکہ ان کو کہیں آنے جانے کیلئے جو گاڑی دی گئی ہے اس کی قیمت 50 لاکھ روپے سے زیادہ ہے۔

ذرائع کا خیال ہے کہ جلد ہی تنویری کا اڈہ گلبرگ میں بھی کام شروع کر دے گا کیونکہ گلبرگ میں اس نے ایک جدید کوٹھی کرائے پر بھی حاصل کی ہے۔ اس کوٹھی میں ایک جدید سوئمنگ پول بھی بنایا گیا ہے۔ اخباری دنیا کا ایک بڑا نام بھی تنویری کا خاص گاہک ہے اور اس کے اخبار میں تنویری کی منظور نظر ماڈل گرلز کو خصوصی طور پر شائع کیا جاتا ہے تاکہ ان کی مانگ میں اضافہ ہو۔ بدلے میں تنویری انہی ماڈل گرلز میں سے کسی ایک کو مذکورہ شخص کے پاس بھیج دیتی ہے تاکہ کسی دوسری ماڈل کی ماڈلنگ بھی شائع کروائی جا سکے۔ تنویری

کی شخصیت، اس کے کارناموں اور اس کے کاروبار کو تفصیل کے ساتھ لکھنے کیلئے الگ سے ایک کتاب کی ضرورت ہے۔ اس آرٹیکل میں کوشش کی گئی ہے کہ اس کی زندگی اور اس کے کارناموں کی محض چند جھلکیاں قارئین کے سامنے لائی جائیں تاکہ وہ اندازہ کر سکیں کہ پاکستان میں کیسے کیسے کردار سرگرم عمل ہیں۔

جانی بیگم کا کوٹھی خانہ

جانی بیگم جس کا اصل نام کسی کو معلوم نہیں، اس کا کوٹھی خانہ بھی ہیرا منڈی کا مشہور کوٹھی خانہ ہے۔ جانی بیگم نے تقریباً دس سال پہلے نوگزے کی قبر کے بائیں ہاتھ مین بازار سے تھوڑا ہٹ کر ایک پرانا مکان خرید کر اس میں کوٹھی خانہ شروع کیا تھا۔ جانی بیگم کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ بہت زیادہ شراب نوشی کرتی ہے اور اس کے دوست اس کو "جانی واکر" کے نام سے بھی پکارتے ہیں۔ جانی بیگم ایک عمر رسیدہ عورت ہے جس نے اپنی پوری زندگی ہیرا منڈی میں پیشہ کرتے ہوئے گزار دی ہے۔ اس کو زیادہ تر طوائفیں استاد کا درجہ دیتی ہیں اور عام زندگی کے معاملات میں جانی بیگم سے ضرور مشورہ کرتی ہیں۔

جانی بیگم کے کوٹھی خانے پر اس وقت 12 لڑکیاں پیشہ کرتی ہیں۔ ان لڑکیوں میں سے اکثر ایسی ہیں جن کا تعلق ہیرا منڈی سے نہیں بلکہ وہ دوسرے شہروں سے جانی بیگم کے پاس یہ کام کرنے آتی ہیں۔ بیرون شہر سے تعلق رکھنے والی یہ لڑکیاں جانی کے اڈے پر ہی رہائش پذیر ہیں اور ان کے لواحقین ایک ماہ کے بعد آکر جانی بیگم سے ان کا معاوضہ لے کر چلے جاتے ہیں۔ جانی بیگم کے اس کوٹھی خانے پر آٹھ آٹھ گھنٹے کی دو شفٹیں صبح و شام چلتی ہیں اور اس کی پیشہ ور لڑکیوں کو اکثر لوگ اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔

جانی بیگم کے اڈے پر درمیانے درجے کی لڑکیاں کام کرتی ہیں ان کا معاوضہ 500 روپے سے لے کر 1000 روپے تک ہے اور اگر کوئی ان کو رات بھر کیلئے اپنے ڈیرے پر لے جانا چاہتا ہے تو اس سے جانی بیگم 3000 یا 3500 روپیہ طلب کرتی ہے۔ اگر کوئی زیادہ بحث و مباحثہ کرے تو 2500 روپے پر بھی گاہک کو واپس نہیں جانے دیتی۔ زیادہ تر لڑکیاں وہ ہیں

جن کی ماؤں یا رشتہ داروں کا تعلق جانی بیگم سے ہے کیونکہ وہ بغیر کسی حوالے یا سفارش کے کسی لڑکی کو اپنے کوٹھی خانے پر ملازمت نہیں دیتی اور اگر کبھی ایسا ہو جائے تو ایسی عورت کی ایک چھوٹی سی کوتاہی بھی اس کی نوکری کے خاتمے کیلئے کافی ہے۔

جانی بیگم کی داستان جو ہیرا منڈی میں ہر ایک کی زبان پر ہے کچھ اس طرح ہے کہ جانی بیگم نے گیارہ سال کی عمر میں دھندہ شروع کیا تھا۔ پرانے وقتوں کی طوائفوں میں سے جانی بیگم واحد طوائف ہے جس کو گانا یا ڈانس نہیں آتا تھا اور اس نے ساری زندگی یہ سیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی، اس نے ساری زندگی محض جسم فروشی کے سہارے گزار دی ہے۔ اس کی والدہ نور بیگم جو کہ بازار شیخوپوریاں کی مشہور طوائف تھی اس نے گیارہ سال کی عمر میں جانی بیگم کی نتھ کھلوائی تھی اور اس کو اڈے پر بٹھا دیا تھا۔ نور بیگم کے بارے میں مشہور تھا کہ اس نے مجرے کی آڑ میں سب سے زیادہ جسم فروشی کی کیونکہ اس کے اڈے پر اگر دس لڑکیاں ہوتیں تو ان میں سے صرف ایک یا دو لڑکیاں ایسی ہوتیں جن کو ناچ اور گانا بھی آتا، باقی سب لوگ صرف جسم فروشی سے وابستہ ہوتے۔

جانی کے ایک پرانے دوست خیر محمد نے جو اس وقت اونچے چیت رام روڈ پر رہائش پذیر ہیں، مجھے بتایا کہ شروع میں طوائفوں کی خواہش ہوتی تھی کہ اگر وہ مجرا کر رہی ہیں تو اپنے کو صرف مجرے تک محدود رہنے دیا جائے لیکن ایسا ہونا بعض اوقات بہت مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ ان کے گاہک ان کو صرف مجرے تک محدود نہیں رہنے دیتے اور ان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ مجرے کی حدود کراس کر کے جسم کی حدود میں داخل ہوں، اس صورت میں ان کی مانگ بڑھ جانے کا امکان زیادہ ہوتا ہے لیکن مجرے میں اس کی عزت نفس اتنی مجروح نہیں ہوتی جتنی اس کو محض ایک آدھ گھنٹے کیلئے کرنا پڑتی ہے۔ اس کو اس کی ساتھی عورتیں بھی ٹکیائی کہتی ہیں، اگر وہ جسم کے ذریعے کسی کو مطمئن نہ کر سکے تو یہ اس کی پیشہ ورانہ زندگی کے برے دنوں کی مثال بن کر رہ جاتی ہے کیونکہ جسم فروشی میں آپ کو بہت زیادہ نیچے گرنا پڑتا ہے اور پھر کوئی بھی اس دلدل سے نکالنے والا نہیں ہوتا۔

جانی نے اپنی ہیرا منڈی کی زندگی کے دوران تین شادیاں کی ہیں جو بری طرح ناکام

ئیں اور ہر بار جانی کو ہی بدنامی کا سامنا کرنا پڑا۔ ہر بار اس نے اپنے سے زیادہ عمر کے شخص
ے ساتھ شادی کی اور جب اس کے خاوند کو معلوم ہو جاتا کہ اس کے ہاں اولاد نہیں ہو سکتی
ہ فوراً اس سے جان چھڑانے کا سوچنے لگتا۔ جانی بیگم نے بتایا کہ گیارہ سال کی عمر میں اس
پنا جسم ایک بڑے رئیس زادے کو پیش کرنا پڑا۔ اس رئیس زادے نے جانی کی ماں کو اس کام
راضی کر لیا تھا: "شاید ماں کو ان دنوں کوئی شدید ضرورت تھی کہ اس نے پیسے آتے دیکھ کر
ے اس نوجوان کے حوالے کر دیا جس نے پہلی بار مجھے دیکھتے ہی حیرانگی کا تاثر دیا اور میری ماں
ے میری عمر پوچھی تھی۔ بہر حال اس رئیس زادے نے ماں کو پیشگی ادائیگی کی اور مجھے اپنے
اتھ لیکر اپنے ایک جاننے والے کے ہاں سانده میں چلا آیا۔ اس نے اس گھر کے مکینوں کو
یں بھیج دیا اور مجھے ایک کمرے میں لے گئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس نے تقریباً
ردستی مجھے اپنے ساتھ لٹایا تھا۔ پھر اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کو یہاں بیان کرنے کی
رورت نہیں، مجھے کچھ ہوش نہ رہا اور اس رئیس زادے نے گھبراہٹ میں میری ماں کو
ایا۔ وہ مجھے ایک لیڈی ڈاکٹر کے ہاں لے گئی جس نے، مجھے اچھی طرح یاد ہے، میری ماں کو
بہت زیادہ گالیاں دی تھیں اور میرا علاج کیا تھا"۔

جانی بیگم کے بقول: "بعد میں مجھے بتا دیا گیا کہ میں ایک ایسی پیچیدگی کا شکار ہو گئی ہوں
ہ اب میرے ہاں اولاد پیدا نہیں ہو سکتی۔ ماں نے تھوڑے سے پیسوں کی خاطر نہ صرف
یری زندگی کو خطرے میں ڈالا بلکہ مجھے اولاد جیسی نعمت سے بھی محروم کر دیا۔ میں نے ماں
کے ساتھ اس کے اڈے پر بیٹھنا شروع کر دیا اور آنکھیں بند کر کے ماں کے ساتھ پیشہ کرتی
ہی۔ ماں تجربہ کار تھی لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ کس طرح پیسے والے لوگوں کے ساتھ
معاملہ طے کرتے ہیں، پھر آہستہ آہستہ ہر چیز اور اس کی اصلیت معلوم ہونے لگی اور ماں کے با
رے میں بھی مجھے ہر چیز کا پتہ چل گیا"۔

جانی کی ماں کی وفات کے بعد اس نے خود اپنے اڈے کو سنبھالا اور نئی لڑکیوں کو بھرتی
کر کے جسم فروشی کا دھندہ شروع کیا۔ اس کے اڈے پر لوگوں کی بڑی تعداد اس کے لئے جاتی
تھی لیکن اس نے خود اپنے گاہکوں کی تعداد میں کمی کر دی اور دوسری لڑکیوں سے پیشہ کرانے

لگی۔ اس دوران جانی بیگم نے تین شادیاں کیں لیکن ان میں سے کوئی بھی شادی دو سال یا تین سال سے زیادہ نہیں چل سکی۔ اس کو ہمیشہ یہ سننا پڑتا کہ اس کے ہاں اولاد نہیں ہو سکتی، اس لئے اس کے ساتھ رہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ جانی نے تیسری شادی ایک فلمساز سے کی جس نے اپنی پوری زندگی میں صرف ایک فلم بنائی تھی لیکن اس کی یہ فلم بھی اس کو مزید فلمیں بنانے پر مائل نہ کر سکی کیونکہ اس کو اس فلم میں شدید نقصان کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ جانی نے بتایا: "اس فلمساز نے مجھے پسند کر لیا اور شادی کا پیغام بھجوا دیا جو میں نے تسلیم کر لیا اور اس کے ساتھ شادی کر لی۔ شروع میں اس کا رویہ بہت اچھا تھا۔ اس نے میرے ساتھ جھوٹ بولا تھا کہ وہ ابھی تک شادی کے بغیر رہ رہا ہے لیکن تقریباً تین ماہ بعد اس کی بیوی اوکاڑہ سے آئی اور اس کے ساتھ تین بچے بھی تھے"۔

جانی نے بتایا: اس نے اپنی پہلی بیوی کو اوکاڑہ میں ایک مکان کرائے پر لیکر دیا تھا اور خود لاہور میں رہتا تھا۔ اس کی بیوی نے لاہور پہنچ کر اعلان کر دیا کہ وہ اب اس سے علیحدہ نہیں رہے گی اور جہاں وہ رہے گا وہیں وہ بھی رہے گی۔ میرے شوہر کیلئے مشکل پیدا ہو گئی، انہوں نے مجھ سے معذرت کی کہ وہ مجھے اس پہلی شادی کی داستان سنائیں گے کہ کس طرح مجبوری کے عالم میں اس کو ایک ایسی عورت سے شادی کرنا پڑی جو اس کو بالکل پسند نہ تھی اور نہ ہی اس نے اس کو شادی سے پہلے دیکھا تھا۔ بہر حال اس کی پہلی بیوی نے عدالت میں علیحدگی کیلئے دعویٰ کر دیا تو فلمساز کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اصل میں فلمساز نے اس عورت سے اس کی جائیداد کی خاطر شادی کی تھی۔

"جب معلوم ہوا کہ اس شادی کی اصل وجہ کیا ہے تو فلمساز نے حیلے بہانے شروع کر دیئے اور اس پہلی بیوی کو راضی کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس بیوی نے یہ شرط عائد کی کہ پہلے وہ مجھے (جانی بیگم) کو طلاق دے اور پھر اس کے ساتھ چل کر اوکاڑہ میں رہے تو اگر اس کا چال چلن اس دوران ٹھیک ہوا تو وہ اس کے ساتھ رہے گی بصورت دیگر وہ طلاق حاصل کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ فلمساز صاحب جو اس سے پہلے فلم کے باعث شدید مالی خسارے کا شکار تھے انہوں نے شدید خفگی اور ندامت کے عالم میں مجھے طلاق دیدی اور لاہور چھوڑ کر

ساتھ بیوی کے ساتھ اوکاڑہ چلے گئے"۔

جانی بیگم نے اس شادی سے فراغت کے بعد اپنے اڈے پر بھرپور توجہ دی، ہیرا منڈی بھی مزید عورتیں اڈے پر بھرتی کیں اور پورے زور و شور کے ساتھ کوٹھی خانہ شروع ۔ اس کوٹھی خانے پر آٹھ آٹھ گھنٹے کی دو شفٹیں چلنے لگیں اور لوگوں کی بڑی تعداد نے کارخ کرنا شروع کر دیا۔ ایک دلال نے بتایا کہ اس اڈے پر دس دلال کام کرتے ہیں اور اچھی بچت ہو جاتی ہے کیونکہ ایسا شاید کبھی نہیں ہوا کہ ان کو گاہک نہ ملتے ہوں۔ لوگ منڈی میں جس کام کیلئے آتے ہیں وہ ان کو مل جاتا ہے، اس لئے اگر ہم کسی ایک شخص کو پر لے جانے میں کامیاب ہو گئے تو پھر ہماری ذیہاڑی تو پکی ہے۔

جانی بیگم باقاعدگی کے ساتھ پولیس کو بھتہ اور اپنے کاروبار کو تحفظ فراہم کرتی ہے۔ و معلوم ہے کہ اگر اس نے بھتہ نہ دیا تو پھر ایک دن پولیس اس کے اڈے پر چھاپہ مارے رنہ صرف اس کے گاہکوں کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا بلکہ اڈے پر کام کرنے والی ں کو بھی اس سے پریشانی ہو گی۔ اس نے اس حوالے سے کہا: "پولیس جب تمام سے بھتہ لیتی ہے تو مجھے بھتہ دیتے ہوئے کیا تکلیف ہو گی۔ میں بھی اپنے حصے کا بھتہ ں کو ہر ماہ دیتی ہوں اور اس کے بعد وہ مجھے کھلی اجازت دے دیتے ہیں"۔

جانی کے ڈیرے پر کام کرنے والی ایک طوائف نے بتایا کہ وہ گزشتہ چھ برسوں سے جانی کے اڈے پر کام کر رہی ہے اور آج تک اس کو کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور ں کبھی آج تک اس کو گاہک کے بغیر رہنا پڑا ہے۔ اس کے بقول لوگ جانی بیگم کی بہت زیادہ ت کرتے ہیں اور یہاں اس اڈے پر اگر جانی بیگم نہ ہو تو لوگ کبھی نہ آئیں اور وہ بھوکی ائیں۔ اس نے بتایا کہ جانی بیگم نے آج تک ان کے ساتھ کبھی زیادتی نہیں کی، اگر ہمیں ہ پیسوں کی ضرورت بھی پڑی ہے تو ہم نے یہ پیسے جانی بیگم سے لے لئے اور ان کی واپسی وقت ممکن ہوئی جب ہمارے پاس پیسے ہوئے، آج تک جانی بیگم نے کبھی تقاضہ نہیں کیا۔

جانی بیگم کے کوٹھی خانے پر کام کرنے والے ایک دلال نے بتایا کہ جانی بیگم کی زندگی ں کی خدمت کرتے گزر گئی ہے، اس کی کوئی اولاد نہیں اور نہ اس کا کوئی گھر بار ہے، جس

کیلئے یہ کچھ اکٹھا کرے گی۔ وہ سارے پیسے طوائفوں میں تقسیم کر دیتی ہے یا ان میں۔
زیادہ ضرورت مند ہو اس کو دے دیتی ہے تاکہ اس کی ضرورت پوری ہو سکے۔ جانی بیگم
ساری زندگی کرائے کے مکان میں گزار دی ہے اور آج تک اپنا مکان نہیں خریدا حالانکہ
کے پاس دولت کی کمی نہیں۔

جانی بیگم کے اڈے کی مشہوری کی خاص وجہ اس کے اڈے پر کام کرنے والی تین ا
عورتیں ہیں، جو گزشتہ سال اس کے پاس آئیں اور اس نے ان کو ایک معمولی انٹرویو کے
اپنے کوٹھی خانے پر نوکری دیدی۔ یہ افغان عورتیں کوئٹہ سے لاہور پہنچی تھیں اور پیشہ
چاہتی تھیں۔ جانی بیگم نے ان کو بہت سمجھایا کہ وہ اس کام میں نہ آئیں لیکن انہوں نے اپنی
نہ چھوڑی تو جانی بیگم نے باقاعدہ طور پر رسم کر کے ان کو اپنے کوٹھی خانے پر رکھ لیا۔ ر
طور پر حسین و جمیل یہ لڑکیاں عام گاہک کیلئے بہت کشش رکھتی ہیں اور جب وہ تھوڑی سی
خرچ کر کے ان افغان عورتوں کے ساتھ وقت گزار کر چلا جاتا ہے تو بار بار آنا چاہتا ہے ا
ان افغان عورتوں کا انداز خود سپردگی بہت پسند آتا ہے اور یہ اسے بار بار اس اڈے پر
کیلئے مجبور کرتا ہے۔

ایک دلال نے بتایا کہ یہ افغان عورتیں سارا دن نسوار کھاتی اور پیشہ کرتی رہتی
یہ بالکل تھکنے کا نام نہیں لیتیں جبکہ لوگ ان کے رنگ اور خوبصورتی کو دیکھ کر سب سے
ان کا انتخاب کرتے ہیں۔ اس دلال کے بقول خود یہ پٹھان عورتیں کچھ نہیں بولتیں اور ا
پر بھی ان کا زیادہ تر وقت خاموشی سے گزر جاتا ہے، جب ان کو مجبوراً بات کرنا پڑے
بات کرتی ہیں۔ ان کو اچھی طرح سے اردو بھی بولنا نہیں آتی اس لئے بھی یہ زیادہ تر خا
رہتی ہیں لیکن آپس میں گفتگو پشتو میں ہوتی ہے۔ یہ عورتیں اپنے کام سے فارغ ہو کر گھر
کاموں میں مصروف ہو جاتی ہیں چونکہ یہ غیر شادی شدہ ہیں، اس لئے جانی بیگم نے ا
ٹھہرنے کیلئے ادھر ہی رہائش دیدی ہے۔ آج تک ان کو کوئی مرد کبھی ملنے نہیں آیا جو ان
عزیز یا رشتہ دار کہہ سکے۔ یہ عورتیں یہاں سے کہیں بھی نہیں جاتیں نہ ان کو شاپنگ کا
ہے اور نہ گھر سے باہر کھانا کھانے کا شوق ہے۔ اس لئے یہ بالکل باہر نہیں نکلتیں۔ جانی بیگم

اص خیال رکھتی ہے اور کسی کو بھی ان کے ساتھ اونچی آواز میں بات نہیں کرنے دیتی۔

جانی بیگم کا کوٹھی خانہ کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے اور افغان عورتوں کی آمد کے بعد ،اڈے کے گاہکوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا ہے۔ ان افغان عورتوں کے علاوہ یہاں کام نے والی عورتیں بھی خاصی مطمئن دکھائی دیتی ہیں اور ان کو بظاہر کوئی مسئلہ یا پریشانی لوم نہیں ہوتی۔

لدہ کا کوٹھی خانہ

خالدہ ہیرا منڈی لاہور کی معروف خاندانی طوائف ہے۔ اس کی تین پشتیں ہیرا منڈی ں پیشہ کرتے ہوئے گزر چکی ہیں۔ بازار شیخوپوریاں کی رہنے والی خالدہ ان دنوں حیدری ریٹ میں رہائش پذیر ہے اور اس نے ایک تاجر کے ساتھ شادی کر رکھی ہے جبکہ اس کے ٹھی خانے پر 8 سے 10 لڑکیاں ہر وقت موجود رہتی ہیں، جو دلالوں کی مدد سے پیشہ کرتی ں۔ خالدہ کی ماں رانی اور رانی کی ماں برکتے اسی منڈی میں پیشہ کرتی رہی ہیں جبکہ انہوں نے لدہ کی طرح علیحدہ سے کوٹھی خانے نہیں شروع کئے تھے۔ ''اس وقت ان لوگوں کو گانے انے سے ہی اتنے پیسے مل جاتے تھے کہ کسی دوسرے دھندے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی نی اس لئے وہ جسم فروشی کی طرف کیوں آتے؟'' خالدہ نے میرے سوال، کہ اس کے اندان کے دیگر لوگ اس طرح پیشہ کیوں نہیں کرتے تھے، جس طرح وہ کر رہی ہے؟، کا واب مذکورہ بالا جملے کی صورت میں دیا۔

خالدہ نے بتایا کہ اس کی نانی اور والدہ بہت اچھی گانے والیاں تھیں۔ جب وہ چھوٹی سی تھی تو اس کو یاد ہے کہ روزانہ رات کو اس کی نانی گانا گاتی اور بڑے بڑے پروفیسر اور اعلیٰ ہدیداران ان کے کوٹھے پر گانا سننے آتے۔ خالدہ نے دعویٰ کیا کہ مشہور شاعر صوفی غلام صطفیٰ تبسم ان کے گھر گانا سننے آتے تھے اور ان کا اس کی والدہ کے ساتھ بہت زیادہ ملنا جلنا تھا۔ میری والدہ بھی شعر کہتی تھی اور اس کو کلاسیکی موسیقی کے ساتھ عشق تھا۔

خالدہ کے ڈیرے پر اس وقت تقریباً 10 لڑکیاں موجود ہیں، جو صبح 9 بجے سے لیکر

رات 12 بجے تک پیشہ کرتی ہیں۔ خالدہ خود پیشہ نہیں کرتی بلکہ اس نے ناصر نامی نوجوان کے ساتھ شادی کر رکھی ہے اور اس کے بچے علامہ اقبال ٹاؤن کے کشمیر بلاک رہائش پذیر ہیں۔ خالدہ بھی رات کو بچوں کے پاس چلی جاتی ہے لیکن دن کو روزانہ کوٹھے آجاتی ہے۔

خالدہ کے کوٹھی خانے کے بارے میں مشہور ہے کہ یہاں جو عورتیں کام کرتی ان میں زیادہ تر پڑھی لکھی عورتیں ہیں، جن کا تعلق اچھے گھرانوں سے ہے۔ مجھے ا مقامی طوائف نے بتایا کہ خالدہ چونکہ خود پڑھی لکھی ہے اور کالج میں پڑھتی تھی لہٰذا نے اپنی بعض سہیلیوں کو بھی اس کوٹھی خانہ پر اپنے ساتھ پیشہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ لڑکیاں پیشہ کرنے کے بعد اپنے گھروں میں چلی جاتی ہیں جبکہ خالدہ بھی اقبال ٹاؤن واقع اپنے گھر میں اپنے خاوند اور بچوں کے پاس چلی جاتی ہے۔

خالدہ نے یہ کوٹھی خانہ 1990ء کے آخر میں شروع کیا۔ اس سے پہلے خالدہ ایک اڈے پر مجرا اور مجرے کے بعد جسم فروشی کا دھندہ کرتی تھی۔ اس کے بارے میں ایک دلال نے بتایا کہ وہ ایک اچھی ڈانسر ہے اور اس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اپنے گاہکوں خوش کرنے میں بہت زیادہ مہارت رکھتی ہے۔

خالدہ نے بتایا کہ اس نے اپنی زندگی میں صرف گانا بجانا اور جسم فروشی سیکھی ہے۔ ہمیں اس کے علاوہ کوئی چیز نہیں سکھائی گئی۔ اس نے بتایا کہ وہ لاہور کے ایک معروف کالج میں پڑھتی رہی ہے جو جیل روڈ پر واقع ہے۔ اس نے بی۔اے کیا ہوا ہے لیکن اس کی والدہ نے بی۔اے کے بعد اس کی شادی نہیں کی بلکہ اس کو اپنے ساتھ کوٹھے پر بٹھالیا جہاں اس نے وہ سارے کام کئے جو یہاں پر بیٹھنے والی لڑکیوں کو کرنا ہوتے ہیں۔ اس نے البتہ اس بات سے انکار کر دیا کہ کس شخص نے اس کو بکارت سے محروم کیا تھا اور اس کا کنوارپن ختم کیا تھا۔ اس شخص اور اس واقع کے بارے میں خالدہ کچھ بھی نہیں بتاتی اور خاموشی کے ساتھ کوئی دوسرا سوال کرنے کیلئے کہتی ہے۔ اس نے مزید بتایا کہ اس کی والدہ اس کو شادی بھی نہ کرنے دیتی لیکن میں نے اس کے انتقال کے بعد شادی کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنی پسند کے ایک شخص سے

نادی کرلی۔

خالدہ نے بتایا کہ اس کے تین بچے ہیں، جن میں ایک لڑکا اور دو لڑکیاں شامل ہیں، وہ
ی خوشی اپنے خاوند کے ساتھ رہ رہی ہے۔ اس سوال پر، کہ اس کے خاوند نے اس پر
ھندے کے بارے میں پابندی کیوں نہیں لگائی، اس نے جواب دیا کہ اس کو معلوم ہے کہ
بں اب دھندہ خود نہیں کرتی ہوں بلکہ میں نے عورتیں ملازم رکھی ہیں جو خود دھندہ کرتی
ہیں میں صرف ان کی دیکھ بھال کرتی ہوں اور رات کو حساب کرتی ہوں تاکہ تمام لوگوں کو ان
ی کمائی مل سکے۔

خالدہ کے کوٹھی خانے پر آنے جانے والوں کا رش لگا رہتا ہے جبکہ اس نے اس کوٹھی
خانے کو نئے سرے سے تعمیر کرایا ہے اور ایک پرانے مکان کو جدید ترین مکان میں تبدیل
کر دیا ہے۔ اس نے اس گھر میں خصوصی طور پر 10 کمرے بنوائے ہیں، جن میں اٹیچ باتھ اور
دیگر سہولیات بھی مہیا کی گئی ہیں۔ خالدہ نے ان کمروں میں کولر لگائے اور قالین ڈلوائے ہیں۔
ان کمروں میں گاہکوں کیلئے خصوصی طور پر بیڈ بنوائے گئے ہیں جبکہ شوقین گاہکوں کو شراب
بھی پیش کی جاتی ہے۔

خالدہ کے بقول وہ پولیس کو مناسب رقم بھتے کے طور پر دیتی ہے اور اس کو بدلے میں
ہمیں تحفظ اور اجازت دی جاتی ہے، کہ ہم آزادی کے ساتھ اپنا پیشہ کر سکیں۔ اس نے مزید بتایا
کہ ہیرا منڈی میں آنے والوں کی تعداد دن بدن کم ہو رہی ہے کیونکہ لاہور کے دیگر علاقوں
میں بھی جسم فروشی کے اڈے کھل گئے ہیں اور لوگ ہیرا منڈی کی بجائے ان کم بدنام علاقوں
میں جانے کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ ان علاقوں میں طوائفوں نے لوگوں کو ہیرا منڈی سے
زیادہ سہولیات فراہم کی ہیں اور خصوصی طور پر بعض ایسے اڈے بھی ہیں جہاں سے پیشہ ور
عورتوں کو ان کے گاہکوں کے گھروں یا ٹھکانوں پر خود طوائفیں پہنچا دیتی ہیں۔ ان لوگوں کو ہم
سے زیادہ آزادی اور تحفظ حاصل ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے بعض مستقل گاہک بھی ان کی
طرف چلے گئے ہیں۔ لوگوں نے ہیرا منڈی میں آنا کم کر دیا ہے لہٰذا ایسے محسوس ہوتا ہے کہ
جیسے ایک دن ایسا آئے گا کہ لوگ ہیرا منڈی نہیں آئیں گے۔

خالدہ نے مزید بتایا کہ ہیرا منڈی میں بس ایسی طوائفیں ہی گئی ہیں جن کے پاس کرنے والی اچھی لڑکیاں نہیں ہیں۔ اب لوگ ہیرا منڈی میں گانا سننے نہیں آتے بلکہ گانے آڑ میں جسم فروش عورتوں کا سودا کرنے آتے ہیں۔ اس نے بتایا کہ نیواں چیت رام روڈ، ا چیت رام روڈ اور کوچہ شہباز کے مجرے خانوں میں ایک بھی ایسا نہیں جہاں کوئی شوق ساتھ گانا سننے آتا ہو اور گانا سننے کے بعد چلا جائے۔ اس نے بتایا کہ لوگ پہلے سارے بازار گھوم کر تمام مجرا خانوں پر اپنے پسند کی عورت تلاش کرتے ہیں اور پھر اس کے پاس جاتے وہ صاف لفظوں میں کہتے ہیں کہ گانے سننے کا ان کو کوئی شوق نہیں وہ محض جسم کیلئے آ ہیں۔ طوائفیں جو آج سے بیس سال پہلے اس طرح کی بات کرنے والے کا منہ توڑ دیتی تھیں اب اس طرح کا مطالبہ کرنے والے کو رحمت کا فرشتہ سمجھتی ہیں کیونکہ ان کو معلوم ہے اگر وہ گانا سنے گا تو محض ایک دو ہزار روپے نچھاور کرے گا لیکن اگر وہ رات گزارنا چاہتا ہے تو وہ اس کام کیلئے 3000 سے 5000 روپے ادا کرے گا اور ان پیسوں میں سے کچھ بھی سپر دارو (سازندوں) کو نہیں دینا پڑے گا۔

خالدہ کے بقول اس وقت جسم فروشی کے علاوہ کچھ نہیں چلتا۔ لوگ بھوکے بھیڑیوں کی طرح آتے ہیں اور عورتوں کو بھنبھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ لوگوں کے پاس پیسے کی کمی نہیں اور نہ ہی وہ ان معاملات پر پیسہ خرچ کرنے میں دیر کرتے ہیں۔ لوگوں کے پاس پیسہ ہے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا اور جس طرح وہ خرچ کرتے ہیں اس کی بھی مثال نہیں ملتی۔

خالدہ کے کوٹھی خانے پر کام کرنے والی لڑکیاں عموماً رات کو 300 سے 350 روپے تک لیکر گھر جاتی ہیں جبکہ ان کے دلال بھی اپنے نشے اور خوراک وغیرہ کیلئے دیہاڑی لگا لیتے ہیں۔ اس کوٹھے خانے پر سات دلال کام کرتے ہیں جو سارا دن ہیرا منڈی اور شاہی قلعہ سمیت بادشاہی مسجد دیکھنے آئے سیاحوں اور لاہور کے باہر سے آنے والے لوگوں میں سے اپنے گاہک تلاش کرتے ہیں۔ ان کو جو گاہک ملتا ہے یہ اس کو اپنے پیچھے پیچھے چلنے کا حکم دیتے ہیں اور اس کو حیدری سٹریٹ میں واقع خالدہ کے کوٹھی خانے پر لے آتے ہیں۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق خالدہ کا کوٹھی خانہ اس کو ڈیڑھ لاکھ روپیہ مہینے کا دیتا ہے

اور وہ پیسے الگ ہیں جو خالدہ یہاں سے لڑکیاں بک کر کے اپنے ساتھ لے جانے والوں سے حاصل کرتی ہے اگر عام حالات میں ایک بار بیٹھنے کا ریٹ 500 روپے ہو تو اس عورت کو کسی کے ساتھ جانے کیلئے ایک رات کے 2000 سے 2500 روپے درکار ہوتے ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ہر ہفتے یہ لڑکیاں کم از کم دو دو بار ضرور بکنگ پر جاتی ہیں بعض اوقات جب چھٹیاں ہوں تو ہفتے میں پانچ بار بھی ایک لڑکی کو بکنگ مل سکتی ہے۔

خالدہ کے خاوند کے بارے میں لوگوں کو صرف اتنا معلوم ہے کہ اس کا نام ناصر ہے کیونکہ خالدہ نے اپنا نام خالدہ پروین سے تبدیل کر کے خالدہ ناصر رکھ لیا ہے اور اس کا خاوند لوہے کا تاجر ہے۔ خالدہ سے شادی کے بعد اس کے خاوند نے اپنے لواحقین سے قطع تعلق کر لیا ہے اور خالدہ کے ساتھ خوشگوار زندگی گزار رہا ہے۔ خالدہ نے بھی اس بات کی تصدیق کی کہ وہ خوشگوار زندگی گزار رہی ہے اور اس کے بچے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

طاہرہ بیگم کا کوٹھی خانہ

طاہرہ بیگم کا کوٹھی خانہ بازار شیخوپوریاں میں موجود ہے۔ اس کوٹھے خانے پر اس وقت 6 لڑکیاں جسم فروشی کا دھندہ کر رہی ہیں جبکہ طاہرہ بیگم جو ماضی کی ایک مشہور طوائف ہے ہیروئن کا نشہ کرتی ہے اور نشہ کرنے کے بعد سارا دن بے سدھ پڑی رہتی ہے۔ اس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اگر نشے سے ٹوٹی ہوئی ہو تو پھر ایک خوراک کے عوض بھی رات گزارنے پر تیار ہو جاتی ہے۔ طاہرہ بیگم اس سے پہلے سرداراں بیگم کے اڈے پر کام کرتی تھی اور سرداراں بیگم کو اپنی ماں قرار دیتی تھی لیکن حقیقت میں یہ سرداراں بیگم کی بیٹی نہیں بلکہ سندھ کی ایک مشہور ترین سیاسی شخصیت کی بیٹی ہے۔ اس کے بارے میں یہ عام ہے کہ سندھ کی اس شخصیت نے طاہرہ کی ماں تسنیم کے ساتھ خفیہ شادی کی اور طاہرہ کی پیدائش پر اس شخصیت نے تسنیم کے ساتھ علیحدگی اختیار کر لی۔ اس کو آج تک باقاعدہ ماہوار خرچ دیا جاتا ہے۔

طاہرہ بیگم کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ اس کو سندھ کی اس مشہور شخصیت نے پیشہ نہ کرنے کی ہدایت کی اور دھمکی دی کہ اگر اس نے پیشہ جاری رکھا تو پھر اس کو گولی ماردی جائے گی۔ طاہرہ کو کہا گیا کہ وہ پیشہ اور ہیرا منڈی میں رہائش ترک کر کے کراچی منتقل ہو جائے جہاں اس کو اچھا گھر اور نوکر دیئے جائیں گے تاکہ وہ اپنی مرضی کے ساتھ زندگی گزار سکے لیکن اس نے اس آفر کو قبول نہ کیا اور لاہور کی ہیرا منڈی میں ہی رہنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے بعد میں جسم فروشی بھی شروع کر دی لیکن مذکورہ سیاسی شخصیت کی طرف سے اپنی دھمکی پر عملدرآمد نہ ہوا۔

طاہرہ نے جسم فروشی کا دھندہ ایک لڑکی کے ہمراہ شروع کیا لیکن جلد ہی اس کے اڈے پر دوسری لڑکیوں نے بھی آنا شروع کر دیا اور اس کا اڈہ چلنے لگا۔ طاہرہ بیگم کے اڈے کے بارے میں مشہور ہے کہ یہاں بیماری اور خانہ بدوش عورتیں بھی پیشہ کرتی ہیں اور ان کے معاوضے بہت کم ہیں۔ اس کے دلال 100 روپے سے 300 روپے تک گاہکوں کو بک کرتے ہیں اور یہ اڈہ چوبیس گھنٹے چلتا رہتا ہے کیونکہ زیادہ تر عورتیں اڈے پر بھی اپنے خاندانوں سمیت مقیم ہیں۔

ایک دلال نے بتایا کہ طاہرہ بیگم بہت زیادہ نشہ کرتی ہے اور ہر وقت نیم بے ہوشی کے عالم میں چارپائی پر چڑھی رہتی ہے۔ اس کے نشے کی وجہ سے بھی اس کے اڈے کو نقصان پہنچ رہا ہے اور لوگ اس کے پاس آنے سے کتراتے ہیں۔ طاہرہ کے ہاں کام کرنے والی ایک بیماری عورت نے بتایا کہ وہ بنگلہ دیش سے پاکستان آئی، اس کے خاوند کو پولیس نے گرفتار کر لیا، اس کو معلوم نہیں کہ اس کا خاوند اس وقت کس حال میں ہے اور کہاں ہے۔ اسے یہ بھی خدشہ ہے کہ اس کا خاوند مار دیا گیا ہے کیونکہ گزشتہ پانچ برسوں سے اس کو خاوند کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں۔

اس بیماری عورت کی ایک لڑکی ہے، جس کی عمر اس وقت دس سال ہے۔ اس سوال پر کہ کیا یہ لڑکی بھی پیشہ کرے گی؟ بیماری عورت نے بتایا کہ اسے کچھ نہیں معلوم کہ یہ کیا کرے گی۔ اگر میرا خاوند مل جاتا ہے تو پھر شاید میں یہ پیشہ چھوڑ دوں اور اگر اس کا کچھ پتہ

نہیں چلتا تو پھر کون اس خاندان کی کفالت کرے گا۔ اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ
میری لڑکی کو بھی یہی کام کرنا پڑے اور وہ بھی اس کی طرح کسمپرسی کی زندگی گزارنے پر
مجبور ہو جائے۔

جسم فروشی کی ابتداء

برصغیر میں باقاعدہ اور منظم انداز میں جسم فروشی کا دھندہ کب شروع ہوا، اس کے بارے میں وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا کیونکہ اس موضوع پر تحقیق کرنے والوں نے جو ریکارڈ پیش کیا ہے وہ بہت زیادہ متضاد کوائف رکھتا ہے بعض محقق اس پیشے کو قدیم عبادت گاہوں کے رسوم و رواج کے ساتھ جوڑتے ہیں اور رفتہ رفتہ اپنی تحقیق کو آگے بڑھاتے ہوئے اپنی حد تک منطقی نتیجہ نکالنے کی کوشش کرتے ہیں بعض ایسے قدیم مسودات بھی ملتے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ اس نوعیت کی تحقیق کرنے والوں کا اصل مقصد کسی خاص مذہب یا قوم کے خلاف مواد اکٹھا کرنا تھا اور انہوں نے بہت سے جزئیات فرض کرلی ہیں جیسا کہ خالصتاً ہندوؤں کے خلاف مواد اکٹھا کرنے والوں نے منظم اور باقاعدہ جسم فروشی کے دھندے کو دیوداسیوں کے ساتھ جوڑ دیا ہے، جو اب میں اس دھندے کے بارے میں جو تحقیق ملتی ہے وہ اس کو دین دار مسلم حکمرانوں کے ساتھ منتھی کرنے کی ایک بھرپور کوشش معلوم ہوتی ہے۔

اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ خصوصاً برصغیر میں یہ پیشہ منظم اس وقت ہو جب بیرونی حملہ آوروں کی یورشیں بڑھتی گئیں اور وہ بعض مقاصد کی خاطر ایک خاص مدت کیلئے کہیں رک جاتے۔ ان حملہ آوروں کے ہزاروں ساتھیوں کو وطن سے دوری کے باعث خصوصی طور پر جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ان میں جنس مخالف کا نایاب ہونا بھی شامل تھا۔ حملہ آور جہاں پڑاؤ کرتے ان کے قرب و جوار میں عارضی طور پر ایسی لاوارث اور دھتکاری ہوئی عورتیں جمع ہو جاتیں جو محض پیٹ کی آگ بجھانے کیلئے، ان کی جنسی آگ بجھانے پر رضامند ہوتیں۔ بچے کھچے کھانے کے عوض یہ فوجی ان عورتوں سے آسودگی حاصل کرتے۔ ایک حد تک اس روایت کو بھی باقاعدہ اور منظم جسم فروشی کا آغاز کہا جاسکتا ہے لیکن جسم فروشی کے دھندے نے آگے چل کر جو شکل اختیار کی وہ پہلے سے کہیں زیادہ مستحکم روایات اور قواعد و ضوابط کی حامل تھی۔

جدید تحقیق ہمیں بتاتی ہے کہ متحدہ ہندوستان میں سب سے پہلا باقاعدہ چکلہ یا جسم فروشی کا اڈہ مسلمان بادشاہ محمد تغلق کے عہد میں قائم ہوا۔ محمد تغلق نے اپنے دارالحکومت دولت آباد کے مضافات میں "طرب آباد" کے نام سے یہ چکلہ قائم کیا۔ طرب آباد کے اولین باسیوں میں زیادہ تر سابقہ جنگوں کی وجہ سے ہونے والی بیوائیں اور نچلی ذات سے تعلق رکھنے والی غیر مسلم عورتیں تھیں۔ ان عورتوں میں زیادہ تر تامل نسل اور دیگر نسل سے تعلق رکھنے والی غریب عورتیں شامل تھیں، جن کے سرپرست یا تو علاقائی یورشوں میں کام آئے یا پھر قابضین نے ان کو طویل المعیاد قید کی سزائیں دیں۔ طرب آباد اصل میں تغلق کے فوجیوں کی عشرت گاہ تھی، حملہ آور کا تعارف رکھنے والے فوجی ان عورتوں کے ساتھ زبردستی کا مظاہرہ کرتے اور اکثر عورتیں اپنے خواہشمند فوجیوں کی باہمی لڑائی میں ماری جاتیں۔ ان عورتوں کو اس طرح کی کشمکش میں اگر کوئی قتل کر دیتا تو اس فعل کو حکومت کوئی بڑا جرم تصور نہ کرتی اور قاتل کی حیثیت اور مقتولہ کے مقام کو مدنظر رکھ کر عموماً تھوڑے سے جرمانے کے عوض فیصلہ کر دیا جاتا اور جرمانے کی رقم ہمیشہ ریاست کو ملتی۔

دستیاب حقائق کی رو سے مؤرخ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حکیم سولن دنیا میں وہ پہلا شخص ہے جس نے خانہ بہ خانہ فحاشی کے سدباب کیلئے یونان میں سب سے پہلا چکلہ قائم کیا۔ حکیم سولن کا خیال تھا کہ اگر اس کام کیلئے کوئی باقاعدہ جگہ مقرر کر دی جائے تو جسم فروشی کے عادی قبائل چل پھر کر یہ دھندہ نہیں کریں گے لیکن حکیم سولن کو اپنے اس مقصد میں کامیابی نصیب نہ ہوئی کیونکہ خانہ بدوش قبائل صرف جسم فروشی کی آمدنی پر اکتفا نہیں کرتے تھے اور وہ اس کے ساتھ ساتھ چھوٹی موٹی چیزوں کی تجارت بھی کرتے تھے اور اپنے خاندانوں کو پالتے تھے۔ یہ خاندان ایک قلیل آمدنی کے حامل پیشے کیلئے ایک جگہ پابند ہو کر نہیں بیٹھ سکتے تھے۔

اس وقت یونانیوں پر جنسی غلبے کا یہ عالم تھا کہ سب سے پہلے اظہار عقیدت کیلئے جن دو انسانوں کے مجسمے تراشے گئے ان میں ایک فاعل (ہرموڈیس) اور دوسرا مفعول (اسٹیوگیٹن) تھا۔

بت پر یقین رکھنے والوں کا یہ عالم تھا کہ اس وقت کے یونان میں اگر کسی لڑکے کو اس کا چاہنے والا نہ ملتا تو وہ اپنے تئیں اتنی زیادہ ندامت اور شرم محسوس کرتا کہ اکثر اوقات خودکشی کو ترجیح دیتا۔ عورت کی نسبت نوخیز لڑکوں کو جنسی اختلاط کیلئے ترجیح دی جاتی۔ کئی محققوں کا خیال ہے کہ اس زمانے میں لڑکوں کے ساتھ شادی کا رواج "ضبطِ تولید" کی طرف پہلا قدم تھا خود سقراط نے اس فعل کو قابل تحسین قرار دیا حتیٰ کہ ارسطو نے لوگوں کو مشورہ دیا کہ وہ بیویاں ترک کر کے استلزد بالمثل اختیار کریں۔ واضح رہے کہ توریت میں ہم جنس پرستی کے بڑے مرکزی شہر کا نام سدوم بیان کیا گیا ہے۔ انگریزی لفظ SODOMY اسی سے مشتق ہے۔ چارلس نیپیئر نے جب سندھ فتح کیا تو اس وقت کراچی میں زنانہ جسم فروشی کے اڈوں کے علاوہ تیس (30) اڈے عصمت فروش لڑکوں کے تھے۔

برصغیر میں شاہی عمارتوں اور جسم فروش عورتوں کے کوٹھوں میں اکثر و بیشتر مکانی قرب رہا ہے۔ تمام چکلے، رنڈی خانے ملک یا صوبے کے دارالحکومت کے اس حصے سے ملحق ہوتے جہاں قلعہ ہوتا یا امراء وزراء وغیرہ کے محل۔

مغل بادشاہ جلال الدین اکبر نے آگرہ میں فتح پور سیکری کے پاس بطور خاص رنڈیوں کیلئے ایک وسیع علاقہ "شیطان پورہ" کے نام سے آباد کیا۔ اسی طرح دہلی میں چاندنی چوک اور قلعہ معلیٰ سے ملحق "چاوڑی بازار" تھا۔ اس علاقے میں درباری طوائفوں کا ایک ہجوم رہائش پذیر تھا۔ ان طوائفوں میں اکثریت ان کم سن لڑکیوں کی تھی جو ایام طفولیت میں کسی بادشاہ یا شہزادے کی "نظر کرم" کا شکار ہو گئیں۔

محل سراؤں میں چونکہ پرانی اور خاندانی طوائفوں کی پہلے سے بھرمار ہوتی تھی لہذا ایسی نوخیز اور زبردستی بکارت سے محروم کی جانی والی لڑکیوں کیلئے یہی راستہ باقی رہ جاتا تھا کہ وہ جسم فروشی کے اڈوں پر بیٹھ جائیں اس سے پہلے کہ سماج کی بے رخی اور نفرت کے باعث اچانک عود کر آنے والی غربت اور عسرت سے ان کے جسم متعدی بیماریوں میں مبتلا ہو کر گل سڑ جائیں، یہ انہیں سجاتی اور بیچتی رہیں۔ چکلوں میں ایسی عورتوں کی بھی بہت بڑی تعداد تھی جو ڈھلتی ہوئی عمر کے باعث جسم فروشی کے قابل نہ تھیں

اور نئی آنے والیوں کی سرپرستی کیلئے تیار بیٹھی تھیں۔ جیسے ہی کوئی لڑکی کسی افتاد کے باعث ان چکلوں کا رخ کرتی ان بوڑھی عورتوں میں اس کی سپردگی حاصل کرنے کیلئے کڑا مقابلہ ہوتا۔ جو کامیاب ٹھہرتی وہ بڑی آن بان کے ساتھ ٹوخیز دوشیزہ کو ناچ گانے کی تربیت دیتی اور گاہکوں کو پھانسنے سے لے کر اپنا گرویدہ بنا لینے تک کے تمام حربوں کی تربیت دیتی۔ اس عارضی ملکیت کے باعث جس کو عموماً مستقل سمجھا جاتا تھا (جب تک طوائف کو اس کا کوئی چاہنے والا بھگا کر نہ لے جاتا) لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کرنے والیوں کو نائکہ کا نام دیا گیا۔

ہندوستان کی سماجی تاریخ پر تحقیق کرنے والے اس بات پر متفق ہیں کہ قدیم زمانے رنڈیوں اور قیدی عورتوں کے ماتھے پر ٹیکا بنایا جاتا تھا۔ بعض محقق یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ اس ٹیکے کی شکل عورت کی اندام نہانی سے متماثل بنائی جاتی جس کا مقصد ایک قسم کی تحقیر اور سماجی سطح پر شناخت تھا۔ لیکن قدیم ہندوستان کے بعض جنگلی قبائل میں بھی عورتوں کے ماتھے پر ٹیکا لگائے جانے کا سراغ ملا اور ان قبائل کے رسم و رواج کے مطابق اس ٹیکے کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ ٹیکے والی عورت شادی شدہ ہے۔ عموماً جنگلی قبائل یہ ٹیکا جانوروں کے خون کے ساتھ انگلی مس کر کے بناتے تھے۔ قدیم ہندوستان میں "مشترک زوجگی نظام" کے حامل ان قبائل میں ٹیکہ لگانے کا مقصد یہ بھی تھا کہ کنواری اور غیر کنواری عورتوں میں فرق واضح کیا جائے۔ غرض اس ٹیکے کی وجہ کوئی بھی رہی ہو اس سے انکار نہیں کہ اس کی شکل عورت کی اندام نہانی سے مشابہ بنائی گئی۔ بعد میں یہ ٹیکہ ہندو عورتوں میں شادی کی شناخت اور سہاگن کے ساتھ ساتھ مذہبی طور پر نیک شگون کے طور پر بھی رواج پانے لگا۔ البتہ تمام مورخ اور محقق اس بات سے متفق ہیں کہ قیدی عورتوں کو خصوصاً یہ ٹیکہ لگایا جاتا۔ اب بھی قیدی عورتوں کی صدیوں پرانی تصاویر اس دعوے کی تصدیق کرتی ہیں۔

قدیم ہندوستان کی یورشوں میں عموماً مفتوح قوموں اور قبائل کو اپنی عورتوں سے ہاتھ دھونا پڑتے اور حملہ آور ان قیدی عورتوں کے ساتھ نہایت وحشیانہ سلوک روا رکھتے۔ جب ان حملہ آوروں کو مال غنیمت اور مزید علاقوں کو فتح کر [illegible] کشت [illegible] گا

قدم پر اکساتی تو مقبوضہ عورتوں کا کوئی پرسان حال نہ رہتا۔ فوجی دل بھر جانے کے بعد انہیں روندتے ہوئے آگے بڑھ جاتے اور پسماندہ علاقوں میں تباہی کے بعد نئے ابھرنے والے سماج میں ان عورتوں کی کوئی گنجائش باقی نہ رہتی۔ بوڑھی عورتیں عبادت گاہوں اور درگاہوں پر آنے والوں کے رحم و کرم پر جسم اور پیٹ کا رشتہ برقرار رکھنے کی کوشش کرتیں جبکہ جوان عورتیں یہ باور کر لینے کے بعد کہ اب سماج میں ان کیلئے کوئی مناسب جگہ نہیں جسم فروشی کے موجود طریقوں پر اپنی زندگی کو ڈھال لیتیں۔ یوں نیم مہذب انداز میں اور خالصتاً زندگی پوری کرنے کی موہوم سی خواہش کے تحت جسم فروشی کا یہ مجبورانہ انداز اپنی جگہ بناتا رہا۔ رفتہ رفتہ سماج ایسی عورتوں کو ان کی مطلوبہ "جگہ" فراہم کرنے کا عادی ہو گیا اور نچلے طبقات بھی ادھر رجوع کرنے لگے۔ اپنی تمام تر ضروریات اور رعنائیوں کے ساتھ یہ پیشہ مغل عہد میں اپنے آپ کو منظم کرتا ہوا ملتا ہے۔ زنانہ آواز اور جسم سے حظ اٹھانے کا بھرپور دور مغل بادشاہوں کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ مغل جس علاقے کو اپنی راجدھانی بناتے وہاں پہلا کام چکلے کی آبادکاری ہوتا۔ عموماً شاہی قلعے سے ملحق آبادی کو اس طرح کی سرگرمیوں کا مرکز بنایا جاتا اور پیشہ ور عورتوں کو ان آبادیوں میں بسانے کے انتظامات کیے جاتے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بوقت ضرورت دستیابی میں کوئی سقم باقی نہ رہ جائے۔

قدیم تمدن پر تحقیق کرنے والے اس بات سے مکمل طور پر متفق ہیں کہ جسم فروشی کا دھندہ مذہب کے زیر سایہ پروان چڑھا۔ ابتداء میں شادی شدہ عورتوں کی نسبت آزاد اور جسم فروش عورتوں کو زیادہ معزز اور محترم سمجھا جاتا تھا۔ اس کی بڑی وجہ عبادت گاہوں میں ان عورتوں کی موجودگی تھی جہاں یہ مقدس عبادت میں معاونت کا فریضہ سرانجام دیتیں۔ عبادت گزار جو دور دراز کا سفر کر کے مقدس عبادت گاہوں تک پہنچتے انہیں عبادت اور آرام کیلئے یہ عورتیں سہولت بہم پہنچاتیں اور عبادت گزاروں کی جنسی تسکین کا سامان بھی فراہم کرتیں۔ جدید تمدن کی ابتداء کے ساتھ ہی مذہب اور زراعت کی شروعات نے عورت کے مرتبے کو بہت زیادہ بابرکت اور بلند قرار دیدیا۔ جوں جوں

ہب کی جزئیات کی تنظیم کا کام آگے بڑھتا رہا پیداوار کے ماخذ اجزاء کی عبادت کو زیادہ
ندس سمجھا جانے لگا۔ زمین کو دھرتی ماں کا درجہ دیا گیا اور اس کی پوجا ذوق شوق سے کی
انے لگی۔ آسمان اور سورج کو دیوتاؤں کا درجہ دیا گیا۔ آسمان سے بارش برستی جو فصلوں کو
یراب کرتی اور پیداوار کے عمل کو حتمی شکل دیتی۔ سورج فصلوں کو اپنی روشنی کے
ریعے زندگی دیتا اور یوں وہ بھی پیداوار کے اس عمل میں اپنا حصہ ڈالتا۔ اس زمانے کے
ماج میں یہ عقیدہ زور پکڑ گیا کہ زمین کے پیداواری عمل اور جنسی ملاپ جیسے پیداواری
مل میں بہت زیادہ قریبی تعلق ہے اور اگر دونوں میں برکت کا عنصر مطلوب ہو تو ایک
ی وقت اور ایک ہی موسم میں دونوں فریضے ساتھ ساتھ سر انجام دیئے جائیں تو نہ
صرف فصلیں شاندار ہوں گی بلکہ نسل انسانی بھی شاندار اور وافر ہوگی۔ ہل چلانا اور
جنسی ملاپ ایک جیسا ثمر آور خیال کیا جاتا۔ یہ عقیدہ راسخ ہو گیا کہ دھرتی ماں کے معبد
میں کثرت و تواتر سے جنسی ملاپ کیا جائے تو زمین کی بارآوری اور زرخیزی زور پکڑے گی
اس عمل کو زمین پر خوشحالی اور موسموں کی خوبصورتی کیلئے لازمی قرار دیدیا گیا۔ مشابہت
کے نقطہ نظر کے تحت عبادات اور کرامات روا رکھی جانے لگیں۔ اگر بارش مقصود ہوتی تو
زمین پر خوب پانی انڈیلا جاتا۔ دھرتی کے معبدوں میں منتخب حسین لڑکیاں رکھی جاتیں
جن کے ساتھ پجاری اور یاتری جنسی ملاپ کرتے۔ ان معبدوں میں اس مقدس عمل کیلئے
اکثر و بیشتر روساء اور شرفاء اپنی لڑکیاں یہاں چھوڑ جاتے اور اس عمل کو نیک ترین عمل
قرار دیا جاتا۔

مذہبی تہوار عموماً فصلوں کی بوائی یا برداشت یا غلہ اٹھانے کے موسم کی مناسبت سے
رکھے جاتے تھے ان تہواروں کے موقع پر خصوصی طور پر معبدوں کی زینت بننے والی
مقدس دیوداسیوں کو مدعو کیا جاتا اور ان کو شرفاء اور امراء کی صفوں میں جگہ دی جاتی۔ تمام
قدیم تہذیبوں میں مذہب سے وابستہ ایسی رسوم ملتی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ عورت
کو پیداوار، بڑھوتری، امن، خوشی اور شادمانی کے استعارے کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ اسی
طرح عشق و محبت کی دیویاں بھی زمین کے ساتھ بہت سی خصوصیات مشترک رکھتی

تھیں۔ تہوار جو عام طور پر فصلوں کی بوائی اور کٹائی کے موقع پر منائے جاتے ان میں دیوداسیوں کے ساتھ معبدوں میں جنسی ملاپ کو مقدس خیال کیا جاتا۔

غرضیکہ مذاہب قدیم میں عورت کو بار آوری اور بڑھوتری کے ساتھ منسوب کر کے اس کے جسم سے لطف اندوز ہونے کی اجتماعی مثالیں عام مل جاتی ہیں۔ ہیرو ڈوٹس ایک جگہ لکھتا ہے: "بابلیوں کی ایک رسم بڑی شرمناک ہے۔ ہر جوان عورت کو اپنی عمر میں ایک مرتبہ زہرہ (عشتار) کے مندر میں جا کر کسی نہ کسی یاتری سے مقاربت کرنی پڑتی ہے امراء کی عورتیں لونڈیوں کے جھرمٹ میں گاڑیوں میں بیٹھ کر آتی ہیں جن پر پردے چھٹے ہوتے ہیں اور مندر میں بیٹھ جاتی ہیں۔ اکثر عورتیں مندر میں اپنے سروں پر پھولوں کے ہار لپیٹ کر بیٹھتی ہیں۔ ہر وقت لوگوں کا ہجوم رہتا ہے اور آئندہ روز کثرت سے دکھائی دیتے ہیں۔ عورتوں کے درمیان رسیاں کھینچ کر نشاندہی کر دی جاتی ہے اور یاتری وہاں جا کر اپنے پسند کی عورت چن لیتے ہیں۔ جو عورت ایک بار مندر میں آجائے وہ واپس نہیں جا سکتی جب تک کوئی اجنبی اس کی طرف چاندی کا سکہ نہ پھینکے اور اس کے ساتھ خلوت میں نہ جائے۔ جب وہ سکہ پھینکتا ہے تو کہتا ہے: "دیوی تجھے برکت دے۔" چاندی کا سکہ خواہ کتنی ہی مالیت کا ہو عورت کو قبول کرنا پڑتا ہے کہ اس سے انکار کرنا خلاف قانون ہے جب یہ سکہ پھینک دیا جائے تو مقدس بن جاتا ہے۔ پہلا آدمی جو سکہ پھینکتا ہے عورت اس کے ساتھ خلوت میں چلی جاتی ہے۔ اس کے بعد کسی قیمت پر بھی اس کے ساتھ معاشقہ نہیں کیا جا سکتا۔ کشیدہ قامت خوبرو عورتیں جلد فارغ ہو جاتی ہیں جبکہ بد صورت عورتوں کو خاصی مدت تک انتظار کرنا پڑتا ہے۔"

پوری قدیم تاریخ اس طرح کے واقعات سے اٹی پڑی ہے جن میں مذہب کی رسم کے نام پر عورتوں کا جنسی طور پر استعمال کیا جاتا۔ قدیم یونان میں افروڈائیٹی کے معبدوں میں مقدس کسبیاں پجاریوں اور یاتروں کی جنسی پیاس بجھاتی رہتیں۔ قدیم ہندوستان کی عبادت گاہوں میں سینکڑوں دیوداسیاں قیام پذیر رہتیں جنہیں گانے بجانے اور ناچنے کی تعلیم دی جاتی تھی۔ پنڈت اور پجاری ان دیوداسیوں سے جنسی ملاپ کرتے۔ سومناتھ

کے مندر میں پانچ سو سے زائد دیوداسیاں موجود تھیں جو صبح و شام رقص کی محفلیں سجاتیں۔ اس مندر کیلئے بڑے بڑے امراء اور راجے مہاراجے اپنی بیٹیاں بھینٹ دیتے تھے۔ ایک انگریز صحافی ہورلے نکلسن جو آج سے تقریباً 100 سال پہلے ہندوستان کی سیاحت کیلئے آیا اس نے یہاں کے رسم و رواج سے متاثر ہو کر طویل عرصے تک یہاں رہنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے ہندوستان میں قیام کے دوران اپنے مشاہدات و تجربات کو "ورڈکٹ آن انڈیا" کے نام سے لکھا۔ ہورلے نکلسن کی اس تصنیف کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی۔ ہورلے نکلسن "ورڈکٹ آن انڈیا" میں لکھتے ہیں: "جنوبی ہند میں سری رنگم اور رچنا پلی کے مندروں میں آج بھی دیوداسیاں موجود ہیں اور آج بھی ان دیوداسیوں کے فرائض وہی ہیں جو آج سے پانچ سو سال پہلے تھے۔ یہ دیوداسیاں پنڈتوں اور پجاریوں کے رحم و کرم پر زندہ رہتی ہیں۔ ان میں لاتعداد ایسی بھی ہیں جن کے خاندان آج بھی ہندوستان پر حکومت کر رہے ہیں لیکن مندروں میں بچیوں کے چڑھاوے چڑھانے کی رسم کا ابھی تک خاتمہ نہیں ہو سکا۔"

ہندوستان کے معروف محقق جناب ڈی ڈی کوسمبی لکھتے ہیں کہ ہندوستان کے مذہب اور ثقافت میں لاتعداد ایسی چیزیں شامل کر دی گئی ہیں جن کا کسی مقدس روایت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ملتا لیکن ان چیزوں کو بعض پنڈتوں اور مہاراجوں نے اپنی خواہش کی بناء پر مذہب میں شامل کر دیا۔ تصحیح کا عمل چونکہ نہ ہونے کے برابر ہے اس لئے نئی چیزوں کو بھی عموماً قبول کر لیا جاتا اور ان کا درجہ دیگر عبادات جیسا قرار پاتا۔ دیوداسیاں اور ان کے جنسی فرائض کے بارے میں بھی یہی ابہام پایا جاتا ہے کہ ان کو مندروں میں پہلی بار کون لیکر آیا لیکن صورت یہ بن گئی ہے کہ اب ان کو مندروں سے نکالنا مشکل ہے اگر ان کو مندروں سے زبردستی یا کسی اصلاح کے پیش نظر نکالنے کی کوشش کی گئی تو پھر ان کا عام آبادی میں شامل ہو کر رہنا ناممکن ہو گا اور یہ اپنے پیشے کو جو کبھی مقدس تھا روزی روٹی کا وسیلہ بنائیں گی اور ان کی نسلوں میں یہ جذبہ موجود رہے گا کہ جسم فروشی ایک مقدس روایت سے منسلک ہے اور یہ کسی قسم کا گناہ یا برائی نہیں بلکہ اس طرح رزق

کمانا حلال اور قدرتی ہے۔

حقیقت میں یہی ہوا ہے جب اصلاح پسندوں نے جدید دنیا کے رجحانات سے متاثر ہو کر ساری دنیا میں اپنے اپنے مذاہب کی تطہیر کا کام شروع کیا تو نہایت خاموشی کے ساتھ انہوں نے ایسی تمام رسوم کو مذہب سے کاٹ پھینکا جن کے باعث جدید دنیا ان کے مذاہب کو تنقید کا نشانہ بناتی۔ یہی نہیں بلکہ بعض ایسے مذاہب نے بھی اپنے اندر موجود اور مختلف حیلے بہانوں سے جائز قرار دی گئی جسم فروشی کو ترک کر دیا اور اس کا حوالہ ماضی کی مبہم تاریخ سے لیا گیا کہ فلاں مقدس شخصیت اس فعل کو ناجائز قرار دیکر اس کی بندش کا اعلان فرما چکی تھی لیکن بدقسمتی سے اس فعل کو ختم نہ کیا جاسکا تھا۔ اب وقت آگیا ہے کہ اس سے جان چھڑائی جائے اور مذہب کو حقیقی بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ اس طرح کی اصلاح پسندی کا پہلا نشانہ بے سہارا اور مجبور عورتیں ہیں۔ ان کو تحفظ دینے کا سلسلہ بند کر دیا گیا اور انہیں موقعہ دیا گیا کہ وہ اپنا پیشہ جاری ضرور رکھ سکتی ہیں لیکن ان کو مذاہب اور عبادت گاہوں کی آڑ لینے سے روک دیا گیا۔ ان عورتوں نے عام زندگی میں اپنے پیشے کے ساتھ قدم رکھا اور شروع کی کچھ مشکلات کے بعد آزاد معاشروں میں اپنی ضرورت اور اہمیت کو منوالیا۔ وہی مذہب جو کبھی ان کا سرپرست تھا اور جس کی وجہ سے یہ بے گناہ اور معصوم عورتیں اس پیشے کی طرف زبردستی لائی گئیں، اب ان کا کھلا دشمن بن گیا۔ مذہب کی براہ راست تنقید کے باعث بعض اوقات ان کو بھاری نقصان کا سامنا بھی کرنا پڑا لیکن مذہب اپنی تمام تر شدت کے باوجود اس پیشے کو ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا اور نہ ہی ایسا ممکن نظر آتا ہے اگرچہ سماجی تطہیر کے نام پر ان کو زبردستی ختم کرنے کی کوششیں بھی کی گئیں لیکن دوسری طرف ان کی مانگ اور ضرورت میں اور بھی زیادہ اضافہ ہوا ہے اور ان کو باقی رکھنے کی خواہشمند قوموں نے مذہب کی کوششوں کو ابھی تک کامیاب نہیں ہونے دیا۔

جیسے ہی عیسائیت کی آمد کے ساتھ مندروں کو تباہ کر کے مذہب کی سرپرستی میں چلنے والی جسم فروشی کو بند کرنے کی کوشش کی گئی تو اس کام نے باقاعدہ کاروباری صورت

اختیار کرلی اور دوسری اجناس کی طرح جنس بھی سربازار فروخت ہونے لگی۔ برٹرنڈرسل ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"عیسائیت کی اشاعت سے پہلے قحبی مندروں تک محدود تھی جہاں اسے ایک مقدس پیشہ سمجھا جاتا تھا۔ عیسائی برسراقتدار آگئے تو انہوں نے مندروں کو منہدم کرادیا اور اس ادارے کا خاتمہ کردیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عصمت فروشی معاشرے میں ہر کہیں نفوذ کر گئی اور اسے خرید و فروخت کی جنس بنالیا گیا۔ جس سے قحبہ خانوں کے مالک بے انتہا نفع کمانے لگے۔ ان منظم قحبہ خانوں میں کسبی کی حیثیت محض ایک محنت کش کی تھی، نفع مالکوں کی جیب میں جاتا تھا۔ ہمارے زمانے کی آزاد کسبی کا وجود بعد میں ظاہر ہوا۔ ہندوستان میں ابھی تک مذہبی عصمت فروشی کا ادارہ پوری طرح ختم نہیں ہوا"۔

جیسا کہ شروع میں بتایا جاچکا ہے کہ حکیم سولن نے پہلا منظم چکلہ کھولا تھا۔ جب حکمران طبقوں نے دیکھا کہ عصمت فروشی ایک منافع بخش کاروبار ہے تو اسے پوری طرح منظم کر کے آمدنی کا وسیلہ بنالیا گیا۔

شروع میں یونان کے مختلف شہروں میں باقاعدہ جسم فروشی کے اڈے کھولے گئے اور ان اڈوں میں ماضی کی مذہبی عصمت فروش عورتوں کو رکھا گیا۔ جسم فروشی کے اڈے کا مالک عموماً علاقے کا حاکم یا اس کا قبیلہ ہوتا تھا۔ لوگوں کی بڑی تعداد ان اڈوں کی طرف رجوع کرتی اور حاصل ہونے والی آمدنی مالک کی جیب میں چلی جاتی۔ پیشہ ور عورتیں نامناسب سہولیات اور خوراک کی عدم دستیابی کے باعث بہت جلد بیمار پڑ جاتیں اور ان کا کوئی پرسان حال نہ ہوتا۔ جسم فروش عورتوں کی اکثریت تیس سے چالیس سال کی عمر میں موت سے ہمکنار ہو جاتی اور ان کی جگہ ان غوزمتوں کی اولاد لے لیتی۔ شروع کے ایام میں ان عورتوں کو حمل سے بچانے کا کوئی مؤثر طریقہ موجود نہ تھا جس کے باعث یہ عورتیں دھڑا دھڑ اولاد پیدا کرتیں اور وقت سے پہلے مر جاتیں۔ بعض روایات کے مطابق جسم فروشی کے اکثر اڈوں پر نابالغ لڑکیوں سے بھی پیشہ کرایا جاتا جن کی اکثریت اولاد کی پیدائش کے وقت کم عمری اور طبی سہولیات کی عدم موجودگی کے باعث ہلاک ہو جاتی۔

حکیم سولن نے ایتھنز کے سرکاری قحبہ خانہ کو منظم کر کے اس کے قواعد مرتب کئے۔ حکیم سولن نے پیشہ ور عورتوں کو مختلف طبقات میں تقسیم کر کے ان کا خرچ مقرر کیا۔ یہ پہلی بار تھی کہ پیشہ ور عورتوں کو ان کی عمر، نسل اور خوبصورتی کی بناء پر آمدنی میں سے حصہ دیا جانے لگا۔ اس سے پہلے عموماً یہ رواج تھا کہ جب کوئی شخص پیشہ ور عورتوں سے مستفید ہونے کیلئے جسم فروشی کے اڈے پر آتا تو اس سے داخل ہونے کے راستے پر ہی معاوضہ حاصل کر لیا جاتا لیکن اب یہ ہونے لگا تھا کہ وہ جس طبقے کی عورت کو پسند کرتا اڈے کا مالک اس تناسب سے رقم وصول کرتا اور پسند کی گئی عورت کو بھی اسی وقت ایک مناسب حصہ ادا کرتا۔

یونان کے جسم فروشی کے اڈوں پر سب سے اعلیٰ درجے کی عورتوں کو عام لوگوں سے پردہ کرایا جاتا اور اڈے کا مالک ان عورتوں کی رہائش اور کھانے کیلئے علیحدہ بندوبست کرتا اور اکثر اوقات ایسا بھی ہوتا کہ ان عورتوں کیلئے کیا گیا انتظام و انصرام اڈے کے مالک کی اپنی عورتوں کو بھی نصیب نہ ہوتا۔ قدیم یونان میں بعض ایسے جسم فروشی کے اڈے بھی ملتے ہیں جہاں جسم فروش عورتوں کی طبی ضروریات کیلئے حکماء بھی بھرتی کئے گئے۔ اس زمانے میں یا تو دربار کے ساتھ حکماء منسلک ہوتے تھے یا پھر قحبہ خانوں کے ساتھ ان کا معاہدہ چلتا تھا لیکن اسی زمانے میں یونان میں ایسی عورتوں کی بھی بھرمار تھی جو آزادانہ جسم فروشی کا دھندہ کرتی تھیں۔ ان عورتوں کا تعلق عموماً چھوٹے طبقات سے ہوتا جن کو یونانی اشرافیہ ذلیل سمجھتی۔ یہ عورتیں بازاروں میں چل پھر کر اپنا گاہک تلاش کرتیں اور اپنے اپنے خاندانوں کا پیٹ بھرتیں۔

اسی زمانے میں ایسی پیشہ ور عورتیں بھی تھیں جو بندرگاہوں پر اپنا جسم فروخت کرتیں۔ یونان میں انہیں "پورنائی" کا نام دیا گیا۔ ان عورتوں کی سماجی سطح پر بہت تذلیل کی جاتی۔ ان کا محلہ عام آبادی سے دور ہٹ کر ہوتا اور یہ عورتیں اپنے دروازوں پر دیوتا پرائے پس کے عضو تناسل سے مشابہ ایک نشان لٹکاتیں۔ یہ عورتیں گاہک کے انتظار میں اپنے دروازوں پر نیم برہنہ ہو کر بیٹھتیں۔ اس لئے ان عورتوں کو جمنائی بھی کہا جاتا جس کے لغوی

تی "ننگا" کے ہیں۔ یہ عورتیں اپنے گاہکوں کے ساتھ باقاعدہ معاہدہ کرتیں۔ معاہدے کی
ت ایک دن، ایک ہفتہ، ایک ماہ یا ایک سال بھی ہو سکتی تھی۔ لوگ ان عورتوں کو
ناہدے کے بعد اپنے ساتھ اپنی آبادیوں میں لے جاتے اور معاہدے کی مدت ختم ہوتے ہی
ں کو آزاد کر دیتے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ ایک عورت کو دو تین مرد بھی معاہدہ
کے لے جاتے اور اپنی تعداد کے مطابق اس عورت کے خاندان کو معاوضہ دیتے۔ اس
ناہدے کی دلچسپ شق یہ ہوتی تھی کہ معاہدے کی مدت کے دوران عورت کو حاملہ نہیں
یا جائے گا اور اگر عورت حاملہ ہو گئی اور اس کی تصدیق کسی طبیب یا حکیم نے کر دی تو پھر
ں وقت یہ معاہدہ ختم تصور کیا جائے گا اور اس عورت سے جو اولاد پیدا ہو گی اس کی کفالت
مرد کرے گا جس نے عورت کو حاملہ کیا تھا۔ بالکل اس روایت سے ملتا جلتا ایک معاہدہ
ت بعد میں آنے والے مذاہب میں بھی ملتا ہے جہاں مسافر مرد پیشہ ور عورتوں کے ساتھ
عاہدہ کرتے اور بدلے میں ان کو نقدی یا اجناس وغیرہ دیتے۔ یہ معاہدہ عموماً عورت اور مرد
کے مابین ہوتا اور اگر معاہدے کی مدت زیادہ طویل ہوتی تو اس موقع پر ایک یا دو گواہ بھی
قرر کئے جاتے جو معاہدے کی تفصیلات کو احاطہ تحریر میں لے آتے۔ اس معاہدے کے
عد مرد عموماً عورت کے گھر پر ٹھہرتا، بعض اوقات وہ عورت کو اپنے گھر بھی لے جاتا لیکن
یادہ تر عورت ہی میزبان ہوتی۔ معاہدے میں اس شق کو لازمی طور پر لکھا جاتا کہ اگر
عاہدے کے دوران عورت حاملہ ہو گئی تو پیدا ہونے والا بچہ مرد کی جائیداد کا وارث ہو گا
رچہ بعد میں اس رسم کو ختم کر دیا گیا لیکن نجی سطح پر یہ رسم آج بھی پوری طرح زندہ ہے
لبن آج کوئی بھی ریاست اس رسم کو جاری کرنے کی اجازت نہیں دیتی جبکہ چوری چھپے
گ اس پر عمل کرتے ہیں۔

قدیم یونان میں پورنائی کسبیاں اپنے گھروں کی دیواروں پر فحش تصاویر بنواتیں قدیم
منڈرات کی کھدائی کے بعد اس دعوے کی تصدیق ہوتی ہے۔ پورنائی عورتوں کے علاوہ
طوائفوں کا طبقہ آل ٹرائڈ بھی تھا۔ یہ طبقہ سماجی طور پر پورنائی طوائفوں سے بہتر تھا اور اس
و ان سے زیادہ بلند تصور کیا جاتا اور عزت دی جاتی۔ اس طبقہ کی طوائفیں ناچ گانے کے

ساتھ گاہکوں کا دل لبھاتیں اور ناچ گانا ختم کرنے کے بعد مہمان کے ساتھ خلوت میں چ
جاتیں۔ ان طوائفوں کے بازار پورنائی طوائفوں سے بہتر اور صاف ستھرے ہوتے۔ ا
بازاروں سے ملحق حکیم اپنا مطب بناتے جہاں بیمار طوائفوں اور ان کے خاندان کے دیگ
افراد کا علاج ہوتا۔ ان طوائفوں نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کیلئے الگ سکول کھول رکھ
تھے جہاں ان کے بچوں کو عام تعلیم کے علاوہ ناچ گانے اور گاہکوں کا دل لبھانے کیلئے گ
سکھائے جاتے تھے۔ آل ٹرائڈ طبقے کی طوائفیں زیادہ سے زیادہ لڑکیوں کی خواہش کرتیں او
اگر ان کے ہاں کوئی لڑکا پیدا ہو جاتا تو جان بوجھ کر اس کی صحت اور خوراک کا بہتر خیال
رکھا جاتا جس کے باعث لڑکے اکثر ہلاک ہو جاتے یا پھر اگر زندہ بچ جاتے تو نہایت لاغر او
ست ہوتے۔ اس طبقے کی طوائفیں جب بوڑھی ہو جاتی تو ان کے معاشرے میں ان ک
ضرورت اور بڑھ جاتی۔ بوڑھی طوائفوں کو ایک طرح سے سردار کا رتبہ دیا جاتا اور اس ک
مشوروں اور ہدایت کو اولیت دی جاتی۔

معروف مؤرخ علی عباس جلالپوری اپنی کتاب "جنسیاتی مطالعے" میں لکھتے ہیں کہ آل
ٹرائڈ طبقے سے بھی بالاتر طبقہ ہیٹرا نام کا تھا جس کے معانی "خاتون دوست" کے ہیں جو عا
طور پر شہری ہوتی تھیں اور اپنے گھروں میں دھندہ کرتی تھیں۔ ان کے علاوہ کوچہ گر
کسبیاں بھی تھیں جو چل پھر کر دھندہ کرتی تھیں۔ یہ کوچہ گرد طوائفیں اپنے جوتوں ک
تلوؤں پر یہ عبارت کھدوا لیتی تھیں: "میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔" جب یہ عورتیں راست
چلتیں تو یہ الفاظ ان کے پیچھے کندہ ہوتے جاتے اور تماش بین ان کے پیچھے چلے جاتے۔
طوائفوں کے اس طبقے نے یونانی معاشرے میں سب سے زیادہ ترقی کی اور ان کی نسل دن
بدن بڑھتی چلی گئی۔ رفتہ رفتہ پورے یونان میں ان طوائفوں کا غلبہ ہو گیا اور انہوں نے
اپنے دھندے کو جدید خطوط پر استوار کر لیا۔ پہلے پہل یہ اکیلی بازاروں اور گلیوں میں چل پھ
کر دھندہ کرتیں تھیں، بعد میں انہوں نے چھوٹے چھوٹے قافلوں کی شکل میں جسم فروشی
کا دھندہ شروع کیا۔ طوائفوں کے قافلے شہر شہر قریہ قریہ گھومتے اور تماش بینوں کو ان
کے گھروں میں تفریح بہم پہنچاتے۔ اس زمانے میں رواج یہ تھا کہ کوچہ گرد طوائفوں ک

قافلہ اپنے ساتھ ایک بگل بجانے والے کو بھی رکھتا جو قافلے سے دو تین میل آگے چلتا اور لوگوں کو قافلے کی آمد کی اطلاع دیتا جاتا۔ لوگوں کو معلوم ہو جاتا کہ طوائفوں کا قافلہ ان کی بستی میں آنے والا ہے لوگ اکٹھے ہو کر اس قافلے کا استقبال کرتے اور اپنی اپنی پسند کی طوائف کو چن لیتے۔ یہ طوائفیں اپنی اور اپنے مال اسباب کی حفاظت کیلئے باقاعدہ گھڑ سوار محافظ بھی ساتھ رکھتیں اور ان کو پرکشش معاوضہ دیتیں۔

قدیم یونان میں عورتیں عموماً پردے میں رہتیں اور مردوں کی مجالس میں شرکت نہ کرتیں ان عورتوں کا کام گھر کے معاملات سنبھالنا ہوتا تھا۔ اس وجہ سے وہ تعلیم سے بھی محروم رہ جاتیں۔ ان عورتوں کے برعکس ہیٹرا تعلیم یافتہ ہوتی تھیں اور علوم و فنون میں دسترس رکھتی تھیں۔ یہ عورتیں علمی مباحثوں میں حصہ لیتی اور اپنے استدلال سے بعض اوقات بڑے بڑے فلاسفروں کو لاجواب کر دیتیں۔ اسی طرح کی ایک ہیٹرا کو مشہور فلسفی سقراط اپنی استاد مانتا تھا۔

اگر ساری دنیا کی تہذیبوں میں طوائفوں کے کردار کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اکثریت عام لوگوں سے زیادہ حسین اور ذہین ہوتی تھیں۔ یہ عورتیں علم و فن میں خاص مہارت حاصل کرتیں اور بڑے بڑے اساتذہ ان سے فیض حاصل کرتے۔ یونان میں بعض ایسی طوائفیں بھی ہیں جن کے علم و فضل کے چرچے عام تھے اور وہ عام مناظروں میں بڑے بڑے علماء کو مات دیتی تھیں۔

قدیم یونان میں سقراط کی استاد کے علاوہ ایک طوائف آر کے نیسا کو افلاطون کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے اور یہ مشہور ہے کہ افلاطون آر کے نیسا کے علم و فضل سے مستفید ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے جسم سے بھی حظ اٹھاتا تھا۔ اسی طرح ایپقورس کے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ دنائی نام کی ایک طوائف پر فریفتہ تھا اور دنائی بھی اس کو دل و جان سے چاہتی تھیں۔ اسی طرح سوفوکلیز تھیورس نامی طوائف سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ یونان میں انہی دنوں ایک اور طوائف اسپاشا کا طوطی بولتا تھا جو فلسفہ و ادب میں کمال بصیرت رکھتی تھی اور پریکلز جیسا عالم فاضل شخص اس عورت کا عاشق تھا اور ان دونو

کے عشق کے چرچے عام تھے۔ ہیڑا طوائفوں میں تھمسٹونو سب سے مشہور طوائف ہے۔ اس طوائف کے سینکڑوں چاہنے والے تھے۔ یونان ہی میں نتھیلیا نامی طوائف کا بہت چرچہ تھا۔ اس کی بیٹی بھی بہت خوبصورت تھی اور یہ طوائف اپنی بیٹی کے ساتھ شب بسری کرنے والے سے ایک ہزار درہم وصول کرتی تھی۔ اسی طرح درجنوں ایسی مثالیں مل جاتی ہیں کہ طوائفوں نے بہت زیادہ شہرت حاصل کی یہ شہرت ان کی جوانی اور خوبصورتی کے ساتھ ساتھ ان کے فلسفہ وادب میں کمال رکھنے کی وجہ سے بھی تھی۔

قدیم عرب سماج میں باقاعدہ منظم طریقے سے جسم فروشی کی کوئی روایت نہیں ملتی ۔ہاں البتہ دیگر عام سماجوں کی طرح عام رہن سہن میں لوگوں کے آپسی جنسی تعلقات کا رجحان ملتا ہے جو بکھرے ہوئے سماج، گرم مرطوب آب و ہوا اور خوراک کے جنس افزاء ہونے کا بڑا سبب ہے۔ ان تعلقات کے افشاء کے بعد عموماً قدیم عرب طویل ترین جنگیں لڑتے اور نسلیں تباہ وبرباد ہوتی رہتیں۔ عموماً لڑکی کا خاندان جنسی تعلقات کے افشاء کو اپنی شدید توہین اور بے عزتی تصور کرتا اور لڑکے پر حملہ کر کے اسے قتل کرنے کی کوشش کرتا۔ بعض عرب قبائل لڑکی اور لڑکے کو زندہ گرفتار کر کے تمام لوگوں کی عبرت کیلئے دونوں کو اکٹھے قتل کر دیتے اور ان کے اجسام کو چوراہوں میں لٹکا دیا جاتا تاکہ آبادی اس برے فعل سے عبرت حاصل کرے۔

جیسے جیسے عرب سماج ترقی کرتا گیا اس کی روایتی سختی میں کمی واقع ہوتی گئی۔ ایک ایسا سماج جہاں عورت اور مرد کے خفیہ تعلقات کا افشاء ایک بھرپور خانہ جنگی شروع کرا سکتا تھا وہاں اب اس بات کا ادراک کیا جانے لگا کہ مخصوص حالات میں ایک اجنبی مرد کو ایک عورت کے وجود کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ شروع میں کمتر حیثیت کے مالک قبائل کی عورتوں نے معاوضہ کے عوض کسی اجنبی مرد کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کی روایت کا آغاز کیا۔ یہ عورتیں عموماً جنگلوں سے باہر نکلنے والے راستوں، شہروں میں داخل ہونے والے راستوں یا طویل صحرائی راستوں کے وسط میں ڈیرہ ڈال لیتی اور مسافر سکوں یا اجناس وغیرہ کے عوض ان کے ساتھ شب بسری کرتے۔ رفتہ رفتہ پورے عرب سماج نے اس

روایت کو قبول کر لیا اور اس بات کا خصوصی اہتمام کیا گیا کہ یہ فعل کرنے والی عورت کا نام اور خاندان پوشیدہ رکھا جائے۔ مسافروں کی بڑی تعداد یہ معاہدہ کرتی اور پیشہ ور عورتوں کو معاہدے کے مطابق معاوضہ ادا کیا جاتا۔ بعد میں اگرچہ اس رسم کو ایک طرح کی قانونی حیثیت دے دی گئی لیکن بعض دھڑوں کی طرف سے اس کی مخالفت ہوتی رہی کیونکہ وراثت کے معاملات کو سلجھانے کے لیے کوئی واضح طریقہ کار موجود نہ تھا۔ لوگوں کی اکثریت طویل مدت کے لیے جنسی تعلقات قائم کرنے کا معاہدہ کرتی اور معاہدہ تحریری نہ ہونے اور گواہوں کی عدم موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے معاہدے کی جزئیات سے روگردانی کرنے لگی۔ اس روگردانی کا نقصان ہمیشہ عورت کو ہوتا اور مرد حضرات اس کو حمل کی حالت میں چھوڑ کر کسی دوسری عورت کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے۔ حاملہ عورت بچے کی پیدائش سے بچنے کی کوشش کرتی اور اس کوشش میں اکثر اس کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑتے یا قبیلے سے قطع تعلق کرنا پڑتا اور حاملہ ہونے کی وجہ سے اس کو کوئی مرد پسند بھی نہ کرتا اس لئے اس کو فاقوں کا سامنا بھی کرنا پڑتا۔ اس معاہدے میں کسی بھی قسم کا مسئلہ پیدا ہو جانے کا نقصان ہمیشہ عورت کو اٹھانا پڑتا۔ اس لیے اس روایت کی مقبولیت میں کمی آنے لگی اور سماج کے مختلف دھڑوں کی مخالفت کے باعث عربوں نے اس رسم کو ختم کرنے کیلئے حکومت وقت سے مطالبہ کیا تو اس وقت کے حاکم نے اس رسم کو ختم کرنے کا اعلان کر دیا اور اس فعل کے مرتکب ہونے والوں کو کڑی سزائیں دینے کا بھی اعلان کیا۔

عرب میں اس رسم کے خاتمے کے بعد یہ قریبی ریاستوں میں عام ہونے لگی لیکن اس کے قواعد و ضوابط کو کسی بھی ریاست نے قانونی حیثیت دینے کی کوشش نہ کی۔ خلیجی ریاستوں کے علاوہ کئی دوسرے مسلم ممالک میں یہ روایت آج بھی چوری چھپے جاری ہے لیکن اس کی سختی سے حامی ریاستوں نے بھی اس کے ناقابل عمل ہونے کا اعتراف کرتے ہوئے اس پر پابندی عائد کر دی ہے۔ جبکہ لاتعداد لوگ آج بھی نجی طور پر اس کو برقرار رکھے ہوئے ہیں اور باقاعدہ پیشہ ور عورتوں کی ایک بڑی تعداد اس رسم کو اسلامی رسم قرار

دیتے ہوئے اس کا سہارا لیتی اور اپنا کاروبار آگے بڑھاتی ہے۔

ساری دنیا کی قدیم تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جسم فروشی ہر جگہ تواتر کے ساتھ رائج رہی ہے یہ الگ بحث ہے کہ ہر علاقے کے لوگوں کے مزاج اور حالات کے باعث اس کی مختلف شکلیں بنتی اور مٹتی رہی ہیں۔ کہیں پر اس کو ریاستوں نے قانونی شکل دی، کہیں قانونی شکل دیئے بغیر اس کو ایک سماجی رسم کے طور پر پھلنے پھولنے دیا گیا اور کہیں کسی خاص مذہب یا وہم کے زیر اثر اس پر پابندی عائد کر دی گئی۔ تمام قدیم تہذیبوں میں اس روایت نے ارتقاء کی مختلف منازل طے کی ہیں اور جیسے جیسے زمانہ اور سماج جدید ہوتا گیا اس پیشے میں بھی جدت کا عنصر آتا گیا۔ یا یوں کہئے کہ اس پیشے نے بدلتی ہوئی ضروریات کے مطابق خود کو ڈھالا ہے۔

اہل یونان کے ہاں پیشہ ور جسم فروش عورتوں سے تعلق رکھنا ایک تہذیبی اور ثقافتی مشغلہ قرار دیا جاتا رہا۔ یونان کے لوگ کسبیوں اور جسم فروش عورتوں کو پیار سے بلبل، لابیل، جگنو، گڑیا، شیرنی، چڑیا، مشعل اور اس جیسے نام دیتے تھے۔ یونان میں نوجوان تربیت کیلئے یا تو فلاسفر کے پاس جاتے تھے یا پھر کسبیوں کے پاس بیٹھتے تھے۔ یہ پیشہ ور عورتیں بھی فلسفیوں کو اپنا حریف سمجھتی تھیں اور انہیں برا بھلا کہا کرتی تھیں۔ روایت کے مطابق یونان کا ایک جرنیل تھمسٹوکلیز جب بازار سے گزرتا تو اس کے رتھ کے آگے گھوڑوں کی بجائے کسبیاں ہوتیں۔ یہ بھی روایت بہت مستند قرار دی جاتی ہے کہ سکندر اعظم نے اپنی منظور نظر پیشہ ور عورت "تائیس" کے اکسانے پر ایرانیوں کا عظیم الشان شہر "اصطخر" آگ لگا کر راکھ کر دیا تھا۔ اسی طرح تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف شہنشاہوں اور حکمرانوں کے بارے میں ایسی ایسی ناقابل یقین داستانیں ملتی ہیں جن کی وجہ ان کی منظور نظر جسم فروش عورتیں تھیں، جن کے کہنے پر یا جن کی وجہ سے حکمرانوں اور بادشاہوں نے ہزاروں کو تہہ تیغ کر دیا۔

مختلف ادوار میں اور مختلف تہذیبوں میں جسم فروش عورتوں، ان کے دھندے اور ان کی آبادیوں کے مختلف نام رہے ہیں۔ مثال کے طور پر روم میں جسم فروشی کے اڈے

کو "لوپانار" لغوی معنی بھیڑیئے کا غار کہتے تھے۔ اہل یونان کی طرح روم کے رئیس زادے اور اشرافیہ کے بچے تعلیم و تربیت اور شائستگی کے آداب سیکھنے کے لیے طوائفوں کے ہاں جاتے تھے۔ روم کے ایک مشہور شاعر کے بقول روم میں طوائفیں آسمان کے تاروں کی طرح بے شمار ہیں۔ کئی شہروں میں منڈی کے داروغے ہر روز بر سر عام اجنبیوں کے ہاتھ طوائفوں کی خرچی نیلام کرتے تھے اور گاہکوں کو ایک ایک چھلا دیتے تھے۔ داروغے رات کو گشت کرتے اور طوائفوں کے محلوں میں چھاپے مارتے اور اگر کوئی شخص بغیر داروغے کے چھلے کے کسی طوائف کے ہاں پکڑا جاتا تو اس کو سخت سزا دی جاتی۔ روم میں طوائفیں عموماً کنیزیں ہوتیں جن سے ان کے آقا پیشہ کرواتے۔

روم میں طوائفوں کو رکھنا ایک منافع بخش کاروبار تصور کیا جاتا تھا۔ پہلے پہل تو جرنیلوں، جاگیرداروں، داروغوں اور اشرافیہ نے کنیزوں کے روپ میں طوائفوں کو اپنے پاس رکھا اور ان سے پیشہ کروایا۔ اس کے بعد پورے روم میں طوائفوں کے ذریعے کاروبار کرنے کا رواج عام ہو گیا۔ لوگوں نے سرائیں تعمیر کیں جہاں خصوصی طور پر طوائفوں کو رکھا جاتا۔ آتے جاتے مسافر ان طوائفوں کے ساتھ شب بسری کرتے اور معاوضہ ادا کرتے۔ مختلف شہروں میں تاجروں نے بڑے بڑے حمام تعمیر کروائے جہاں طوائفیں گاہکوں کی مالش کرتیں اور ساتھ ساتھ جسم فروشی کا دھندہ بھی جاری رہتا۔ یہاں تک کہ قبرستانوں میں بھی طوائفوں نے ڈیرے جما لیے اور گاہکوں کو پھانس کر اپنا دھندہ چلانے لگیں۔

حملہ آوروں کے لشکروں میں طوائفوں کا ایک دستہ ساتھ ساتھ چلتا جاتا، یہ عورتیں گانے گا کر اہل لشکر کی دل لگی کا سامان مہیا کرتیں اور فوجیوں کے حوصلے بڑھاتیں۔ جب لشکر کہیں پڑاؤ کرتا تو قافلہ سالار فوجی جوانوں میں ان کی باری کے مطابق طوائفیں تقسیم کرتا۔ ہر فوجی اپنے معاوضے میں سے ایک مخصوص شرح کے ساتھ کٹوتی کرواتا۔ کٹوتی کی اس رقم سے طوائفوں کی ضروریات پوری کی جاتیں۔ لشکروں کے ساتھ رہنے والی طوائفوں کی اکثریت فوجیوں کی بیواؤں کی اور ان کی

لڑکیوں کی ہوتی تھی کیونکہ کفیل کی موت کی صورت میں اس کے خاندان کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا تھا اور اس کے لواحقین طوائفوں کے شعبے میں شامل ہونے کو ہی ترجیح دیتے تھے۔ بعض طوائفوں کو یہ ذمہ داری بھی سونپی جاتی کہ وہ زخمیوں کی مرہم پٹی کریں اور فوجیوں کے بچوں کو تعلیم دیں۔ ان لشکروں میں پلنے والی سازشیں بھی عموماً طوائفوں کے ذریعے پروان چڑھتیں۔ لشکر جس علاقے پر قبضہ کرتا وہاں سے ہاتھ آنے والی عورتوں کو طوائفوں میں شامل کر دیا جاتا۔ قدیم جنگجوؤں کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوبی ہندوستان، روم اور شیراز کے علاقوں کی عورتوں کو بہت پسند کیا جاتا تھا اور جنگجو سالار اپنے لشکر کے بہادروں کو ان علاقوں کی عورتیں بخش دیا کرتے تھے اور مہمانوں کی تواضع کے لیے بھی ان علاقوں سے ہاتھ لگنے والی عورتوں کو ہی استعمال کیا جاتا۔

اگر جنگجو سپہ سالاروں اور حملہ آوروں کے لشکروں کا جائزہ لیا جائے تو ان لشکروں کی کامیابیوں اور ان کے اندرونی نظم وضبط اور اتفاق کی ذمہ داری ذہین سرداروں اور ہوشیار طوائفوں کے سر ڈالی جاتی رہی ہے۔ یہ سردار اور طوائفیں عقل مندی کے ساتھ لشکروں کا انتظام سنبھالنے سے لے کر اندرونی نظم و ضبط کے تمام امور نپٹاتیں۔ جیسے رفتہ رفتہ سماج نے اس طرح کی عورتوں کو قبول کرنے سے انکار کیا ہے اور ان کی الگ شناخت کے ساتھ ساتھ انہیں الگ آبادیوں کی طرف دھکیل دیا ہے یہ دراصل مذہب کی جدید ہیت کے زیر اثر ممکن ہوا ہے۔ تمام مذاہب نے مقابلے کی فضا میں اپنے ساتھ منتھی برائیوں کو خود سے دور کرنے کی کوشش کی ہے اور مذہب کو آلائشوں سے پاک بنانے کی اس کوشش کے دوران اس کو بہت سے ثقافتی اور تاریخی حوالوں سے چھٹکارا حاصل کرنا پڑا ہے۔ جدید مذاہب نے یہاں تک پیش رفت کی ہے کہ ایسی روایات سے انحراف کیا جائے جو اس کے اجزاء تک میں شامل رہی ہیں اور اس کی شناخت میں اہم کردار ادا کرتی رہی ہیں۔ لیکن چونکہ نئے زمانے کے تقاضوں کے مطابق یہ روایات ناقابل قبول ٹھہرائی جا چکی تھیں اس لئے ان سے چھٹکارہ ناگزیر تھا۔

جہاں تک جسم فروشی کے دھندے کا تعلق قدیم مذاہب کے ساتھ ہے اس کے بارے میں قدرے وضاحت گزشتہ صفحات میں کر دی گئی ہے۔ جسم فروشی کی اس روایت کو جنوبی ایشیائی ممالک میں جتھہ بند حملہ آوروں کی وجہ سے بھی بہت زیادہ فروغ ملا ہے۔ یہ حملہ آور چونکہ لوٹ مار کا ہدف لیکر وقتاً فوقتاً قدیم ہندوستان پر حملہ کرتے رہے اس لئے ان کی فوجیں بعض اوقات ناسازگار موسم یا حالات کے باعث دریاؤں اور شہروں کے کنارے پڑاؤ ڈالتیں جہاں ان کے فوجیوں کیلئے طوائفوں کی ضرورت پڑتی۔ یہ طوائفیں زیادہ تر مقامی علاقوں سے تعلق رکھتی تھیں ان کا روزگار حملہ آور فوجیوں سے منسلک ہوتا۔ آج بھی اگر جسم فروشی کے قدیم بازاروں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ بازار زیادہ تر فوجی قلعوں کی دیواروں کے ساتھ واقع ہیں۔ شروع میں یہ بازار عارضی ہوتے تھے کیونکہ جیسے ہی فوجی لشکر اس جگہ سے کوچ کرتا طوائفیں بھی اپنا سامان سمیٹ کر لشکر کے پیچھے پیچھے چلنے لگتیں۔ جہاں لشکر کا پڑاؤ ہوتا وہیں ساتھ ہی طوائفیں بھی بیٹھ جاتیں۔

دیگر تہذیبوں کی طرح قدیم ہندوستان کی تہذیب میں بھی جسم فروشی قدیم ترین روایت کے طور پر موجود رہی ہے۔ قدیم ہندوستان میں عام طوائفوں اور کسبیوں کو روپا جیوا یا کلوٹا کے نام سے بھی پکارا جاتا رہا ہے۔ ان میں اونچا طبقہ ویشیا اور نرتکی (گانے بجانے والیاں) عورتوں کا تھا۔ پڑھی لکھی اور مہذب طوائفوں کو گنیکا بھی کہا جاتا تھا۔ کوتلیہ چانکیہ کے مشہور ارتھ شاستر میں ہدایت کی گئی ہے کہ راجے مہاراجے اپنے محلوں اور درباروں میں منتخب حسین طوائفیں رکھیں جو جلوس میں چھترا اٹھا کر چلیں۔ ناچ گا کر راجوں مہاراجوں کی دلجوئی کریں۔ ان کے جسم کی مالش کریں اور آرتی اتاریں۔ راجے مہاراجے جب دربار سے واپس آتے تو محلوں میں یہ طوائفیں انہیں نظر بد سے بچانے کیلئے آرتی اتارتی تھیں۔ ان طوائفوں کو شاہی خزانے سے تنخواہ دی جاتی، ان کو سرکاری خزانے سے تحفے تحائف بھی دیئے جاتے اور سرکار کی طرف سے ان کی تعلیم و تربیت کیلئے پنڈت مقرر کئے گئے تھے۔ اس دور میں طوائفوں کو ایک طرح عزت دی جاتی تھی اور ان کے پیشہ کو سرکار کی طرف سے سرپرستی حاصل ہو جانے کے بعد موروثی پیشہ کے طور پر دیکھا جاتا اور ان

کی بد دعا سے خصوصی صدمہ پہنچنے کی کوشش کی جاتی۔ عام لوگوں کا خیال تھا کہ یہ طوائفیں کسی بزرگ کی بد دعا کے نتیجے میں اس پیشے سے وابستہ ہیں اور اس پیشے کے ساتھ نسل در نسل کی وابستگی کے باعث بد دعا دینے والی بزرگ ہستی نے ان کی خطا معاف کر کے انہیں اپنی روحانی سرپرستی میں لے لیا ہے اور اگر ان کو تنگ کیا گیا یا ان کی دل آزاری کی گئی تو پھر ان کا روحانی سرپرست بزرگ معاف نہیں کرے گا۔ اس طرح کی اور اس سے ملتی جلتی درجنوں داستانیں طوائفوں اور ان کے پیشے کے بارے میں ہر دور میں مصروف رہیں۔

مذکورہ بالا روایت کے زیر اثر طوائفوں کے کئی خاندانوں نے بزرگوں کی درگاہوں اور مقبروں کے گردونواح میں اپنے گھر بنائے اور اس پیشے کو ایک قدیم مجبوری اور روحانی حوالے کے ساتھ زندہ رکھا۔ یہ طوائفیں بزرگوں کے سالانہ میلوں اور عرسوں کے مواقع پر مقبرے کے اردگرد منڈلاتی رہتیں اور میلے کے انتظامات میں حصہ لیتی۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح بزرگ کی خدمت کرنے سے ان کے گناہ دھل جائیں گے اور جو گناہ وہ اگلے سال کریں گی وہ اگلے عرس پر صاف ہو جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی درباروں اور مزاروں پر ہمیں طوائفوں کی اکثریت مل جاتی ہے جہاں وہ عقیدت مند کے طور پر حاضر ہوتی ہیں۔ عرس یا میلے کے موقع پر دل کھول کر اخراجات کرتی ہیں اور پیر کی خوشنودی کیلئے طرح طرح کے چڑھاوے چڑھاتی ہیں اور منتیں مانگتی ہیں۔

قدیم ہندوستان کی تاریخ میں لاتعداد ایسے مواقع بھی ملتے ہیں جہاں ان طوائفوں کو فوجیوں یا عام درباریوں کی خدمت کرنے کا حکم دیا گیا۔ ایسا ہی ایک حکم کوتلیہ چانکیہ نے ان طوائفوں کو دیا جو اپنے گھروں میں پیشہ کراتی تھیں، کہ وہ بے چون و چرا تماش بینوں کو خوش کریں۔ جس طوائف سے کوئی تماش بین ناراض ہوگا اس کو جرمانہ کیا جائے گا۔ ہر طوائف اپنی دن بھر کی کمائی کا حساب کتاب سرکاری داروغہ کو دینے کی پابند تھی اور ہر ماہ اپنی ایک دن کی کمائی کا دگنا بطور محصول حکومت کو ادا کرنے کی پابند تھی۔ اسی طرح حکومت محصول کے بدلے میں رنڈیوں کی تربیت کا بھی اہتمام کرتی تھی۔ پیشہ ور اور تجربہ کار افراد کو رنڈیوں کی تعلیم و تربیت، ناچ گانے، دل لبھانے کا فن سکھانے اور سنگھار

رنے کے طریقے سکھانے کیلئے مقرر کرتی اور انہیں سرکاری خزانے سے تنخواہ دی جاتی۔ بوڑھی طوائفوں کو وظیفہ دیا جاتا اور ان کو پابند بنایا جاتا کہ وہ امراء اور شرفاء کے بچوں کو آداب محفل سکھائیں گی۔ امراء کے بچے ان عورتوں سے رقص اور گانے کی تعلیم بھی حاصل کرتے اور ان بچوں کی سالگرہ اور شادی کے مواقع پر ان کی استاد طوائفوں کو مہمان خصوصی کی حیثیت سے مدعو کیا جاتا۔ یہ بہت آسانی کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس دور میں طوائف کے پیشے کو بہت زیادہ منظم کردیا گیا تھا اور اس کے ابتدائی قواعد و ضوابط بھی طے کردیئے گئے تھے جن کی پابندی کرنا طوائفوں اور تماش بینوں کیلئے ضروری تھی اور خلاف ورزی کی صورت میں سرکار بھاری جرمانوں کے علاوہ شہر بدری کا حکم بھی جاری کرسکتی تھی۔ کوتلیہ چانکیہ نے جان بوجھ کر طوائفوں کو دبانے اور ان پر بعض پابندیاں لگانے کا آغاز کیا۔ اس سے پہلے طوائفوں پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں تھی اور اس کا پیشہ بہت زیادہ آزاد اور اشرافیہ کے قریب سمجھا جاتا تھا۔ کوتلیہ نے طوائفوں کو عام لوگوں کے قریب کردیا اور بڑی حد تک ان کو عام لوگوں کا مطیع اور پابند بنادیا۔ کوتلیہ کا خیال تھا کہ اس طرح طوائفوں کے ساتھ زیادہ میل جول کے نتیجے میں عام لوگوں کی عادات پر فرق پڑے گا اور لوگوں کی زیادہ تعداد کو مہذب اور فعال شہری بنایا جاسکے گا چونکہ ماضی میں دربار کے ساتھ قربت کے باعث طوائفوں کے مزاج درشت ہوچکے تھے اس لئے شروع میں ان کو کوتلیہ کی ہدایت کے مطابق عمل کرنے میں سخت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس حکم کے نافذ ہونے کے بعد بہت دیر تک سرکار کی طرف سے عام لوگوں کے ساتھ بدتمیزی اور سختی کے ساتھ پیش آنے والی طوائفوں کو بھاری جرمانے کئے گئے اور کئی ایک کو شہر بدر بھی کردیا گیا۔

سرکار کی طرف سے سرپرستی کے دور میں طوائفوں کے گھروں کی تعمیر کیلئے خصوصی انتظامات کئے گئے۔ سرکاری خزانے سے ان کے گھروں کی تزئین و آرائش کا کام مکمل کیا گیا اور ان کے گھروں کو ایک طرح سے تہذیبی و ثقافتی ورثے کے طور پر دیکھا گیا۔ اس دور کے مؤرخوں اور لکھاریوں کے ہاں طوائفوں کے مکانوں کے بارے میں

لاتعداد تحریریں ملتی ہیں۔ ایک جگہ ایک مصنف لکھتا ہے ایک طوائف کا مکان کئی درجوں پر محیط ہوتا ہے، اس مکان کے آٹھ درجے ہیں جن میں پتھروں کی پچی کاری کی گئی ہے اور نہایت قیمتی قالین بچھائے گئے ہیں۔ دروازوں پر سونے کے پترے جڑے ہوئے ہیں۔ سنگ مرمر کے زینوں سے مکان کو آراستہ کیا گیا ہے۔

مشہور مؤرخ اور محقق ڈی ڈی کوسمبی لکھتا ہے کہ کوتلیہ چانکیہ کے دور میں اور اس کے تقریباً ایک سو سال بعد تک طوائفوں کو امور سرکار میں بہت زیادہ دخیل اور قابل عزت و احترام قرار دیا جاتا رہا۔ طوائفوں سے سرکار ہزار طرح کے کام لیتی۔ کئی طوائفیں محض اس لئے محلوں میں بھرتی کرلی جاتیں کہ وہ رانیوں اور مہارانیوں کو اپنے شوہروں کے دل لبھانے کے گر سکھائیں۔ مہارانیوں کو جنسی ملاپ کی پیچیدگیوں سے آشنا کریں۔ کوسمبی کے بقول چونکہ قدیم ہند کے مذہب اور تہذیب کے مطابق بیوہ عورت کو دوسری شادی کی اجازت نہ تھی اس لئے وہ معاش کے ہاتھوں مجبور ہو کر طوائف بن جاتی اور بسا اوقات کئی بیوائیں جن کا تعلق شریف گھرانے سے ہوتا وہ محل کے اندر تک رسائی حاصل کرلیتی اور رانیوں مہارانیوں کی خدمت کر کے اور ان کو تعلیم دیکر اپنی باقی زندگی عیش وآرام میں گزارتیں۔

اور یحیٰ البیرونی کتاب الہند میں لکھتا ہے کہ ہندو راجے طوائفوں کو اپنے شہروں کیلئے باعث زینت سمجھتے تھے اور انہیں رعایا کیلئے عیش و عشرت کا سامان تصور کرتے تھے۔ ان طوائفوں پر جو محصول لگایا جاتا یا جو جرمانے کئے جاتے اس کی رقم سے راجے اپنی فوج بھرتی کرتے۔ معروف مؤرخ فرشتہ لکھتا ہے۔

"سلطان علاؤ الدین خلجی نے بازار کی تمام اجناس و اشیاء کے نرخ مقرر کئے حکم عدولی کرنے والوں کو عبرتناک سزائیں دی جاتیں تھیں۔ ایک دن ایک درباری نے دست بستہ عرض کیا کہ حضور نے سب سے زیادہ ہر دلعزیز اور مقبول جنس کو تو نظر انداز کر دیا ہے۔ سلطان نے چیں بچیں ہو کر پوچھا: کون سی جنس؟ درباری نے کہا: حسن و شباب۔ سلطان سمجھ گیا اور مسکرانے لگا۔ اس کی ہدایت کے مطابق تمام کسبیوں کو عمر اور حسن و جمال کے لحاظ سے مختلف گروہوں میں تقسیم کیا گیا اور ان کی خرچی مقرر کی گئی۔

بر فرمان جاری کیا کہ جو کسبیاں مقررہ شرح سے زیادہ رقم وصول کریں گی انہیں سخت سزا دی جائے گی۔"

جسم فروشی کی سرکاری سرپرستی میں آگے بڑھنے کی داستان بہت طویل ہے۔ ہندو راجوں، مہاراجوں، مسلمان حملہ آوروں اور مسلمان بادشاہوں نے اپنی اپنی ریاستوں، محلوں اور درباروں میں اس روایت کو اپنے اپنے انداز میں زندہ رکھنے کی کوشش کی اور اس پیشے کے ساتھ منسلک لوگوں کی فلاح و بہبود کیلئے بھی وقتاً فوقتاً اقدامات کئے۔ فیروز شاہ تغلق نے جسم فروشی کے انسداد کا ارادہ ترک کرتے ہوئے کہا:

"میں نے زنانِ بازاری کا جو علانیہ فحش کرتی تھیں نکاح کرنے کا حکم دیا لیکن اراکین نے عرض کی کہ اگر ان کا نکاح کر دیا گیا تو اکثر شہری شادی شدہ عورتوں سے بدکاری میں مبتلا ہو جائیں گے لہٰذا میں نے سکوت اختیار کیا"۔

مغل بادشاہوں نے خصوصی طور پر طوائفوں کی فلاح و بہبود کا خاص خیال رکھا اور ان کو شہزادوں کی تعلیم و تربیت پر معمور کیا۔ طوائفوں کو جو اعلیٰ تعلیم و تربیت کی حامل ہوتیں درباروں اور محلوں میں داخلے کی خصوصی اجازت حاصل تھی۔ وہ امور سلطنت میں بھی دخل دیتیں اور محلوں کے اندر برپا ہونے والی سازشوں میں بھی ان کا خصوصی حصہ ہوتا۔ خواجہ سراؤں کے ساتھ ملکر طوائفیں اپنے من پسند شاہزادوں کیلئے سازشیں کرتیں اور بعض اوقات سازشوں کے بے نقاب ہونے کے بعد طوائفوں کو موت کے گھاٹ بھی اتارا گیا اور لمبی مدت کی قید کی سزائیں بھی سنائیں گئی۔ جلال الدین اکبر نے طوائفوں کیلئے ایک خاص بستی شیطان پورہ کے نام سے بسائی۔ شیطان پورہ کا رخ کرنے والوں کو اپنا نام اور پتہ لکھوانا پڑتا تھا۔ ازالہ بکارت کیلئے سرکار سے بطور خاص اجازت حاصل کرنا پڑتی تھی۔ کبھی کبھار اکبر نوجوان طوائفوں کو اپنے پاس بلا لیتا اور ان سے کرید کرید کر پوچھا کرتا تھا کہ تمہاری دوشیزگی کس نے غارت کی تھی۔ وہ نام بتاتیں تو ان مردوں کو خواہ وہ اس کے درباری ہوتے سزا دیتا تھا۔ اسی طرح بیجاپور کے احوال میں اسد بیگ لکھتا ہے:

"بازار میں ایک طرف شراب فروشوں کی دکانیں تھیں اور دوسری طرف رنڈیاں ہار سنگھار کر کے بیٹھتی تھیں۔ اس بازار میں ہر وقت گہما گہمی رہتی تھی۔ لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ شراب خانوں میں بیٹھ کر مزے سے پیتے تھے۔ ناچنے گانے والیوں کے کوٹھوں پر ہر وقت جمگھٹ رہتا تھا"۔

اس پیشے کی سب سے تیز ترقی کا دور مغلیہ دور ہے۔ مغلیہ دور میں اکثر بادشاہوں نے اس پیشے کو ایک ثقافتی ورثے کا درجہ دیا اور اس کے ساتھ نہایت فیاضانہ سلوک کیا جس کی بدولت یہ پیشہ دن بدن ترقی کی منازل طے کرنے لگا۔

معروف سیاح اور مؤرخ ٹیور نیئر اپنی کتاب "سیاحت ہند" میں لکھتا ہے: "گولکنڈہ کے مضافات اور قلعے میں جو بذات خود ایک شہر ہے ایک اندازے کے مطابق بیس ہزار سے زائد کسبیاں رہتی ہیں جن کے نام داروغہ کے رجسٹر میں درج ہیں۔ یہ پیشہ اختیار کرنے کیلئے انہیں رجسٹر میں نام لکھوانا پڑتا ہے۔ ان سے بادشاہ کوئی محصول نہیں لیتا البتہ ہر جمعہ کے دن ان میں سے بعض کو اپنی نائکہ اور سازندوں کے ساتھ شاہی جھروکے کے سامنے چوک میں حاضری دینا پڑتی۔ بادشاہ جھروکے میں بیٹھا ہو تو وہ مجرا کرتی ہیں، نہ ہو تو ایک خواجہ سرا انہیں واپس چلے جانے کا اشارہ کر دیتا ہے۔ شام کے وقت جب ہوا میں خنکی ہوتی ہے وہ اپنے مکانوں کے دروازوں میں بیٹھتی ہیں۔ یہ مکان جھونپڑے کی وضع کے ہوتے ہیں۔ رات کے وقت وہ اپنے دروازوں میں شمعیں یا دیئے روشن کر کے رکھتی ہیں جو گویا دعوت کا اشارہ ہوتا ہے۔ اسی وقت تاڑی کی دکانیں کھل جاتی ہیں۔ تاڑی ایک درخت کا مشروب ہے۔ ہر روز پانچ چھ سو گھوڑے تاڑی کی مشکوں سے لدھے ہوئے شہر میں داخل ہوتے ہیں بادشاہ کو تاڑی کے محصول سے خاصی رقم وصول ہوتی ہے۔ اسی آمدنی کی خاطر اتنی بڑی تعداد میں کسبیوں کو پیشہ کرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ انہیں کسبیوں کی بدولت تاڑی کی کھپت ہوتی ہے۔ تاڑی بیچنے والوں نے اپنی دکانیں کسبیوں کی بستی کے قریب کھول رکھی ہیں۔ یہ عورتیں اس قدر سبک خرام اور چاق و چوبند ہوتی ہیں کہ جب شاہ وقت نے مسولی پٹم جانے کا ارادہ کیا تو

نوکسبیوں نے مل کر ہاتھی کی شکل بنائی۔ چار عورتیں پاؤں بنیں، چار نے جسم بنایا، ایک سونڈ بن گئی۔ ان کے اوپر ایک تخت بچھایا گیا۔ اس سواری پر بادشاہ سلامت شہر میں داخل ہوئے"۔

طوائفوں کی بستی کو عموماً دوسرے شہروں کی آبادی سے الگ بسایا گیا۔ اس کی خاص وجہ بادشاہ کی طرف سے وہ تفریق تھی جو وہ عام شہریوں اور طوائفوں کے خاندانوں میں دیکھنا چاہتا تھا۔ بادشاہ کی اصل منشا یہ ہوتی کہ طوائفیں باعزت شہریوں کی خدمت کریں اور اس طرح لوگوں کو سرکار سے کوئی شکایت نہ رہے اور عام شہری طوائفوں کو اپنے لئے تفریح اور دل بہلانے کا سامان سمجھیں۔ اسی خیال کے تحت طوائفوں کے بازاروں میں جانے والوں کو خاص دعائیں دی جاتیں اور انہیں ترغیب دی جاتی کہ وہ روزانہ طوائفوں کے پاس جائیں۔ اس سے نہ صرف بادشاہ کو حاصل ہونے والے محصولات میں اضافہ ہوتا بلکہ آبادی کے ایک بڑے حصے کو معاش میسر آتا۔ نواب شجاع الدولہ طوائفوں کا بہت زیادہ دلدادہ تھا۔ اس کے زمانے میں دور دور سے طوائفیں لکھنؤ میں آتیں۔ لکھنؤ کی طوائفیں تین ٹکڑوں میں منقسم تھیں۔ (1) کنچنیاں : پیشہ ور ہندو کسبیاں تھیں جو ناچنے کی ماہر تھیں۔ (2) چونہ والیاں اور (3) ناگرینیاں۔ ان میں ہر قسم کی عورتیں تھیں۔ اونچے درجے کی طوائفیں ڈیرہ دار کہلاتیں۔ ان کے کوٹھوں پر نوچیوں کو ناچ گانے کے ساتھ ادب و شعر کی تعلیم بھی دلائی جاتی تھی۔ طوائفوں کے آداب کو سند کا درجہ دیا جاتا تھا اور یہ مشہور تھا کہ آدمی جب تک رنڈی کی صحبت میں نہ بیٹھے انسان نہیں بنتا۔ لکھنؤ کی ڈیرہ دار طوائف اور اس کے مکان کی تصویر مرزا ہادی رسوا کے ناول "امراؤ جان ادا" میں اس طرح ہے :

"خانم صاحب کو آپ نے دیکھا ہوگا۔ اس زمانے میں ان کا سن قریب پچاس برس کا تھا۔ کیا شاندار بڑھیا تھی۔ رنگ تو سانولا تھا مگر ایسی بھاری بھر کم جامہ زیب عورت نہ دیکھی نہ سنی۔ بالوں کے آگے کی لٹیں بالکل سفید تھیں۔ ان کے چہرے پر بھی بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ ململ کا دوپٹہ کیسا باریک چنا ہوا کہ شاید وبائید۔ اودے کا مشروع پائجامہ، بڑے

بڑے پائنچے، ہاتھوں میں موٹے موٹے سونے کے کڑے کلائیوں میں پھنسے ہوئے، کانوں میں سادی دوانتیاں لاکھ لاکھ بناؤ دیتی تھیں۔ مرزا رسوا! صاحب خانم کا مکان تو آپ کو یاد ہوگا کس قدر وسیع تھا۔ کتنے کمرے تھے۔ ان سب میں رنڈیاں۔ خانم کی نوچیاں رہتی تھیں۔ بسم اللہ (خانم کی لڑکی) اور خورشید میری ہم سنیں تھیں۔ ان کی ابھی رنڈیوں میں گنتی نہ تھی ان کے علاوہ دس بارہ ایسی تھیں جو الگ الگ کمروں میں رہتی تھیں ہر ایک کا عملہ جدا تھا۔ ہر ایک کا دربار علیحدہ ہوتا تھا۔ ایک سے ایک خوبصورت تھی۔ سب گہنے پاتے سے آراستہ، ہر وقت بنی ٹھنی تولواں جوڑا پہنے۔ سادہ کپڑے جو ہم لوگ پہنتے تھے وہ اور رنڈیوں کو عید بقر عید میں بھی نصیب نہیں ہوتے۔ خانم کا مکان تھا کہ پرستان تھا۔ جس کمرے میں جا نکلو سوائے ہنسی مذاق، گانے بجانے کے کوئی اور چرچہ نہ تھا۔ ایک دن خانم صاحب کے سامنے رام کلی گا رہی تھی۔ دھیوت سدھ لگا گئی، استاد جی نے نہ ٹوکا۔ خانم صاحب نے پھر اسے کہلوایا میں نے پھر اسی طرح کہا۔ استاد جی باخبر نہ ہوئے۔ خانم صاحب نے گھور کر دیکھا، میں استاد جی کا منہ دیکھنے لگی، انہوں نے سر جھکا لیا، پھر تو خانم صاحب نے انہیں آڑے ہاتھوں لیا۔" یہ ایک چھوٹا سا نمونہ تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ اور دوسرے ہندوستانی شہروں میں طوائفوں کا کاروبار کس حد تک وسیع تھا اور ان کو امور سلطنت میں کتنا دخل حاصل تھا۔

حکمرانوں کے ساتھ طوائفوں کا براہ راست رابطہ رہتا اور وہ نہ صرف حکمرانوں کو خوش کر کے اپنے کام نکلواتیں بلکہ اشرافیہ میں سے بھی کئی ان کے مرہون منت ہوتے کہ وہ ان کے کام آتیں۔ طوائفوں کو ہندوستان کی تاریخ سے نہیں نکالا جا سکتا اور نہ ہی ان کی اہمیت کو کم کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان کی اشرافیہ کی کئی نسلوں کو طوائفوں کے ہاں تعلیم و تربیت حاصل کرنے کا موقع ملا۔ کئی شہزادے اور حکمران طوائفوں سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد تخت نشین ہوئے اور انہوں نے اپنے ادوار میں ان طوائفوں کو انعام و اکرام دیا اور محلوں کے اندر ان کو اختیارات دیئے۔

ساری دنیا کی تہذیبوں کی طرح برصغیر میں بھی جسم فروشی کی روایت آگے بڑھی اور

نئے زمانے کے تقاضوں کے مطابق اس نے اپنے آپ کو ڈھالا۔ راجوں، مہاراجوں اور بادشاہوں کے ادوار کے خاتمے کے بعد اس روایت کو سرپرستی کے شدید فقدان کا سامنا کرنا پڑا لیکن جلد ہی اس روایت نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور نئے حالات کا مقابلہ کرنے کیلئے تیار ہو گئی۔ جسم فروش عورتوں کیلئے الگ جگہوں کا انتخاب کیا گیا اور اس پیشے کو تحفظ دینے کیلئے اور اس سے متعلقہ خاندانوں کیلئے کچھ قواعد و ضوابط مقرر کر دیئے گئے۔

انگریزوں کی آمد کے بعد جسم فروشی کے پیشے نے خاطر خواہ ترقی کی اور طوائفوں کے بازاروں کے باقاعدہ اوقات مقرر کر دیئے گئے۔ دگرگوں معاشی حالات کے باعث طوائفوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا اور یہ کاروبار روایتی بازاروں کی حدود سے باہر نکلنے لگا۔ شورش کے زمانے کے راجوں مہاراجوں نے بھی طوائفوں کی حوصلہ افزائی کی اور ان کی فلاح و بہبود کیلئے باقاعدہ فنڈز مقرر کئے۔ دوسری طرف غیر منقسم ہندوستان میں عوام کا رجحان تیزی کے ساتھ مذہب کی طرف ہونے لگا تھا اور اس رجحان سے جسم فروشی کے دھندے کو خطرہ تھا۔ تقسیم ہند کے بعد دونوں ملکوں کے بڑے اور چھوٹے شہروں میں جسم فروشی کے بازار موجود ہیں اور طوائفیں اپنا پیشہ کرتی ہیں۔

پاکستان میں لاہور، کراچی اور پشاور میں جسم فروش عورتوں کے مشہور بازار تھے جبکہ چھوٹے شہروں میں بھی چند گھرانے اس پیشے سے وابستہ تھے۔ پاکستان میں بھی یہ کاروبار ترقی کرنے گا اور بہت سی معروف طوائفوں نے مختلف ادوار میں حکمرانوں تک رسائی حاصل کی۔ پاکستان میں فلم انڈسٹری کی فعالیت کے ساتھ ہی ان عورتوں کو ایک معاون پیشہ بھی ہاتھ آگیا اور یہ دن دگنی رات چوگنی ترقی کرنے لگیں۔ پاکستان کی کئی مشہور اداکارائیں اور گانے والیاں جسم فروش گھرانوں سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کے خاندانوں نے اپنے اس آبائی پیشے کو آج بھی سینے سے لگا رکھا ہے۔ فلم انڈسٹری کو اداکاراؤں اور گلوکاراؤں کی ایک بہت بڑی کھیپ ملتان کے جسم فروش خاندانوں نے مہیا کی اور یہ خواتین آج بھی اداکاری و گلوکاری کے ساتھ ساتھ جسم فروشی کے دھندے کو زیادہ جدید خطوط پر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ آج ان کے رابطے مقتدر سیاستدانوں اور بلاقتور بیورو

کریٹس کے ساتھ بہت گہرے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کے ان جسم فروش خاندانوں نے اپنے کاروبار کو خلیجی ریاستوں تک پھیلا دیا ہے اور ثقافتی طائفوں کے نام پر پیشہ ور عورتوں کے غول آئے دن ریاستوں میں اپنے "فن" کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ پاکستان میں جسم فروشی کی موجودہ صورتحال کے بارے میں اگلے ابواب میں زیادہ تفصیل کے ساتھ گفتگو کی جائے گی۔

پاکستان میں مردانہ جسم فروشی

موضوع کے لحاظ سے یہ ایک حیران کن تحقیق ہے کہ عورتوں کی طرح مرد بھی جسم فروشی کو ایک باقاعدہ پیشے کے طور پر اپنائے ہوئے ہیں اور ایک ایسے معاشرے میں جسم فروش مردوں کی ایک بہت بڑی تعداد پائی جاتی ہے، جس میں جسم فروش عورتوں کی کوئی کمی نہیں۔ دن بدن ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے اور لاتعداد پابندیوں کے باوجود جسم فروشی کا پیشہ منظم ہو رہا ہے۔ جس طرح جسم فروش عورتیں اپنے پیشے کی ضرورت کی مطابق ایک خاص اہتمام کا مظاہرہ کرتی ہیں تاکہ گاہکوں کو اپنی طرف مائل کیا جائے اسی طرح مرد جسم فروش بھی بناؤ سنگھار کے علاوہ وہ تمام لوازمات پورے کرتے ہیں جو ان کو گاہک پھانسنے کیلئے درکار ہوتے ہیں۔ جسم فروش عورتوں کی طرح، ان کا بھی اپنا ایک حلقہ ہے، برادری ہے اور مخصوص رسم و رواج ہیں۔ ان کے بھی عورتوں کی طرح اڈے ہیں، جہاں بھاؤ تاؤ ہوتا ہے، گاہک کو تمام سہولیات بہم پہنچائی جاتی ہیں، پولیس جو عموماً بھتے کیلئے اس طرح کے کاموں میں مزاحم ہوتی ہے، ان سے ماہانہ بھتہ حاصل کرتی ہے اور بدلے میں "چشم پوشی" کے ساتھ ساتھ خاص حد تک تحفظ فراہم کرتی ہے۔ غرض یہ کہ جس طرح پاکستان میں عورتیں جسم فروشی کے ایک مضبوط اور دن بدن ترقی کرتے ہوئے پیشے کے ساتھ منسلک ہیں اس طرح مرد جسم فروش بھی اس کاروبار کو آگے بڑھانے میں مصروف ہیں۔

قدیم تاریخ بھی بتاتی ہے کہ جس طرح عورتوں میں جسم فروشی کا آغاز قدیم مذہبی عبادت گاہوں سے ہوا اس طرح مصر قدیم میں دیوی ماتا آئسس کے معبد میں ہیجڑے پجاریوں کو اپنا جسم پیش کرتے تھے۔ اس زمانے میں جب مذکورہ معبد میں ہیجڑے جسم پیش کر کے پجاریوں کو اور دیوی ماتا کو خوش کرتے تھے مورخین کا خیال ہے کہ عام سماج میں بھی مردانہ جسم فروشی اور مرد پرستی کا عروج تھا۔ مصر سے یہ روایت قریبی ریاستوں

میں پہنچی اور یوں اس روایت نے دوسری دنیاؤں تک رسائی حاصل کی۔

عہد نامہ قدیم کے باب "پیدائش" میں تحریر ہے کہ جب دو فرشتے سدوم کو آگ اور گندھک برسا کر تباہ کرنے کو آئے تو یہ فرشتے جناب لوط علیہ السلام کے گھر میں ٹھہرے۔ جہاں سدومیوں نے انہیں گھیر لیا اور شور مچانے لگے کہ اے لوط علیہ السلام انہیں باہر بھیجو۔ فرشتوں نے ان سدومیوں کو اندھا کر دیا اور اس طرح آپ کو بچایا۔ سدوم کی طرح یونان کا شہر کورنتھ سدومیت کا بہت بڑا مرکز تھا۔ ان کا پروہت اکودرم کہلاتا تھا۔ آج لاہور کی ہیرا منڈی جہاں درجنوں کے حساب سے جسم فروش ہیجڑوں کے اڈے ہیں وہ اس پیدائشی ہیجڑے کو جسے وہ اپنا سردار مانتے ہیں "اکوا" کہتے ہیں خیال یہی ہے کہ یونان کے اس "اکودرم" خطاب نے وقت کے ساتھ ساتھ یہاں تک سفر کیا اور یہ لفظ آہستہ آہستہ "اکوا" بن گیا۔

یونان میں نوجوان لڑکوں کے ساتھ عشق کرنے کی روایت بہت قدیم اور مضبوط ہے۔ قدمائے یونان مردوں کے حسن و جمال کے شیدائی تھے اور خوش چہرہ نوجوان سے عشق کرتے تھے۔ وہ نوخیز لڑکوں کی آنکھوں، سنہرے بالوں اور رخساروں کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ ارسطو کہتا ہے: "عشاق اپنے محبوب لڑکوں کے حسن و جمال کا نظارہ صرف ان کی آنکھوں میں کرتے ہیں کہ انہی میں لڑکوں کے محاسن کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔" خود سقراط ایک حسن لڑکے آٹولیکس کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:

"جس طرح اندھیری رات میں آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں پر سب لوگوں کی نگاہیں جم کر رہ جاتی ہیں۔ اس طرح آٹولیکس کے چہرے کی طرف تمام لوگوں کی نگاہیں اٹھ جاتی ہیں۔"

پوری تاریخ انسانی عورتوں کے ساتھ ساتھ مردوں کے عشق کی داستانوں اور بعض اوقات حیران کن اور شرمناک روایتوں اور واقعات سے بھری پڑی ہے۔ مورخین جسم فروشی کے اس دھندے کو مذہب اور قدیم روایتوں کے ساتھ جوڑتے ہیں اور ان کا نقطہ نظر واقع طور پر حقیقت پسندانہ نظر آتا ہے کیونکہ ان کی تحقیق کے ماخذات اس قسم

کی داستانوں اور واقعات سے اٹے پڑے ہیں۔ بعض ایسی روایتوں میں اس طرح کی داستانوں کے وہ سلسلے ملتے ہیں کہ قاری کو اپنے مذہبی و سماجی اعتقادات ٹوٹتے نظر آتے ہیں لیکن جہاں ایک انسان دیگر ناقابل برداشت اور کراہت آمیز رسوم ورواج اور روایات کی حقیقت کو تسلیم کرتا ہے اور ان وجود سے انکار نہیں کرتا اسی طرح مذکورہ بالا روایت کو بھی اس کی حقیقتوں کے بغیر نہیں دیکھا جاسکتا اور اس کے وجود سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں البتہ مختلف عقائد اور رویوں کے تحت اس پیشے کو مختلف اوقات میں غصے اور نفرت کی آنکھ سے دیکھا گیا ہے۔

آج پاکستان میں قانون مرد اور عورت دونوں کو جسم فروشی کی اجازت نہیں دیتا طوائفوں کی حدود کا تعین کرتے وقت قانون ان کو رات کے ایک خاص وقت کے دوران ناچ گانے کی اجازت دیتا ہے لیکن جسم فروشی کی نہیں۔ یہ قوانین اس وقت مزید سخت کر دیئے گئے جب ضیاء الحق نے اقتدار پر قبضہ کرلیا۔ ضیاء الحق نے جہاں دیگر اقدامات کیلئے اسلام کا سہارا لیا وہاں حدود کے قوانین لاگو کرتے وقت مذہب کا سہارا لیا اور حدود کے مقدمات کیلئے شرعی سزاؤں کا اعلان کیا۔ ضیاء الحق کے بعد بھی اس کے لاگو کردہ قوانین کو تبدیل نہیں کیا گیا اور حدود کے معاملے میں لوگوں کو ضیاء قوانین کا سامنا ہے۔ ان قوانین کے تحت جسم فروشی کو قابل تعزیر فعل قرار دیا گیا اور لاتعداد لوگوں کو کوڑے مارے گئے۔

چارلس نیپئر نے فتح سندھ کے بعد محض کراچی شہر میں درجنوں ایسے اڈوں کا سراغ لگایا جہاں مرد جسم فروش اپنے چاہنے والوں کو اپنا جسم پیش کر کے پیٹ بھرتے تھے۔ اگر مردانہ جسم فروشی کی تاریخ اور وقت کے ساتھ ساتھ اس پیشے کی ترقی کا اندازہ لگانا مقصود ہو تو یونان، مصر، ترکی اور دیگر ممالک سے لے کر مغلوں کے ہندوستان تک ہزاروں داستانیں ملتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ پیشہ شروع میں کیا تھا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی شکل کیا بن گئی۔

پاکستان میں اس وقت مردانہ جسم فروشی کا دھندہ اپنے عروج پر ہے۔ لاہور،

کراچی، پشاور، کوئٹہ اور دیگر بڑے شہروں کے علاوہ چھوٹے چھوٹے قصبوں اور دیہات میں بھی یہ پیشہ پوری شدت کے ساتھ جاری ہے۔ لیکن جیسے جیسے علاقے اور ان کا رہن سہن تبدیل ہوتا جاتا ہے اس پیشے سے منسلک لوگ بھی اپنی روایات تبدیل کرتے ہوئے ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر لاہور اور کراچی میں باقاعدہ گروہوں کی شکل میں اور منظم مردانہ جسم فروشی ملتی ہے جبکہ دوسرے شہروں میں یہ پیشہ انفرادی طور پر اور دو یا تین لونڈوں کے گروہوں کی صورت میں جاری ہے۔ اس پیشے سے منسلک زیادہ تر ہیجڑے ہیں جو اپنے ہم نسل افراد کے ساتھ مل کر یہ کام کرتے ہیں جبکہ ایسے لونڈوں کی بھی بہت بڑی تعداد مل جاتی ہے جو اپنی ظاہری شکل و صورت میں کوئی تبدیلی نہیں لاتے اور عام لڑکوں کی طرح رہتے ہیں لیکن ان کا پیشہ بھی جسم فروشی ہے۔ ان کے گاہک عموماً لگے بندھے ہوتے ہیں جو ایک مقررہ شرح کے ساتھ ان کو ادائیگی کرتے ہیں اور ان سے خاص مدت کیلئے فیض یاب ہوتے ہیں۔ ایسے لڑکوں کی بڑی تعداد سینما گھروں، نگار خانوں، لاری اڈوں، ہسپتالوں، ریلوے اسٹیشنوں، تعلیمی اداروں یا پھر کارخانوں وغیرہ میں اپنا دھندہ چلاتی ہے۔ جب تک ان کا ظاہری حسن ماند نہیں پڑ جاتا۔ یا پھر ان کی عمر زیادہ نہیں ہو جاتی یہ جسم فروشی کے پیشے کے ساتھ ساتھ منسلک رہتے ہیں۔ اس طرح کے لڑکوں کی زیادہ تر تعداد غریب خاندانوں سے تعلق رکھتی ہے جو بچپن میں عموماً حادثاتی طور پر یا ناگزیر ضروریات کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس پیشے کا رخ کرتے ہیں۔ اس طرح کی عادات کے حامل لڑکے عموماً چھوٹا موٹا جرم کر کے جیلوں میں چلے جاتے ہیں جہاں یہ اپنا پیشہ زندہ رکھتے ہیں اور بالآخر نشے کی اندھی وادی میں کود جاتے ہیں۔

پولیس عموماً جسم فروش لڑکوں پر جسم فروش عورتوں کی طرح سختی نہیں کرتی کیونکہ جسم فروشی کا بہت کم معاوضہ لینے والے یہ لڑکے پولیس کیلئے سود مند نہیں ہوتے۔ یہ لڑکے عموماً پولیس اہل کاروں کیلئے معمولی نوعیت کی مخبری کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں یا پولیس والوں کو "خوش" کر کے اپنا دھندہ جاری رکھتے ہیں۔ چونکہ یہ دھندہ آوارہ گرد اور گھروں سے بھاگے ہوئے لڑکے کرتے ہیں اس لئے یہ لڑکے جیب تراشی اور

ٹھائی گیری جیسا جرم بھی کرتے رہتے ہیں۔ پولیس کو ان کے بارے میں تمام معلومات حاصل ہوتی ہیں اور پولیس والے عموماً ان کو اپنا مددگار تصور کرتے ہیں۔

ایک پرائیویٹ ادارے کے سروے کے مطابق جو لڑکے جسم فروشی کی طرف مائل ہوتے ہیں ان میں سے اکثر کے ساتھ بچپن میں جنسی زیادتی یا جنسی طور پر ہراساں کرنے جیسے جرم کا ارتکاب کیا جا چکا ہوتا ہے۔ اس "جرم" کے بعد عموماً سماج میں ان لڑکوں کیلئے کوئی جگہ نہیں رہتی اور نہ ہی لوگ اپنے بچوں کو ان کے ساتھ ملنے دیتے ہیں۔ اس طرح تنہائی اور احساس جرم کے ملے جلے احساسات کے تحت یہ بچے گھروں سے اٹھتے ہیں اور ان کا عموماً پہلا مسکن لاری اڈہ یا ریلوے اسٹیشن ہوتا ہے۔ گھر سے بھاگتے وقت ان کے سامنے وہ مشکلات نہیں ہوتیں جن سے ان کو پالا پڑتا ہے بلکہ اکثر یہی خیال کرتے ہیں کہ وہ ایک بہتر اور آزاد ماحول میں جا رہے ہیں جہاں وہ اپنی مرضی کے ساتھ زندگی گزار سکیں گے لیکن ایسا عموماً نہیں ہوتا۔ گھر سے بھاگے ہوئے ان نوخیز لڑکوں کو جہاندیدہ ڈرائیور، کنڈیکٹر اور پولیس والے فوراً پہچان لیتے ہیں اور نوکری دینے، رہائش، کھانے اور نقد رقم وغیرہ کا لالچ دیکر ان کو پھانس لیتے ہیں۔ گھر سے دور پیش آنے والی مشکلات اور مسائل سے خوفزدہ یہ بچے پناہ کیلئے سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ اس طرح اتفاقاً یا حادثاتی طور پر جنسی تشدد کا نشانہ بننے والے یہ بچے مجبوراً جسم پیش کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں اور جرائم پیشہ لوگوں کی ہوس کا نشانہ بنتے رہتے ہیں۔ اوّل تو اس طرح کے بچے مستقلاً عادی جسم فروش ہو جاتے ہیں اور اگر ان میں سے کوئی اس پیشے سے بغاوت کر دے تو وہ خود قاعل کے طور پر شکار تلاش کرنے لگتا ہے۔

جب یہ بچے عادی جسم فروش بن جاتے ہیں تو انہیں کسی ایسی جگہ کی تلاش ہوتی ہے جہاں یہ اپنا پیشہ جاری رکھ سکیں۔ اکثر لڑکے لاری اڈوں اور ریلوے اسٹیشنوں کا انتخاب کرتے ہیں اور مقامی انتظامیہ کی آؤ بھگت کر کے اپنا کام چلاتے ہیں لیکن ان کی راہ میں بہت سی رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں جو آزادی کے ساتھ ان کو دھندہ جاری نہیں رکھنے دیتیں۔ عموماً اس طرح کی مشکلات سے گھبرا کر یہ عادی جسم فروش ہیجڑوں کے ساتھ رابطہ کرتے

ہیں اور ایک معاہدے کے تحت ہیجڑوں کے خصوصی ڈاکٹر سے آپریشن کروا کے ان میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اس طرح کے ہیجڑوں کو چھبرا ہیجڑے کہا جاتا ہے اور جسم فروشی کے علاوہ ان کو کوئی کام نہیں آتا۔

میو ہسپتال کے ایک ماہر سرجن کے مطابق کوئی بھی عام سرجن کسی بھی شخص کو ایک چھوٹے سے آپریشن کے ذریعے آختہ کر سکتا ہے۔ عموماً اس طرح کا آپریشن وہ لوگ کرواتے ہیں جن کے ہارمونز میں یا تو زنانہ جنز کے مقدار زیادہ ہوتی ہے یا پھر جو بچپن سے جنسی طور پر مفعول کے طور پر عادی ہو چکے ہوتے ہیں۔ آپریشن کے ذریعے ان کی مردانہ جنسی اہلیت کو روک دیا جاتا ہے اور عضو مخصوص کی بعض رگیں اور نسیں کاٹ دی جاتی ہیں جس کے باعث مردانہ جنسیت کی تمام حسیں یکسر ختم ہو جاتی ہیں اور آپریشن کروانے والا نفسیاتی طور پر اپنے آپ کو زنانہ جنسی اہلیت کا مالک سمجھنے لگتا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہوتا اور اس کی صرف مردانہ جنسی اہلیت ختم ہوتی ہے اور اس اہلیت کے خاتمے کے بعد زنانہ جنسی اہلیت نہیں آجاتی۔

مذکورہ ڈاکٹر کے مطابق یہ ایک نہایت معمولی قسم کا آپریشن ہے جس کے بعد مریض ایک دو دن تک چلنے پھرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بہت گھمبیر معاملہ ہوتا ہے اور آپریشن کے دوران آپریشن کروانے والے کی جان کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے ایسی کوئی بات نہیں ہوتی۔ عموماً اس طرح کے آپریشن عام ڈاکٹر نہیں کرتے کیونکہ وہ اس کو معیوب سمجھتے ہیں جبکہ اگر کوئی اس طرح کا کام کرتا ہے تو اس کو ڈاکٹروں کی برادری اچھا نہیں سمجھتی ویسے قانونی طور پر اس طرح کے آپریشن پر کوئی پابندی نہیں۔ جس طرح لوگ خاندانی منصوبہ بندی کے تحت چھوٹے چھوٹے آپریشن کرواتے ہیں اسی طرح یہ بھی ایک آپریشن ہے فرق صرف یہ ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی کے تحت کئے جانے والے آپریشن میں اس صلاحیت کو ہمیشہ کیلئے ختم نہیں کیا جاتا جبکہ اس طرح کے آپریشن میں اس صلاحیت کا مکمل خاتمہ کر دیا جاتا ہے اور عضو مخصوص کی وہ رگیں اور نسیں کاٹ دی جاتی ہیں جو اس کو ایستادہ کرتی ہیں۔

دستیاب شواہد کے مطابق لاہور میں اس طرح کا آپریشن گوالمنڈی کا ایک سرجن کرتا ہے جو دس ہزار روپے فیس لیتا ہے اور ہیجڑوں کے ساتھ اس کا معاہدہ ہے کہ وہ کسی غیر متعلقہ شخص کو اس کے بارے میں نہیں بتائیں گے۔ میں نے جن چھمرے ہیجڑوں سے ڈاکٹر کے بارے میں دریافت کیا ان کا عموماً جواب یہی تھا کہ وہ نہیں جانتے کیونکہ آپریشن سے پہلے اور بعد میں ان کو ہوش نہیں تھا۔

ایک معروف گرو کے مطابق اس وقت صرف لاہور میں ایک ہزار سے زیادہ ایسے افراد ہیں جنہوں نے خصوصی طور پر ہیجڑہ بننے کیلئے آپریشن کروائے۔ یہ تمام ہیجڑے اڈوں پر اجتماعی اور انفرادی طور پر جسم فروشی کے دھندے سے منسلک ہیں اگر یہ جسم فروشی نہ کریں تو کوئی دوسرا کام نہیں کر سکتے۔ جہاں تک ان جسم فروش ہیجڑوں کے بیمار ہونے کا تعلق ہے اور مزید بیماریاں پھیلانے میں ان کا جو کردار ہے اس کے بارے میں کوئی قابل اعتبار اعداد و شمار نہیں ملتے اور نہ ہی کوئی ایسا ادارہ ہے جو ان کے بارے میں اعداد و شمار جمع کرنے کا کام کر رہا ہو۔ ہر طرف مبالغے کی سی فضا ملتی ہے ہیجڑوں کا موقف ہے کہ وہ جنسی تعلقات میں احتیاط سے کام لیتے ہیں اور ان کے ذریعے بیماریاں دوسرے لوگوں میں منتقل نہیں ہوتیں جبکہ عام لوگوں خصوصاً ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ ایڈز، سوزاک اور اس جیسی مہلک بیماریاں ان ہیجڑوں کے ذریعے عام لوگوں میں منتقل ہو رہی ہیں چونکہ ہیجڑے اپنے مخصوص ڈاکٹر کے علاوہ کسی ادارے یا ڈاکٹر سے اپنا چیک اپ نہیں کراتے اس لئے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ کتنے فیصد ہیجڑے ایڈز اور دوسری خطرناک بیماریوں کا شکار ہیں اور ان کے ذریعے کتنے لوگوں کو سالانہ اوسطاً بیماریاں منتقل ہوتی ہیں۔

بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ ہیجڑوں کے ذریعے خطرناک بیماریاں عام لوگوں میں منتقل ہو رہی ہیں اور اس کی روک تھام کا کوئی موثر طریقہ کار موجود نہیں۔ بازار حسن میں جو ڈاکٹر ماہانہ کی بنیاد پر طوائفوں کا سرسری معائنہ کرتے ہیں ان کے دائرہ کار میں ہیجڑوں کا معائنہ کرنا شامل نہیں اور اگر ان کو ہیجڑوں کا معائنہ کرنے کا پابند بنا دیا

جائے تو جس طرح وہ طوائفوں کا معائنہ کر کے سب اچھا کی رپورٹ دیتے ہیں اسی طرح ہیجڑوں کے بارے میں ان کی جاری کردہ رپورٹ حکام کو مطمئن کر دے گی۔ اگلے صفحات میں لاہور میں ہیجڑوں کی جسم فروشی، ان کی روایات اور لاہور میں ان کے اڈوں کے بارے میں کچھ تفصیلات دی گئی ہیں۔

لاہور کی ہیرا منڈی جو اپنی روایات کے باعث برصغیر میں ایک خاص پہچان کی حامل ہے یہاں سے خاندانی طوائفوں نے لاہور کے پوش علاقوں کی طرف نقل مکانی کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے تقریباً 60 فیصد طوائفیں ہیرا منڈی کا علاقہ چھوڑ چکی ہیں، اب یا تو ان کے غریب رشتہ دار یہاں رہ گئے ہیں یا وہ ملنے والے جو کم آمدن کے باعث نئے گھر نہیں خرید سکتے۔ طوائفوں کی بڑی تعداد گزشتہ ایک عشرے میں یہاں سے نکلی ہے کیونکہ گزشتہ چھ سات برس میں بیرون ملک ثقافتی طائفوں اور اسٹیج ڈراموں کی بڑھتی ہوئی مانگ کی بدولت انہوں نے بہت زیادہ دولت کمائی ہے۔ گلوکاری یا اداکاری میں تو ان طوائفوں نے کوئی خاص کارنامے سر انجام نہیں دیئے البتہ جسم فروشی میں انہوں نے بہت نام کمایا ہے۔ ماما موداسے لیکر عبدالرحمٰن تک لوگوں نے پروموٹر بن کر طوائفوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو بیرون ملک مقیم دولت مند پاکستانیوں میں متعارف کروایا ہے اور خود بھی بے تحاشہ دولت کمائی ہے۔ جیسے جیسے ان طوائفوں کے حالات بدلتے گئے ان کا دل ہیرا منڈی جیسے پسماندہ اور گندے علاقے سے اچاٹ ہونے لگا اور انہوں نے علامہ اقبال ٹاؤن، ماڈل ٹاؤن، گلبرگ اور ڈیفنس کے صاف ستھرے اور پوش علاقوں میں رہائش اختیار کرنا شروع کر دی۔ جس طوائف کے پاس بہتر "مال" تھا اس نے بڑے بڑے سودے کئے اور ان علاقوں میں کروڑوں روپے سے تعمیر ہونے والے گھر تحائف کی صورت میں قبول کر لئے۔ ہیرا منڈی میں ویسے بھی گاہکوں کا رش کم ہونے لگا تھا اور ناچ گانے میں کوئی خاص پیسہ بھی نہیں رہ گیا تھا اس لئے انہوں نے محض جسم فروشی کا دھندہ اپنایا اور اس علاقے کو چھوڑ دیا۔ طوائفوں کے چھوڑے ہوئے مکانات علاقہ کی روایتی بدنامی کے باعث فروخت نہیں ہو سکتے تھے اور نہ ہی اس پیشہ سے غیر وابستہ کوئی خاندان

ان گھروں میں رہائش کر سکتا تھا اس لئے ان طوائفوں کو سب سے بہتر گاہک ہیجڑوں کی صورت میں ملے۔ طوائفوں کی کمی کو ان ہیجڑوں نے کمال خوبصورتی کے ساتھ پورا کیا تھا اور غریب گاہکوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا اس لئے طوائفوں کے ان سابقہ مکانوں کے اصل حق دار بھی یہی ہیجڑے تھے۔

90ء کے شروع میں ہیجڑوں نے لاہور کے بازار حسن کا رخ کیا اور یہاں تاریک اور گندے کمروں میں رہائش اختیار کی۔ یہ ہیجڑے زیادہ تر لاہور کے مضافات سے وارد ہوئے تھے کیونکہ ڈش انٹینا اور دیگر ابلاغی سہولیات کی آمد نے ان کی ضرورت اور قدر کم کر دی تھی۔ دیہات میں ہیجڑے شادی بیاہ اور بچوں کی پیدائش وغیرہ کے مواقع پر ناچ گا کر اپنا پیٹ پالتے چلے آرہے تھے لیکن جدید ذرائع نے ان کے فن کی ناقدری میں اہم کردار ادا کیا اور ہیجڑوں کا ناچ اور بھدی آواز کا گانا غیر مقبول ہونے لگا۔ شادی کے مواقع پر لوگ اونچی آواز میں ڈیک لگاتے اور انڈین جدید موسیقی کے ذریعے اپنی تقریبات کو رونق بخشتے۔ جن کے پاس زیادہ دولت ہوتی وہ قریبی شہر سے میوزک گروپوں کو بلا لیتے جن میں مردوں کے ساتھ ساتھ عورتیں بھی پرفارمر کے طور پر شامل ہوتیں اور یوں تقریب ہیجڑوں کی نسبت کئی گنا زیادہ پرکشش اور حقیقی ہو جاتی۔ بڑے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ 90ء کے عشرے کے شروع میں پنجاب میں ہیجڑے بے وقعت ہونا شروع ہو گئے۔ دیہات میں چونکہ ان سے جسمانی حظ اٹھانے کا کوئی خاص رواج نہیں تھا اس لئے لوگ اس طرف مائل نہ ہو سکے اور نہ ہی ہیجڑے اپنی اس خاصیت کی طرف دیہاتی لوگوں کو متوجہ کر سکے اگر کوئی دیہاتی لڑکا کسی ہیجڑے کے ساتھ جسمانی تعلق قائم بھی کرتا تو اس میں پیسے کا کوئی عمل دخل نہ ہوتا تھا یا تو یہ تعلقات دیہاتی نوجوان کی طاقت اور خاندانی وجاہت کی بناء پر قائم ہوتے یا پھر اس میں ہیجڑے کی طرف سے عشق وغیرہ کا یکطرفہ عمل دخل ہوتا۔ دیہات میں ہیجڑے باقاعدہ ایک "سیپی" کی سی حیثیت سے زندگی گزار رہے تھے جو فصلوں کے مواقع پر کھلیانوں میں جا کر فصل اکٹھی کرتے اور تہواروں وغیرہ پر ناچ گا کر ضروریات زندگی کیلئے پیسہ اکٹھا کرتے۔ دیہات کے دیگر عام "کامیوں" کی نسبت ہیجڑے

زیادہ دولت مند ہوتے اور انہیں قدرے کم محنت صرف کر کے دیگر کمیوں سے زیادہ پیسے اور اناج وغیرہ مل جاتا۔

جیسے جیسے موسیقی کے جدید ذرائع متعارف ہونے لگے ان ہیجڑوں کا کاروبار بند ہونے لگا۔ لوگ پہلے کی نسبت ان کی طرف کم مائل رہتے اور ان کو ایک خاص قسم کی تضحیک کے ساتھ دیکھا جانے لگا۔ ہیجڑا ہونا پہلے ہی سماجی طور پر ایک گالی تھی اور نامردی شرم اور بے عزتی کی بات تھی لیکن اب یہ نہ صرف بے شرم تھے، نامرد، بے عزت تھے بلکہ نئی ضروریات کے مطابق فالتو اور غیر مہذب بھی تھے۔ ہیجڑوں کے فالتو اور غیر مہذب بلکہ غیر شرعی ہونے کی ایک بڑی وجہ پاکستانی معاشرے میں تیزی کے ساتھ بڑھتی ہوئی مذہبی سوچ بھی تھی۔ 90ء کے شروع میں ہی پاکستان میں ایک طرف فرقہ وارانہ جنگ کا سلسلہ شروع ہو گیا تو دوسری طرف لوگوں کو پارسائی اور جہاد کا درس دیا جانے لگا۔ اس کی شروعات مرحوم ضیاء الحق کر چکے تھے جو محض اقتدار کی خاطر ایک ایسا اسلامی معاشرہ قائم کرنا چاہتے تھے جو ان کی مرضی کے مطابق سخت روایات کا پابند ہو اور ان کو تاحیات امیر المومنین تسلیم کرے۔ یہ سختی ذرائع ابلاغ میں بھی آئی اور مختلف مبلغین نے ذرائع ابلاغ کے ذریعے پاکستانی قوم کی تطہیر کا ذمہ اٹھالیا اور سماجی سطح پر موجود قدیم روایات اور شناخت کو ہندووانہ قرار دیکر ان کے خلاف ایک تحریک چلائی جانے لگی۔ معاشرے کی تطہیر یا افراد کی تطہیر کا عمل تو نہ پورا کیا جاسکا البتہ معاشرے میں ایک قسم کی سختی کا عنصر شامل کر دیا گیا۔ لوگ عبادات اور مسلکی مخالفین کیلئے سخت رویہ اپنانے لگے۔ مجموعی سختی کے اس ماحول میں عام ثقافتی سرگرمیاں متاثر ہوئیں اور لوگوں نے اس کا بہت زیادہ اثر لیا۔ غریب طبقات مذہب کی طرف سختی سے مائل ہوئے اور جہاد کیلئے افغانستان اور کشمیر میں جانے لگے۔ معاشرے میں در آنے والی اس سختی نے روایتی کلچر اور ثقافت کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا اور ناچ گانے والوں اور والیوں کو ایک خاص نفرت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ اس روایت کا سب سے زیادہ اثر غریب ہیجڑوں پر پڑا۔ ان کے ناچ گانے کیلئے سامعین و ناظرین کی تعداد کم ہونے لگی اور رفتہ رفتہ ان کا

گانا محدود تر ہو کر رہ گیا۔ ہیجڑوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے پیٹ پالنے کیلئے شہروں کا رخ کیا اور ناچ گانے وغیرہ کو یکسر ترک کر کے چھوٹے درجے کے لوگوں کو جسم فراہم کرنا شروع کیا۔ ہیجڑے زنانہ لباسوں میں بناؤ سنگھار کئے بازاروں اور سڑکوں پر نظر آنے لگے اور ان کو جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے کیلئے بہت تھوڑے معاوضے پر گاہک ملنے لگے۔ لوگ تھوڑے سے پیسوں کے ساتھ ان کا وجود حاصل کرنا چاہتے تھے اور اپنی ناآسودہ جنسی خواہشات کی تھوڑی سی تکمیل چاہتے تھے ان کا روایتی ناچ گانا نہیں چاہتے تھے۔ شروع شروع میں ہیجڑوں کو ایک طرح کی پذیرائی حاصل ہوئی اور میلوں ٹھیلوں میں لوگ نہ صرف ان کا ناچ گانا دیکھتے بلکہ اس کے بعد کچھ وقت کیلئے ان کا جسم بھی حاصل کر لیتے۔ بھوک سے بھاگے ہوئے ہیجڑوں کے دن پھرنے لگے اور انہوں نے شہروں میں مستقل رہائش اختیار کر لی۔ ہیجڑوں کی ایک بہت بڑی تعداد سرکس، تھیٹر، موت کے کنوئیں اور راس دھاریوں کے ساتھ شامل ہو گئی اور وہ دیہاتی جو شادی بیاہ اور بچوں کی پیدائش و ختنہ وغیرہ کی تقاریب میں ان کا گانا سنتے اور ناچ دیکھتے تھے وہ میلوں میں نہ صرف ان کا ناچ گانا دیکھتے بلکہ رات کو ان کے جسم کا سودا بھی کرنے لگے۔ ہیجڑوں نے بلیو پرنٹ فلموں سے سبق سیکھا اور گاہکوں کو مطمئن کرنے کیلئے وہ سب کچھ کرنے کیلئے تیار ہو جاتے۔ لوگ چوری چھپے ان سے تعلق استوار کرتے اور یہ سلسلہ برس ہا برس تک چلنے لگا۔ کئی لوگ ہیجڑوں کو باقاعدہ اپنی کفالت میں لے لیتے اور ان کے ساتھ تعلق برقرار رکھتے۔

پنجاب میں جب دیہات میں ہیجڑوں نے اپنا کاروبار ختم ہوتا محسوس کیا تو انہوں نے بڑے شہروں کا رخ کیا۔ سب سے زیادہ ہیجڑوں نے لاہور کو اپنا مسکن بنایا۔ ایک بڑی تعداد نے ملتان کے قدیمی بازار حسن "حرم گیٹ" کے گرد و نواح میں رہائش اختیار کی جبکہ ایک بہت بڑی تعداد نے راولپنڈی، فیصل آباد، اوکاڑہ، ساہیوال، سیالکوٹ، گجرات، جہلم، رحیم یار خان، سرگودھا، بہاولپور، ڈیرہ غازی خان اور دیگر شہروں کا رخ کیا۔ شروع میں ان ہیجڑوں نے شادی بیاہ کی تقریبات کا رخ کیا لیکن وہاں پر ان کی پذیرائی نہ ہو سکی اور انہوں

نے شادی بیاہ پر جانا کم کر دیا۔ دیہات کی طرح ان کو بچوں کی پیدائش وغیرہ پر شہروں میں کچھ نہیں مل سکتا تھا کیونکہ شہر میں ان کی کوئی پہچان نہ تھی اور لوگ پیدائش کے مواقع پر مسجد کے امام کو تو کچھ خیرات کر سکتے تھے انہیں کچھ دینے کو تیار نہ تھے اس لئے پیدائش کی کمائی بھی ان کے ہاتھ سے جاتی رہی۔ شروع میں ہیجڑوں نے میوزک گروپ بنائے اور تقریبات میں جدید سازوسامان کے ساتھ ناچ گانا شروع کیا لیکن بہتر پرفارمنس نہ ہونے کے باعث ان کا مذاق اڑایا گیا۔ لوگ ٹی وی۔ وی سی آر کے ذریعے روزانہ بہتر پرفارمروں کو دیکھتے تھے بھلا ہیجڑے بے چارے ان کو کیسے متاثر کر سکتے تھے۔ اس کام کو چلانے کیلئے ہیجڑوں نے ناچ کے دوران تھوڑی سی فحاشی کو بھی شامل کر لینے کی کوشش کی لیکن شادی کی مخلوط تقریبات میں ان کی اس حرکت کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا اور ان کو فحش قرار دے دیا گیا۔ دوسری طرف شادی بیاہ وغیرہ کی تقریبات میں ناچ گانے کیلئے طوائفوں نے باقاعدہ گروپ بنالیے تھے اور وہ نہ صرف ہیجڑوں سے بہتر پرفارمنس دیتیں بلکہ ان کے نسوانی خدوخال اور آواز نے ہیجڑوں کو مزید بے وقعت کر دیا۔ یہ طوائفیں ہیجڑوں سے کئی گنا زیادہ معاوضہ وصول کرتیں اور تقریب کے خاتمے پر اپنے جسم کا بھی سودا کرتیں۔ ہیجڑے بے چارے ان نعمتوں سے محروم تھے لہٰذا وہ شادی بیاہ کے زنانہ میوزیکل گروپوں کا بھی مقابلہ نہ کر سکے اور انہوں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ شہروں میں رہ کر غریب مزدوروں، دیہاڑی داروں اور نچلے درجے کے سرکاری ملازمین، سکولوں کالجوں کے لڑکوں، بس ڈرائیوروں اور کنڈیکٹروں کو سستے داموں جسم فراہم کر کے زندگی گزاریں۔ ان کی یہ کوشش البتہ کامیاب ہوئی اور ابتدائی طور پر ان کو کسی بڑی ناکامی یا کسی بڑے حریف کا سامنا کرنا پڑا۔ ہیجڑوں کی بہت بڑی تعداد چند روپوں کی خاطر گاہک کو خوش کر کے گاہکوں کی تعداد بڑھانے اور مہلک بیماریاں پھیلانے میں مصروف ہو گئی۔

لاہور کی ہیرا منڈی میں رہائش پذیر ایک ہیجڑے شاہد عرف گڈو نے بتایا کہ ہم طوائفوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے کیونکہ وہ عورتیں ہیں اور مردوں کو مکمل طور پر ہر چیز مہیا کرتی ہیں اور لوگ ان کے پاس جا کر خوش ہوتے ہیں اور انہیں بہت زیادہ پیسے دیتے ہیں

لیکن ہم طوائفوں سے زیادہ تربیت یافتہ ہیں اور ہم کو معلوم ہے کہ ہم نے اپنے گاہک کو کس طرح خوش کرنا ہے۔ جسمانی ملاپ کے دوران وہ خوشی کوئی طوائف کسی اپنے گاہک کو نہیں دے سکتی جو ہم اپنے گاہک کو مہیا کرتے ہیں۔ طوائف ہزاروں روپے وصول کرتی ہے لیکن ہم ایک سو روپے تک بھی گاہک کو مایوس نہیں کرتے۔ طوائف جتنی بھی طاقتور ہو، جوان ہو، وہ صرف دو یا تین مرد گاہکوں کو ہی مطمئن کر سکتی ہے جبکہ ایک صحت مند ہیجڑا درجن بھر لوگوں کو مطمئن کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور جتنے پیسے وہ درجن گاہکوں سے وصول کرے گا طوائف ایک گاہک سے اتنے پیسے لے لے گی۔ گذو ہیجڑے نے مزید کہا کہ بیماریاں طوائفوں کے ذریعے پھیلتی ہیں ہمارے ذریعے تو بیماری نہیں پھیلتی۔ ہم اپنا خیال رکھتے ہیں اور اگر گاہک جنسی ملاپ نہ بھی کرنا چاہے تو ہم اس کو مطمئن کر دیتے ہیں جبکہ ایک طوائف ایسا نہیں کر سکتی۔ یہ تو محض ایک ہیجڑے کا دعویٰ تھا اور اس دعویٰ میں چھپا ہوا ڈر آسانی سے محسوس کیا جا سکتا ہے جو ایک ہیجڑے اور اس کے روزگار کو طوائف سے لاحق ہے۔ تقریباً اسی طرح کے خیالات کا اظہار ایک طوائف کرتی ہے جو ہیجڑوں کو غیر فطری اور مصنوعی قرار دیکر رد کر دیتی ہے اور ہیجڑوں کے پاس جانے والوں کا مذاق اڑاتی ہے۔

مجھے ایک طوائف نے ہیرا منڈی کے علاقے بازار سمیاں میں اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے بڑے فخر کے ساتھ بتایا کہ ٹبی گلی اور بازار شیخوپوریاں میں ہیجڑوں نے طوائفوں کا جینا حرام کر رکھا ہے اور کئی طوائفوں نے تو یہ علاقہ چھوڑ دیا ہے۔ طوائف جتنی رقم اپنے گاہک سے طلب کرتی ہے ایک ہیجڑا اس سے دس گنا کم پیسوں میں راضی ہو جاتا ہے اس طرح ہیجڑوں نے طوائفوں کا کاروبار ٹھپ کر دیا ہے۔ لیکن میں نے بازار سمیاں میں کسی ہیجڑے کو نہیں آنے دیا۔ ٹبی پولیس کے ساتھ میرا رابطہ ہے اور وہ ہمیشہ میرا ساتھ دیتی ہے میرا احترام کرتی ہے کیونکہ میں نے ان کے "آرام" میں کبھی کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔ تھانیدار روزانہ میرا مہمان ہوتا ہے اور اس کے مہمانوں کیلئے کھانا اور لڑکیاں میرے اڈے سے جاتی ہیں اس لیے وہ بدلے میں ہیجڑوں کو چھتر مار کر میرے

علاقے سے نکال دیتا ہے۔ اس نے مزید بتایا کہ ہیجڑے کم محنت بڑے سخت جان واقع ہوئے ہیں، تھوڑے سے پیسوں میں سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں اور ظالم تھکنے کا نام نہیں لیتے۔ میں نے اس طوائف کو تجویز دی کہ اگر آپ اپنے ڈیرے پر تین چار ہیجڑوں کو بھی ملازم رکھ لیں تو آپ کا کاروبار مزید ترقی کر سکتا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ اس طرح لڑکیاں بھوکی مر جائیں گی ہمارے گاہک تو ہیجڑے کھینچ لیں گے اور لڑکیوں کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔

نتائج کچھ بھی ہوں ہیجڑوں کی یلغار کو روکنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ ہیجڑے اپنے اڈوں تک محدود نہیں رہے بلکہ وہ شام کے بعد تقریباً لاہور کے تمام بس شاپ اور اہم مقامات پر قبضہ کر لیتے ہیں اور لفٹ مانگ کر گاہک کو پھانسنے کی کوشش کرتے ہیں یہ الگ بات ہے کہ بعض اوقات انہیں خسارے کا سودا بھی کرنا پڑتا ہے جب کوئی طالب علم یا آوارہ لڑکا ان کو اپنے پاس لیجاتا ہے اور اپنے ساتھیوں کی مدد سے اس کے ساتھ زیادتی کرتا اور ہاتھ سے پیسے دینے کے بجائے الٹا اس کی جیب بھی صاف کر لیتا ہے۔ کوئی اس زیادتی کی پولیس رپٹ درج نہیں کرا سکتا کیونکہ وہ خود قانون کے مطابق ایک ناجائز دھندہ کر رہا ہے اور اس کو حدود کے مطابق طویل اور کڑی سزا سنائی جا سکتی ہے۔ کالجوں کے ہوسٹلوں میں مقیم طالب علم عموماً دھوکے کے ساتھ ان ہیجڑوں کو اپنے کمروں میں لے جاتے ہیں جہاں کئی کئی لڑکے ان کے ساتھ زبردستی کا مظاہرہ کرتے ہیں اس تشدد کے دوران کئی ہیجڑے یا تو اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے یا پھر شدید قسم کی ذہنی و نفسیاتی بیماریوں اور الجھنوں کا شکار ہو گئے لیکن کوئی بھی ان مجرم لڑکوں کو پوچھنے والا نہیں تھا۔

یہ ایک ایسا رجحان ہے جس کو روکا نہیں جا سکتا جب زیادتی کے شکار شخص نے شنوائی کیلئے کسی پولیس یا عدالت کی طرف رجوع نہیں کرنا تو اس صورت میں مجرموں کو سزا کیسے دی جا سکتی ہے۔ سماجی سطح پر ہیجڑے غالباً سب سے زیادہ قابل نفرت اور کمزور لوگ ہیں جن کی طرف کوئی بھی مائل ہونے کو تیار نہیں، لوگ راہ چلتے ان کا مذاق اڑاتے ہیں اور ان کے ساتھ دست درازی کرتے ہیں تو کوئی ان کو روکنے والا نہیں ہوتا۔ ان کے

ساتھ کسی قسم کی زیادتی کی صورت میں کون ان کا ساتھ دے گا۔ یہ ایک ایسا
جس کا پاکستان میں کوئی پرسانِ حال نہیں لوگ محض تفنن طبع کیلئے ان کو جا
پہنچاتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ بلا خوف تردید یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ ہیجڑے
عورتوں اور بچوں سے بھی زیادہ پر امن لوگ ہوتے ہیں خصوصاً جنوبی ایشیاء کے ممالک
میں جہاں ان کے کوئی حقوق نہیں۔ کوئی ایک بھی ادارہ ایسا نہیں جو ان کے ساتھ ہمدردی
کا اظہار کرے اور ان کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کو روکے یا ان کے سماجی و معاشرتی
حقوق کیلئے آواز بلند کرے بلکہ بعض اوقات تو سر عام ہیجڑوں کو تمسخر اور زیادتی کا نشانہ بنایا
جاتا ہے اور ایسی حرکت کرنے والے کو تماش بین تحسین کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ عام لوگوں
کو بس یہی معلوم ہے کہ ہیجڑوں کو صرف استعمال کیا جاسکتا ہے اور جس طرح دل چاہے ان
سے کام لیا جاسکتا ہے ان کے کوئی حقوق نہیں اور نہ ہی وہ پولیس اسٹیشن جاسکتے ہیں اور نہ
کسی قسم کا کوئی سماجی سہارا لے سکتے ہیں۔ ہیجڑوں کو کوئی اپنے پاس نوکری دینے کو تیار نہیں
ہوتا، عام حالات میں ان کے ساتھ میل ملاپ رکھنا بہت معیوب سمجھا جاتا ہے۔ ہیجڑوں
سے نفرت کا یہ عالم ہے کہ کسی بھکاری ہیجڑے کو کوئی خشیش دینے کو بھی تیار نہیں ہوتا۔
اس نفرت کا پس منظر مذہبی ہے کیونکہ مذہب میں ہیجڑوں کی کوئی گنجائش نہیں اور نہ ہی
ان کے بارے میں کوئی احکامات وغیرہ ملتے ہیں۔ عام مبلغین اور خطیب حضرات موقع بہ
موقع ہیجڑوں کو تنقید کا نشانہ بناتے رہتے ہیں کہ ان کی وجہ سے معاشرے میں بے راہ روی
پھیل رہی ہے بلکہ کراچی کے ایک معروف دینی سکالر نے یہاں تک کہہ دیا کہ ہیجڑوں کے
عام میل ملاپ پر پابندی عائد کی جائے اور حکومت کو چاہئے کہ وہ ان کیلئے ایسے مراکز قائم
کرے جہاں ان کو پابند رکھا جاسکے اور انہیں دینی تعلیم دی جائے تاکہ یہ بے راہ روی اور
فحاشی سے باز آسکیں اور اگر ہیجڑوں کو اسلامی معاشرے میں کھلی چھٹی دیدی گئی تو یہ معاشرہ
تباہ و برباد ہو جائے گا کوئی بھی پاکستان کو ایک صحیح اسلامی معاشرہ رکھنے والا ملک تسلیم نہیں
کرے گا۔ مذکورہ خطیب صاحب کے مشورے پر حکومت وقت نے عمل تو نہ کیا البتہ
ہیجڑوں کی فلاح و بہبود اور تحفظ کیلئے بھی کچھ نہ کیا اور یہ بے چاری بے ضرر مخلوق عام

، خیزی کی حد یہ ہے کہ آج تک ووٹر لسٹوں میں ہیجڑوں
یہ مرد ہیں یا عورت۔ الیکشن کے مواقع پر کوئی
سا کیونکہ وہ نہ تو کاغذات میں اپنے آپ کو عورت
۔ یہ مذکورہ دونوں کی خصوصیات پر پورا نہیں اترتا۔ اگر اس
ں ثابت کردے تو یقیناً وہ عورت اور مرد دونوں میں سے کسی ایک
د تو مشابہ ثابت نہیں کر سکتا۔ اس معاملے میں قانون بالکل خاموش ہے اور
ں لیلئے یہ بات ہی مضحکہ خیز ہے کہ ہیجڑہ بھی کسی جنس سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا
فیصلہ ہونا چاہئے کہ وہ کیا ہے، اس کا معاشرے میں کیا مرتبہ ہے اور اس کو کون کون سے
حقوق حاصل ہیں۔

پاکستان میں ہیجڑوں کی بڑی تعداد نے جسم فروشی کو باقاعدہ ایک دھندے یا کاروبار کی
سی حیثیت سے اپنایا ہے۔ ہیجڑوں نے اس کاروبار کو حتی المقدور وسعت دی ہے اور آئے
دن ان کا یہ کاروبار ترقی کر رہا ہے۔ انہوں نے اس حقیقت کا ادراک کر لیا ہے کہ ماضی کی
طرح پسماندہ علاقوں میں ان کی مانگ نہیں رہی۔ گنوار سے گنوار دیہاتی بھی ان کا گانا سننا
چاہتا ہے نہ ان کا ناچ دیکھنا چاہتا ہے۔ ذرائع ابلاغ کی ترقی نے ہیجڑوں کے قدرتی مصنوعی
پن کو بے دردی کے ساتھ اجاگر کیا ہے اور ہیجڑوں کو تیسرے بلکہ چوتھے درجے کی رذیل
مخلوق بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس رذالت اور گھٹیا درجہ بندی کا انہیں کوئی افسوس نہیں کیونکہ
ذرائع ابلاغ کی ترقی سے پہلے بھی ان کی کوئی خاص قدرت و منزلت نہ تھی بلکہ ایک تحقیر
اور تمسخر کا سامنا ان کو ہمیشہ کرنا پڑتا تھا۔ انہیں جس بات کی شدت کے ساتھ فکر لاحق
ہوئی وہ روزگار کے دن بدن کم ہوتے ہوئے مواقع ہیں۔ ہیجڑے بخوبی جانتے ہیں کہ وہ
عام مردوں کی طرح جسمانی مشقت نہیں کر سکتے اور نہ ہی وہ اپنے پیدائشی نقص کے
باعث اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکتے ہیں لہٰذا ان کو ایسی کوئی نوکری یا روزگار تلاش کرنا ہوگا جو
کم محنت کے باوجود اچھے مالی نتائج دے۔ اس لئے ان کا فوری رجحان اپنے مزاج سے ملتے
ہوئے ایسے پیشے کی طرف ہوا جو انہیں دیگر کاموں کی نسبت زیادہ آسان اور پیداواری

محسوس ہوا لہٰذا انہوں نے جسم فروشی کو باقاعدہ ایک پیشے کے طور پر اپنالیا۔

اس پیشے کو رواں دواں رکھنے کیلئے انہیں کسی خاص محنت کی ضرورت نہ تھی اس لئے ہر ہیجڑے نے بلا چون و چرا جسم فروشی کو گلے لگالیا۔ اس کام میں البتہ ان کو عمر اور فٹنس وغیرہ کے مسائل کا سامنا کرنا پڑا ہے جو زیادہ فٹ تھا اس نے زیادہ ترقی کرلی اور زیادہ عمر کے ہیجڑوں کو مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن ہیجڑوں کی مخصوص نفسیات نے اس موقع پر خاص کردار ادا کیا اور گروپ کی حیثیت میں رہنے کی ان کی جبلت نے زیادہ عمر کے ہیجڑوں کو فوراً قبول کرلیا اور ان کو اپنی برادری میں خصوصی کردار سونپ کر ان کی کفالت کی ذمہ داری اٹھالی۔ زیادہ عمر رسیدہ ہیجڑوں کو احتراماً گرو تسلیم کرلیا گیا اور انہیں برادری میں ایک چوہدری یا سردار کی سی حیثیت حاصل ہوگئی۔ گرو کو خاص عزت کا مقام دیا گیا اور گھمبیر مسائل تک کے فیصلے گرو کی صوابدید پر چھوڑ دیئے گئے۔ گرو کی حدود کا تعین زبانی طور پر اجتماعی آمادگی کے تحت وضع کئے گئے اصولوں کی بنیاد پر کیا گیا اور اس بات کا خاص اہتمام کیا گیا کہ گرو کی عزت اور احترام کو بہت زیادہ اہم سمجھا جائے۔ گرو کا کہا ہوا حرف آخر تسلیم کیا جائے اور گرو کو موت کے علاوہ کوئی چیز سرداری سے یا چودھراہٹ سے معزول نہیں کرسکتی۔ گرو نہ صرف ہیجڑوں کے آپسی مسائل کو سلجھاتا ہے بلکہ وہ پورے گروپ کے مالیاتی معاملات اور آمدنی کی مساوی تقسیم کے علاوہ گلی محلے کے جھگڑوں اور تنازعوں کو بھی حل کرتا ہے۔ ہیجڑے کی سالگرہ کے موقع پر یا عیدین کے مواقع پر خصوصی طور پر گرو کو قیمتی تحفے تحائف اور نقد رقوم دی جاتی ہیں۔ اس طرح ایک عمر رسیدہ ہیجڑہ جو عموماً بے یارومددگار ہوتا ہے اور سماجی بدنامی کے ڈر سے اس کے خاندان والے اس کو قبول کرنے سے ہچکچاتے ہیں وہ اپنے ہی جیسے لوگوں کے تعاون اور عزت افزائی کے باعث کسمپرسی کی زندگی سے بچ جاتا ہے اور اپنے سے محبت کرنے والوں اور خیال رکھنے والوں کے درمیان اپنی زندگی بسر کردیتا ہے۔ دراصل ہیجڑوں کا جمع ہونا اور ایک گروپ کی صورت میں رہنا ان کی حفاظت خود اختیاری کی کوشش کا ایک حصہ ہے اور یہ لوگ آپس میں مل کر ایک دوسرے کی حفاظت کرنے اور ایک دوسرے کو احترام دینے کا فیصلہ کرتے

ہیں جو کہ عموماً سماجی حوالے بلکہ ہر حوالے سے بہتر لوگ آپس میں نہیں کر سکتے۔ پورے وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ پاکستان میں آج تک کسی ہیجڑے نے کسی کو قتل نہیں کیا، گزند نہیں پہنچائی اور نہ ہی اپنے کسی بھائی بند کے ساتھ دھوکہ کیا یا اس کا مال کھایا ہے۔ عموماً ان کو کم فہم اور جاہل قرار دیا جاتا ہے لیکن سماجی سطح پر یہ لوگ عام لوگوں بلکہ نارمل لوگوں سے بہتر زندگی گزارنے کی سعی کرتے ہیں، زیادہ پر امن رہتے ہیں، ایک دوسرے کا زیادہ خیال رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کی حتی المقدور مدد کرتے ہیں جبکہ عام لوگ اس کے برعکس زندگی گزارتے ہیں۔

گُرو کا تقرر اور بہت زیادہ عزت و احترام دراصل سماجی خوف کے آگے بند ھ باندھنے کی معصومانہ کوشش محسوس ہوتی ہے۔ ہیجڑوں کو معلوم ہوتا ہے کہ عام لوگوں کی طرف سے کسی زیادتی کا ازالہ ان کا گُرو نہیں کر سکتا اور نہ کسی ادارے پر دباؤ ڈال کر وہ کوئی کام لے سکتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ ایک آدمی کی مرضی کے مطابق زندہ رہنے اور اس کی آؤ بھگت کرنے پر مکمل طور پر تیار ہیں اور خوشی محسوس کرتے ہیں۔ یہ دراصل ایک لڑی میں پروئے رہنے کی عادت ہے جو ایک دوسرے کو تحفظ فراہم کرتی ہے۔

کچن سے لیکر بیٹھک تک گُرو کی راجدھانی ہے، ڈیرے پر کوئی ایسی چیز نہیں پک سکتی جس کی پیشگی منظوری گُرو نہ دے چکے ہوں۔ کوئی شخص گُرو کی مرضی کے بغیر کسی ہیجڑے کو نہیں مل سکتا۔ گُرو ہیجڑوں کیلئے رکھیل کا بندوبست کرتا ہے اور خواہشمندوں کے انٹرویوز کرتا ہے۔ ہیجڑے کو رکھیل بنانے والے کو اگر گُرو ناپسند کردے تو وہ کسی بھی قیمت پر ہیجڑے کو اپنے تصرف میں نہیں لا سکتا۔ یہ گُرو کی مرضی اور رضامندی ہے کہ وہ کس کو کس کیلئے پسند کرتا ہے۔ گُرو کو جب یقین ہو جاتا ہے کہ اس کی زندگی ختم ہونے والی ہے تو وہ فوری طور پر اپنے جانشین کا اعلان کرتا ہے وہ اپنے ماتحتوں میں سے کسی ایک کو جانشین چنتا ہے لیکن اس کیلئے زیادہ عمر کا ہونا لازمی شرط ہے۔ تمام ہیجڑے اپنے ناچ گانے اور جسم فروشی کی کمائی گُرو کے سامنے ڈھیر کر دیتے ہیں گُرو ڈیرے پر موجود لوگوں میں اس رقم کو مساوی تقسیم کر دیتا ہے، چاہے یہ رقم کسی ایک کی ذاتی محنت کے باعث

کیوں نہ آئی ہو۔ جب ڈیرے پر پیسے آئیں گے تو ان کو ہمیشہ مساوی تقسیم کیا جائے گا۔ گرو ہی یہ فیصلہ کرتا ہے کہ ہیجڑہ بن کے گروپ میں شامل ہونے والے کا نیا نام کیا رکھا جائے اور کس کس کو گروپ میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ نئے شامل ہونے والوں کو ایک معمولی قسم کے آپریشن سے گزرنا پڑتا ہے۔ ہیجڑوں کا مخصوص اور خفیہ ڈاکٹر نئے شامل ہونے والے کا آپریشن کرتا ہے اور اس کے اعضاء کی مردانہ ساخت کو ختم کر دیتا ہے۔ آپریشن کا سارا خرچ گرو کے حکم پر تمام ہیجڑے برداشت کرتے ہیں اور آپریشن شدہ شخص کی بہت زیادہ خاطر مدارت کی جاتی ہے اور اگر تازہ ہیجڑہ شادی شدہ ہو اور اس کے لواحقین میں بیوی کے علاوہ اولاد بھی ہو تو اس کی اولاد کی کفالت ہیجڑوں کی اس ٹولی کے ذمہ ہوتی ہے جن میں آختہ ہو کر مذکورہ شخص شامل ہوا تھا۔ ایسی مثالیں عموماً کم ملتی ہیں کہ ایک شادی شدہ بلکہ صاحب اولاد شخص نے اچانک ہیجڑہ بننے کا ارادہ کر لیا اور آپریشن کروالیا لیکن صرف لاہور کے بازار حسن اور اندرون بھاٹی گیٹ کے علاقوں میں 8 ایسے ہیجڑے مل جاتے ہیں جنہوں نے شادی شدہ اور صاحب اولاد ہوتے ہوئے ہیجڑہ بننا پسند کیا اور اپنی اولاد اور خاندان کو چھوڑ کر آپریشن کروا کے ہیجڑوں میں شامل ہو گئے۔ طارق عرف شازیہ نامی ہیجڑے نے مجھے بتایا کہ اس کے اندر کئی برسوں سے یہ خواہش انگڑائیاں لے رہی تھی کہ وہ زنانہ روپ اختیار کر لے بلکہ وہ گھر والوں خصوصاً بیوی کی عدم موجودگی میں کمرے میں بند ہو کر زنانہ لباس پہنتا اور بناؤ سنگھار کرتا۔ اس نے مزید بتایا کہ مجھے مرد اچھے نہیں لگتے لیکن نوجوان لڑکیاں میری بہت بڑی کمزوری ہیں اور اب میں نوجوان لڑکیوں سے مل سکتا ہوں اور ان سے بات چیت کر سکتا ہوں لیکن آپریشن کے بعد میں اس قابل نہیں رہا کہ ان لڑکیوں سے جنسی تعلقات قائم کر سکوں۔ شازیہ نامی اس چھبرے ہیجڑے نے مزید بتایا کہ میرے ساتھی جسم فروشی کا دھندہ کرتے ہیں لیکن مجھے یہ دھندہ پسند نہیں اور نہ ہی میرے اندر کوئی ایسی جنسی خواہش ہے جس کیلئے کسی مرد کی ضرورت پڑے۔ مجھے آج بھی نوجوان لڑکیوں سے ملنے، ان سے باتیں کرنے اور ان کے قریب جانے کا شوق ہے جس کی بڑی حد تک تکمیل ہیجڑہ بننے کے بعد ہونا شروع ہو گئی ہے۔

اب لڑکیاں مجھ سے خوفزدہ نہیں ہوتیں اور نہ ہی مجھ سے پردہ کرتی ہیں میں ان کا رازدان ہوں اور وہ مجھے ہر بات بتا دیتی ہیں۔ میں لڑکیوں کے پیغامات ان کے عاشقوں تک پہنچاتا ہوں اور مجھے ضرورت کے مطابق پیسے ملتے رہتے ہیں۔ شازیہ نامی اس ہیجڑے نے پچھلے دنوں بازار شیخوپوریاں ہیرا منڈی لاہور میں گوشی نامی ایک گُرو کی شاگردی اختیار کر لی ہے اور اب باقاعدگی کے ساتھ گوشی کے ڈیرے پر بیٹھتا ہے۔ اس کو یقین ہے کہ وہ کبھی بھی جسم فروشی کی طرف مائل نہیں ہوگا اور نہ اس کو ضرورت پڑے گی اس کی پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ گوشی کے ڈیرے پر سیکرٹری کے فرائض سرانجام دے کیونکہ وہ میٹرک پاس ہے اور لکھنا پڑھنا اچھی طرح جانتا ہے۔ اب شازیہ نامی یہ ہیجڑا آنے اور جانے والے گاہکوں کا حساب رکھتا ہے اور گاہکوں کی سہولت کیلئے مستعد رہتا ہے۔ گُرو کی عدم موجودگی میں رقم کا حساب رکھتا ہے اور روزمرہ کے اخراجات کیلئے رقم مہیا کرتا ہے۔ بجلی کا بل، فون کا بل اور گیس کے بلوں کی ادائیگی بھی اس کی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ ڈیرے کا کرایہ مالک مکان کو ادا کرنے کے ساتھ ساتھ وہ گُرو اور دوسرے ہیجڑوں کو کاروبار بہتر بنانے اور اڈے کی تشہیر کیلئے مفید مشورے بھی دیتا ہے۔

گوشی نامی گُرو کے بارے میں شازیہ نامی ہیجڑے نے بتایا کہ گوشی پانچ وقت کا نمازی ہے اور ایک مکمل ایماندار ہیجڑہ ہے وہ کسی کا دل نہیں دکھاتا اور نہ کسی کو تکلیف میں دیکھنا چاہتا ہے۔ تمام ہیجڑے اس کے حکم پر جان قربان کر دینے کو تیار رہتے ہیں کیونکہ گوشی کی وجہ سے نہ صرف ان کے ڈیرے کی عزت ہے بلکہ ان کی اپنی بھی عزت ہے۔ گوشی نے پچھلے دنوں زنانہ لباس پہننا ترک کر دیا اور اب وہ مردانہ وضع قطع کا لباس پہنتا ہے اور سگریٹ نوشی کرتا ہے۔ پورے پنجاب کے ہیجڑے گوشی کو استاد مانتے ہیں کیونکہ اس نے ہیجڑوں کو منظم کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اگر گوشی کو ایک کروڑ روپے کی ضرورت بھی پڑے تو پورے پنجاب کے ہیجڑے ایک گھنٹے میں اس کو ایک کروڑ روپیہ اکٹھا کر کے دے سکتے ہیں کیونکہ گوشی ہی نے ہیجڑوں کو ایک دوسرے کا ساتھی بنایا ہے اور دھڑے بندی کی اندرونی سیاست کا خاتمہ کیا ہے۔

لاہور میں ہیجڑوں کے اڈے

پہلے یہ بتایا جا چکا ہے کہ 90ء کے عشرے میں پاکستان میں ہیجڑوں نے باقاعدہ اور منظم طریقے سے جسم فروشی کے دھندے کو اپنایا اور مختلف شہروں میں آباد طوائفوں کو اپنے اپنے علاقے چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا۔ شروع میں لاہور کو ہیجڑوں نے اپنا مرکز بنایا اور ہیرا منڈی اور اس کے گردونواح میں مکانات کرائے پر لیکر رہنا شروع کیا۔ یہ ہیجڑے سرکس اور موت کے کنویں وغیرہ پر ناچ گا کر اپنا پیٹ پالنے لگے لیکن رفتہ رفتہ ان کا یہ دھندہ ماند پڑنے لگا کیونکہ سرکس اور موت کے کنویں وغیرہ کم ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ان ہیجڑوں نے لاہور کے بازار حسن کا رخ کیا اور تاریک گلیوں میں نہایت معمولی کرائے پر مکان حاصل کر لئے۔ عموماً تین سے چار ہیجڑے ایک چھوٹے سے کمرے میں رہائش اختیار کرتے اور ہیرا منڈی میں تماش بینوں کی حیثیت سے آنے والے غریب لوگوں کو پھانسنے کی کوشش کرتے۔ یہ ہیجڑے اپنے کمرے کے دروازے میں کھڑے ہو جاتے اور اندر روشنی بجھا دیتے تاکہ گاہک کو نظر آئے بغیر سیٹی وغیرہ بجا کر اپنی طرف متوجہ کیا جائے۔ بعض ہیجڑے اس موقع پر چوڑیاں یا گھنگرو وغیرہ چھنکاتے اور اس تجسس کو برقرار رکھتے جو گاہک کے دل میں آواز کے باعث پیدا ہوتا۔ گاہک عموماً اس آواز کو نسوانی تصور کرتا اور اندھیرے کمرے میں چلا جاتا، اس کو عورتوں کے سے چمکدار لباس میں شرماتا لجاتا ہوا ہیجڑہ نظر آتا۔ زیادہ تر گاہک غصے میں باہر آجاتے جبکہ کچھ شوقین مزاج بہت کم معاوضے کی آفر سن کر ہیجڑے ہی سے زور آزمائی کرنے کا فیصلہ کرتے۔ اس طرح ہیجڑوں نے لاہور کے بازار حسن میں اپنے "کاروبار" کا آغاز کیا۔ شروع کے دو تین سال میں ان ہیجڑوں نے اپنے مستقل گاہکوں کی ایک اچھی خاصی تعداد پیدا کر لی اور میوزک گروپ تشکیل دے دیئے یہ میوزک گروپ نوخیز ہیجڑوں کے ساتھ شادی بیاہ کے مواقع پر گاتے ناچتے اور ناچ گانے سے فارغ ہو کر جسم فروشی کا نسبتاً زیادہ معاوضے والا دھندہ کرتے۔ رفتہ رفتہ ان کے اڈوں میں اضافہ ہونے لگا اور ایک وقت ایسا آیا کہ صرف ہیرا منڈی لاہور کے مختلف

علاقوں میں ان کے 12 اڈے تھے اور ان اڈوں کے ساتھ ساتھ ٹبی گلی، حیدری سٹریٹ، تیواں چیت رام روڈ، کوچہ شہباز خان اور شیخوپوریاں میں پچاس کے قریب انفرادی اڈے تھے جہاں ایک کمرے میں ایک یا دو ہیجڑے رہائش پذیر تھے جو جسم فروشی کے کاروبار سے منسلک تھے۔

1: گوشی کا اڈہ

اندرون بھاٹی گیٹ کے رہائشی محمد گوہر عرف گوشی کی عمر اس وقت تقریباً پچاس سال ہے۔ روزانہ کی شیو نے تقریباً اس کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے اور وہ دونوں رخساروں میں پڑ جانے والے گڑھوں میں کریم اور پاؤڈر بھر کر اپنے چہرے کو نارمل بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کو دیکھتے ہی سب سے پہلا احساس یہ ہوتا ہے کہ اس نے پوری کوشش کے ساتھ اپنے ماتھے پر محراب بنائی ہے تاکہ اس کے نمازی ہونے کا یقین کیا جاسکے۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں تقریباً سات موٹی موٹی انگوٹھیاں ہیں جن میں قیمتی پتھر جڑے ہوئے ہیں۔ گوشی کہتا ہے: "میرا اڈہ اس وقت پورے پاکستان کے ہیجڑوں کا مرکز ہے اور وہ میرے ڈیرے کو سب سے بڑا ڈیرہ اور مجھے اپنا گرو مانتے ہیں۔" تقریباً ایک سال پہلے گوشی نے انکم ٹیکس والوں کے خوف سے اپنے مکان کی پیشانی سے "گوشی میوزیکل گروپ" کا بورڈ اتار دیا تھا۔ اس نے کہا: "اب بورڈ کی ضرورت نہیں رہی کیونکہ پورے ملک کے ہیجڑوں کو معلوم ہے کہ استاد گوشی کہاں رہتا ہے اور ویسے بھی میرا اڈہ سب سے پرانا اڈہ ہے"۔

گوشی نے اپنا اڈہ 92ء میں قائم کیا اس وقت اس کے پاس صرف دو ہیجڑے تھے جو لکی ایرانی نامی سرکس میں کام کرتے تھے۔ گوشی کے بقول: "میرے دونوں ساتھی چندا اور نازو لکی ایرانی سرکس کی جان سمجھے جاتے تھے اور وہ جب اپنے نازک جسموں کے ساتھ سرکس میں ڈانس کرتے تو کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ہیجڑے ہیں۔ میرے کہنے پر انہوں نے 93ء میں سرکس چھوڑ دی اور لاہور آگئے۔ ہم تینوں نے مل کر اپنا ایک

میوزیکل گروپ بنایا اور شادی بیاہ وغیرہ پر ناچنے گانے لگے۔ تقریباً تین ماہ بعد ہمارے گروپ کو چار اور ساتھی مل گئے اور یہ گروپ ترقی کرنے لگا۔ شادی بیاہ اور سالگرہ کی تقریبات میں لوگ بڑے شوق کے ساتھ ہم کو بلاتے اور ہماری پرفارمنس سے خوش ہو کر ہزاروں روپے دیتے۔ اگلے دو تین برسوں میں ملتان، شیخوپورہ اور اوکاڑہ کے کئی لوگوں نے ہیرا منڈی میں اپنے گروپ بنالئے اور ناچنے گانے لگے۔ اس وقت درجن سے زائد اڈے ہیں لیکن ہمارا اڈہ سب سے پرانا اور سب سے زیادہ مشہور ہے۔" گوشی نے مزید بتایا کہ اس نے اپنے ساتھیوں پر بہت زیادہ محنت کی ہے اور ان کو ناچ گانے کے ساتھ ساتھ گفتگو کے آداب اور دوسری ضروری چیزوں کی تربیت دی ہے۔ گرو کی عزت کرنا ان کا اولین فرض ہے کیونکہ گرو کے بغیر ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ گرو ان کا خیال اولاد کی طرح رکھتا ہے اور ان کو کوئی تکلیف نہیں ہونے دیتا۔

گوشی کا خیال ہے کہ جس طرح ایک طوائف ناچ گانا اور جسم فروشی کا دھندہ ساتھ ساتھ چلاتی ہے اس طرح ہیجڑے کو بھی حق حاصل ہے کہ وہ ناچ گانے کے ساتھ ساتھ اپنی مرضی سے جسم فروشی کا دھندہ جاری رکھ سکے اور اگر وہ آزادانہ جسم فروشی کو پسند نہیں کرتا تو پھر کسی ایک گاہک کی بالکل اسی طرح رکھیل بن جائے جس طرح ایک طوائف کسی چاہنے والے کی مستقل رکھیل بن جاتی ہے۔ گوشی نے دعویٰ کیا کہ اس کے ڈیرے پر 27 دیگر ہیجڑے رہائش پذیر ہیں، ان میں سے کچھ تو بالکل جسم فروشی سے نفرت کرتے ہیں اور اپنے آپ کو ناچ گانے تک محدود رکھتے ہیں کیونکہ 27 میں سے 18 لوگ چھبرے ہیں۔ واضح رہے کہ جو لوگ آپریشن کروا کر ہیجڑے بنتے ہیں ان کو "چھبرا" اور جو پیدائشی ہیجڑے ہوتے ہیں ان کو "اکوا" کہا جاتا ہے۔ استاد گوشی کے مطابق چھبرے جسم فروشی کے عادی نہیں ہوتے اور عموماً اس طرف مائل بھی نہیں ہوتے۔ اگر کوئی باقاعدہ جسم فروشی کرتا ہے تو وہ ضرور اکوا ہوگا کیونکہ اکوا لوگ جسم کے علاوہ تمام تر نفسیات عورتوں کی سی رکھتے ہیں۔ جسم اور اس کی نمائش کی طرف مائل ہونا ایک طرح سے ان کا فطری عمل ہوتا ہے۔ گوشی کے مطابق بعض ایسے اکوا لوگ بھی ہیں

جن کے سوائے اعضائے پوشیدہ کے تمام اعضاء عورتوں کی طرح ہوتے ہیں حتیٰ کہ ان کی چھاتیاں بھی عورتوں کی طرح نشوونما پاتی ہیں۔

گوشی کا اڈہ ہیجڑوں کی جسم فروشی کا سب سے بڑا مرکز ہے یہاں پر موجود ہیجڑے ہر وقت بناؤ سنگھار کئے رہتے ہیں اور عام طوائفوں کی طرح کے مشاغل اختیار کئے رکھتے ہیں۔ جب بھی کوئی گاہک اڈے میں داخل ہوتا ہے ہیجڑے فوراً اس کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور اس کو اپنی اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ گاہک کو فوری طور پر ہیجڑوں کے کمرے میں لے جایا جاتا ہے اور باری باری تمام ہیجڑوں سے متعارف کرایا جاتا ہے گاہک کو ہیجڑوں کے خود اختیار کردہ ناموں سے مرعوب کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جو عموماً انڈین اور پاکستانی اداکاراؤں کے نام ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر گوشی کے اڈے پر ریکھا، ہیمامالنی، کرشمہ کپور، تبو، کاجل اور اسی طرح ریما، نرگس، انجمن، گوری، میرا، ریشم اور ان سے ملتے جلتے نام آسانی سے مل جاتے ہیں۔ گاہک کو اصل نام سے واقف نہیں کرایا جاتا اور اس کی ٹھنڈی بوتل یا دودھ پتی کے ساتھ تواضع کی جاتی ہے۔ گاہک جس کو بھی پسند کرتا ہے وہ ہنسی خوشی گاہک کو لیکر مخصوص کمرے میں چلا جاتا ہے۔ جیسے ہی گاہک کمرے میں پہنچتا ہے سیکرٹری پیشگی معاوضہ وصولی کیلئے آجاتا ہے۔ اس موقع پر عموماً بھاؤ تاؤ ہوتا ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ گاہک کو واپس نہ جانے دیا جائے۔ گوشی نے بتایا کہ عموماً لوگ ہمارے ساتھ زیادتی تو کرتے ہیں، جتنا ریٹ ان کو بتایا جاتا ہے اس پر پہلے راضی ہو جاتے ہیں لیکن بعد میں وہ ادائیگی مکمل نہیں کرتے۔ لوگوں کو معلوم ہوتا ہے کہ ہم جھگڑا نہیں کر سکتے اور نہ ہی اس طرح کی کسی بات کو اڈے سے باہر جانے دیتے ہیں کیونکہ اس طرح ہماری بے عزتی ہوتی ہے اور دوسرے لوگ ہمارا مذاق اڑاتے ہیں۔ گاہک زیادہ تر معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور ہم کو سنگین نتائج کی دھمکیاں دیتے ہیں۔ اکثر اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی طاقتور شخص ہمارے ہاں مہمان آئے تو ہم اس سے ڈرتے ہیں کہ وہ زبردستی کسی کو بھی اپنے ساتھ لے جاسکتا ہے۔ اس نے بتایا کہ 94ء میں ایک وزیراعظم کے قریبی عزیز نے

میرے پورے ڈیرے کو اپنے گھر کھانے پر دعوت دی۔ ہم انکار نہیں کر سکتے تھے لہٰذا سب لوگ تیار ہو کر مذکورہ شخص کے ہاں چلے گئے۔ جب ہم واپس آنے لگے تو اس نے ہمارے ساتھیوں میں سے ایک "شہزادی" نام کے ہیجڑے کو اپنے پاس رکھنے کا اعلان کیا۔ بے چارہ معصوم اور کم عمر ہیجڑہ جو ملتان سے ہمارے ہاں مہمان آیا تھا وہ رونے لگا لیکن ظالم شخص کو ترس نہ آیا اور اس نے اپنے مسلح ساتھیوں کو حکم دیا کہ شہزادی کو اندر لے جائیں۔ چار سال تک شہزادی اس کے پاس رہی اور پھر جب اس کا دل شہزادی سے بھر گیا تو اس نے ایک سرکس کمپنی پر ملازم ایک ہیجڑے کو اپنے پاس رکھ لیا اور شہزادی کو رہائی نصیب ہوئی۔ کوہاٹ کے رہنے والے اس شہزادی نام کے ہیجڑے نے میرے بھرپور اصرار کے باوجود میرے ساتھ کوئی بات نہیں کی۔ میں نے اس کو کریدنے کی کوشش کی تو گوشی نے مداخلت کرتے ہوئے مجھے منع کر دیا اور ساتھ ہی کہا کہ آپ اس شخص کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے خواہ مخواہ ہمارے لئے مصیبت کھڑی کریں گے۔

گوشی کے اڈے پر صبح 10 بجے سے رات 10 بجے تک جسم فروشی کا دھندہ چلتا ہے۔ لوگ دھڑا دھڑ آتے ہیں اور ہیجڑوں کے ساتھ کچھ وقت گزار کر واپس چلے جاتے ہیں۔ گاہکوں میں سے کسی ایک نے بھی میرے ساتھ بات نہیں کی اور میرا سامنا کرنے سے کتراتے رہے۔ گوشی نے مجھے بتایا کہ اگر لوگوں کو ہم تحفظ نہ دیں تو پھر یہ ہمارے ڈیرے پر کبھی نہ آئیں۔ ہم پولیس کو بھی ماہانہ دیتے ہیں تاکہ وہ ہمیں تنگ نہ کرے۔ اس نے مزید بتایا کہ پولیس والے بھی کبھی کبھار ہمارے ڈیرے پر آجاتے ہیں لیکن آج تک کسی پولیس والے نے یہاں پر کسی ہیجڑے کے ساتھ وقت نہیں گزارا نہ ہی کبھی کسی کو تنگ کیا ہے۔ میرے استفسار کے باوجود گوشی نے پولیس کے ماہانہ کی شرح نہیں بتائی اور اس بات کو راز رکھنے کی تاکید کی۔ جب میں نے ٹبی گلی پولیس کے ایک عہدیدار سے مردانہ جسم فروشی کے ان اڈوں کے بارے میں پوچھا تو اس نے صاف انکار کر دیا کہ اس طرح کا کوئی دھندہ ہیرا منڈی یا ٹبی گلی میں نہیں ہوتا۔ اگر کہیں ایسا مکروہ کام ہوتا ہے تو پولیس کو بتایا جائے ہم فوراً ایکشن کریں گے اور ایسا ناپاک کام کرنے والوں کو قرار واقعی سزا دیں گے۔

لیکن اس دوران مذکورہ پولیس آفیسر کی آنکھوں میں جھوٹ اور مکر و فریب ناچتا صاف دکھائی دیتا رہا۔ میں چونکہ معلومات اکٹھی کرنا چاہتا تھا اس لئے میں یہ ثابت نہیں کر سکتا تھا کہ کس کس گلی میں مردانہ جسم فروشی کا دھندہ پولیس کی زیر نگرانی عروج پر ہے۔

گوشی کے اڈے کے سیکرٹری کے بقول روزانہ تقریباً پانچ ہزار روپے کی آمدن ہوتی ہے لیکن اخراجات کا تناسب بھی بہت زیادہ ہے۔ اس کے مطابق زیادہ سے زیادہ ریٹ پانچ سو روپے جبکہ کم سے کم ایک سو روپے ہے۔ گاہکوں کی تعداد میں عموماً سردیوں میں اضافہ ہو جاتا ہے جبکہ تہواروں کے موقع پر بھی زیادہ لوگ ہیرا منڈی کا رخ کرتے ہیں سیکرٹری کے بقول داتا صاحب کے میلے کے موقع پر اتنے زیادہ گاہک آجاتے ہیں کہ ہم کو بعض اوقات کرائے پر ہیجڑے لانا پڑتے ہیں اور ہم اوکاڑہ، ملتان، فیصل آباد اور قصور سے ہیجڑوں کو خصوصی طور پر لاہور بلوا لیتے ہیں۔ اس موقع پر نہ صرف ہماری آمدن بڑھ جاتی ہے بلکہ اخراجات میں بھی بے تحاشہ اضافہ ہو جاتا ہے۔

گوشی کے اڈے پر موجود ہر شخص ایڈز جیسے موذی مرض کے بارے میں تو جانتا ہے لیکن اس کیلئے حفاظتی تدابیر نہیں کرتا۔ کوئی بھی ہیجڑا اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا اور نہ ہی حفاظتی تدابیر اختیار کرنے کا کوئی ارادہ رکھتا ہے۔ گوشی نے بتایا: "ہمارا اپنا ڈاکٹر ہے، میں اس کا نام نہیں بتا سکتا کیونکہ ہمارا اس کے ساتھ نام نہ بتانے کا معاہدہ ہے۔ وہ لاہور کا بہت مشہور سرجن ہے ہم اپنے لوگوں کو ہیجڑہ بنانے کیلئے اس سے آپریشن کرواتے ہیں اور وہ ہر ماہ ہمارے ساتھیوں کا طبی معائنہ کرتے ہیں اگر کوئی بیمار ہو جائے تو فوراً اس کو ان کے پاس لے جایا جاتا ہے۔ اس لئے ہم تمام لوگ پوری طرح صحت مند ہیں اور یہاں پر کسی بیماری کا خدشہ نہیں۔" گوشی کے اڈے پر انفرادی کمائی کا کوئی تصور نہیں گاہکوں سے پیسے سیکرٹری وصول کرتا ہے جبکہ گاہک کی طرف سے کسی ہیجڑے کو دی جانے والی اضافی بخشیش بھی سیکرٹری کے پاس پہنچ جاتی ہے اور وہ اس کو ساری رقم میں شامل کر لیتا ہے۔ رات کو اڈے کی بندش کے بعد سیکرٹری ایک کاغذ پر حساب کتاب لکھ کر گرو کے پاس لے جاتا ہے۔ اخراجات کے بعد باقی بچ جانے والی رقم گرو تمام ہیجڑوں میں مساوی طور پر

تسیم کر دیتا ہے۔ ہیجڑوں کی بڑی تعداد نہایت فضول خرچ واقع ہوئی ہے۔ یہ لوگ اپنی تما
کمائی اعلیٰ قسم کے کپڑوں اور میک اپ کے سامان پر خرچ کر دیتے ہیں۔ تقریباً تمام
ہیجڑے زیورات کے شیدائی ہوتے ہیں۔ نئے نئے ڈیزائن اور سٹائل ان کی کمزوری ہوتے
ہیں۔ گوشی نے بتایا کہ فارغ اوقات میں ہیجڑے زیادہ تر وی سی آر پر بھارتی فلمیں دیکھتے
ہیں، موسیقی سنتے ہیں یا پھر سلائی کڑھائی کرتے ہیں۔

گوشی کے اڈے پر 7 ہیجڑے ایسے ہیں جو مستقل رکھیلیں ہیں۔ یہ ساتوں ہیجڑے
ایک خاص ماہانہ معاوضے پر اپنے اپنے چاہنے والوں کیلئے مختص ہیں۔ ان کو معمول کی جسم
فروشی کی اجازت نہیں اور نہ ہی یہ اپنے اپنے "گریئے" کی مرضی کے بغیر ناچ گا سکتے
ہیں۔ جو آدمی کسی ہیجڑے کو رکھیل رکھتا ہے۔ اس کو ہیجڑے اپنی زبان میں "گریا" کہتے
ہیں۔ گریا کا انتخاب عموماً ہیجڑے خود کرتے ہیں۔ جبکہ اس کے ساتھ ماہانہ معاوضہ سمیت
دیگر شرائط طے کرتا ہے۔ گوشی کے بقول ڈیرے پر موجود جن ہیجڑوں نے اپنے
"گریے" رکھے ہوئے ہیں وہ بہت خوش ہیں اور ماہانہ معاوضہ کے عوض اور تہواروں کے
مواقع پر تحفے تحائف کے بدلے وہ اپنے جسم کو صرف گریئے کیلئے محفوظ رکھتے ہیں۔ گریا
ہر چھٹی کے دن ان کا مہمان ہوتا ہے اس کیلئے اعلیٰ قسم کے کھانے کے علاوہ اس کی
ضرورت کی ہر چیز کا خصوصی دھیان رکھا جاتا ہے۔ معاہدہ کرتے وقت گریئے اور رکھیل
کے ملنے کے ایام کا فیصلہ کیا جاتا ہے اور عیدین کے موقع پر گریے کی طرف سے رکھیل
کو دیئے جانے والے تحائف کا تعین کیا جاتا ہے۔ عموماً ان مواقع پر سونے کے زیورات
کے علاوہ کپڑے اور جوتے وغیرہ تحائف کے طور پر قبول کئے جاتے ہیں۔ مگر کوئی گریا اپنی
خوشی سے رکھیل کو کوئی بھی تحفہ جب چاہے دے سکتا ہے۔ البتہ گریے کو اجازت نہیں کہ
وہ رکھیل کو اڈے سے کسی اور جگہ لے جا سکے کیونکہ رکھیل کے اغواء کا خطرہ ہوتا ہے اس
لئے یہ اصول بنا دیا گیا ہے کہ ہر صورت میں دونوں کی ملاقات اڈے کے مخصوص کمرے
میں ہوگی، اس کے علاوہ کہیں بھی نہیں۔ رکھیل عموماً ایک سال کیلئے رکھا جاتا ہے اور ایک
ماہ کا معاوضہ بطور ایڈوانس لیا جاتا ہے۔ گوشی کے بقول اس کے اڈے پر سب سے مہنگا

معاہدہ دس ہزار روپے ماہانہ کا ہے۔ اس کے ڈیرے کے ایک ہیجڑے نے جس کی عمر صرف چودہ سال ہے ایک جیولر کو اپنا گریبان رکھا ہے۔ جیولر اس کو نہ صرف بروقت ماہانہ ادا کرتا ہے بلکہ تہواروں پر تحائف سے لاد دیتا ہے۔ گوشی نے اس ''دس ہزاری' ہیجڑے کا نام ظاہر کرنے سے معذوری ظاہر کی اور اس کو اپنے اڈے اور گاہک کا کاروباری راز بتایا۔ گوشی کے بقول اس کے اڈے کا سب سے کم معاوضہ وصول کرنے والا ہیجڑہ چار ہزار روپے پر ایک رکشہ ڈرائیور کی رکھیل ہے۔ رکشہ ڈرائیور اس کو دل و جان سے چاہتا ہے اور تہواروں کے موقع پر اس کو بے تحاشہ تحائف دیتا ہے۔ گوشی نے مزید بتایا کہ رکشہ ڈرائیور کی رکھیل کی عمر بیس سال ہے اور اس کو رکھیل بنتے ہوئے یہ ساتواں سال ہے۔

میرے اصرار پر گوشی نے اس ''چار ہزاری'' رکھیل کو مجھ سے ملوا دیا لیکن اس کا نام صیغہ راز میں رکھا۔ تقریباً پچیس سال کے اس موٹے تازے ہیجڑے میں، میں نے کسی قسم کی کشش کی رمق بھی محسوس نہیں کی۔ موٹی اور بھدی آواز والے اس ہیجڑے نے اپنے آپ کو میک اپ میں غرق کر رکھا تھا جبکہ گرمی کے باعث اس کے پسینے چھوٹ رہے تھے جو اس کے چہرے پر جمی سفید پاؤڈر کی تہہ کو اپنے ساتھ بہاتے ہوئے کالی لکیریں کھینچ رہے تھے۔ اس ہیجڑے نے مجھے بتایا کہ اس کا رکشہ ڈرائیور گریا اس سے بہت محبت کرتا ہے اور اس کی تمام ضروریات کو فوراً پورا کرتا ہے۔ اس کے بقول وہ شادی شدہ ہے اور دو بچوں کا باپ ہے لیکن اس کو میرے ساتھ بہت زیادہ محبت ہے۔ ہر ہفتے کی شام وہ میرا مہمان ہوتا ہے اور ساری رات ہم ہنسی خوشی گذار دیتے ہیں۔ آج تک اس نے مجھے ناراض نہیں کیا اور نہ ہی میں نے کبھی اس کا دل دکھایا ہے۔ دراصل ہم دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ بہت محبت ہے۔ وہ ہر ماہ کی پانچ تاریخ کو معاوضہ میرے گرو کے سپرد کرتا ہے اور میرے لئے بہت اعلیٰ قسم کی مٹھائی تحفے میں لیکر آتا ہے۔ میں اس کو دباتا ہوں اور اس کی خدمت کرنے کی حتی المقدور کوشش کرتا ہوں۔

ایک قریبی دکاندار نے مجھے بتایا کہ ان ہیجڑوں نے پورے بازار میں گند ڈال رکھا

ہے کیونکہ یہ لوگ انتہائی کم پیسوں سے سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں لہٰذا ہر قسم کے لوگ ان کے پاس آتے ہیں۔ ان کی وجہ سے پورا علاقہ بدنام ہو گیا ہے روزانہ شام کو رکشہ ڈرائیور، پھیری لگانے والے اور اٹھائی گیرے یہاں جمع ہو جاتے ہیں اور ان کا ہلہ گلہ اہل محلہ کیلئے ناقابل برداشت ہوتا ہے۔ حکومت کو چاہئے کہ وہ اس غیر اسلامی فعل کو روکے کیونکہ یہ لوگ ایک پوری نسل کو تباہ کر رہے ہیں۔ یہ اسلامی ملک ہے جہاں غیر اسلامی حرکات اور فحاشی کا بازار گرم ہے۔ اس دکاندار کو افسوس ہے کہ اس نے ایک ایسے علاقے میں اپنا کاروبار شروع کر دیا ہے جہاں ہر طرف فحاشی اور عریانی ہے اور لوگ گناہوں میں لتھڑے ہوئے ہیں: "میں ان کو سودا نہیں دینا چاہتا لیکن کیا کروں مجبوری ہے ان کے علاوہ اب اس علاقے میں کوئی گاہک ہی نہیں رہا۔" یہ دکاندار اب سوچ رہا ہے کہ وہ دکان فروخت کر کے پہلے حج کرے اور پھر کوئی ایسا علاقہ تلاش کرے جہاں اس طرح کے لوگوں سے واسطہ نہ پڑے تاکہ وہ اپنے بچوں کیلئے پاک صاف روزی کما سکے۔

بہر حال ان سب اعتراضات اور ناقابل برداشت باتوں کے باوجود گوشی کا اڈہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ قائم و دائم ہے اور آئے روز اس کے گاہکوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ وہ مطمئن ہے اور مسرور بھی کیونکہ وہ اپنے درجنوں ساتھیوں سمیت ایک خوشگوار اور بہتر زندگی گزار رہا ہے۔ "اگر ہیجڑے اس معاشرے میں جسم فروشی کر کے اور ناچ گا کر اپنا پیٹ نہ بھریں تو پھر کیا کریں، کوئی ادارہ یا فرد ایسا ہے جو ان کو عام لوگوں کی طرح حقوق دلائے، یہ تعلیم حاصل کر سکیں اور کوئی ان کی زندگی ابیرن کرنے والا نہ ہو، یہ سڑک پر جا رہے ہوں تو کوئی ان کو تنگ نہ کرے، لوگ ان کو اپنے ساتھ عبادت وغیرہ میں شریک کر سکیں، یہ ایک مشکل کام ہے۔ یہاں ہیجڑوں کی جنس کا کوئی تعین نہیں ان کو حقوق کہاں سے ملیں گے۔" گوشی ہیجڑوں کا گرو ہی نہیں بلکہ ایک مکمل لیڈر کی سی خصوصیات رکھتا ہے اور اس کو ادراک ہے کہ عام معاشرے میں ہیجڑے ایک بے شناخت مخلوق ہیں اور ان کا کوئی پرسان حال نہیں۔

مقامی پولیس کے مطابق گوشی کے اڈے پر جسم فروشی کا دھندہ نہیں ہوتا اور یہاں

موجود ہیجڑے محض ناچ گا کر اپنی روزی کماتے ہیں۔ پولیس کے ایک اہلکار کے بقول تمام ہیجڑے شادی بیاہ کی تقریبات میں ناچتے گاتے ہیں اور طوائفوں کی طرح یہ جسم فروشی نہیں کرتے بلکہ ان کی اکثریت صوم وصلوٰۃ کی پابند ہے اور یہ بہت پر امن لوگ ہیں جو نہ تو لڑائی جھگڑا کرتے ہیں، نہ نشہ کرتے ہیں اور نہ ہی کوئی دوسرا غیر قانونی کام کرتے ہیں۔ پولیس کے اس اہلکار کے مطابق اگر اس کو ہیجڑوں کے کسی اڈے پر جسم فروشی کی اطلاع ملی تو وہ ان کی خوب خبر لے گا اور ان کو اس بازار سے بھگا دے گا۔ پولیس اہلکاروں کے ان "معصومانہ" خیالات کی سب سے بڑی وجہ وہ بھاری رقم ہے جو ہر اڈہ ماہانہ کے حساب سے باقاعدگی سے ادا کرتا ہے اور جو ٹبی تھانہ کے تمام ملازمین میں بلحاظ عہدہ تقسیم ہوتی ہے۔ مقامی لوگوں کے مطابق آج تک کسی پولیس اہلکار نے ان اڈوں پر چھاپہ نہیں مارا کیونکہ اڈوں کی طرف سے ماہانہ پورے وقت پر تھانے پہنچ جاتا ہے۔ اگر پولیس والے اس طرح کے اڈے بند کرانا شروع کر دیں تو پھر یہ بھوکے مر جائیں گے۔

2 : گڈو رانی کا اڈہ

گوشی کے بعد بازار حسن میں ہیجڑوں کا دوسرا بڑا اڈہ محمد سلیم عرف گڈو رانی کا ہے۔ اس کا تعلق کس شہر سے ہے اس کے بارے میں مختلف دعوے ملتے ہیں۔ خود گڈو رانی اپنے آپ کو ملتان کا رہائشی بتاتا ہے جبکہ اس کے دوست اور جاننے والے اس کو مختلف شہروں سے منسوب کرتے ہیں۔ ایک طوائف کے بقول گڈو رانی مہاجر ہے اور 90ء کے شروع میں زرقا نام کی ایک نائکہ کے پاس ملازمت کرتا تھا۔ اس کے فرائض میں یہ بھی شامل تھا کہ وہ زرقا کے اڈے کیلئے نوجوان، ضرورت مند اور دوسرے شہروں سے بھاگ کر آئی لڑکیاں تلاش کرے۔ زرقا کے بقول اس نے کبھی اس کے اڈے کیلئے لڑکیاں سپلائی نہیں کیں بلکہ اس کو کسی ملنے والے نے میرے اڈے پر بھیجا تھا جہاں میں نے خدا ترسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کو ملازمت دیدی اور یہ سارا دن گھر میں پڑا رہتا۔ خود گوشی کا دعویٰ ہے کہ گڈو رانی پہلے کراچی میں لڑکیوں سے دھندہ کراتا تھا اور ملیر کے علاقے میں

اس کا کوٹھی خانہ تھا۔ کراچی میں لسانی فسادات کے دوران اس کا کاروبار ٹھپ ہو گیا تو اس نے ملتان کا رخ کیا، تھوڑی دیر حرم گیٹ میں رہائش اختیار کی لیکن ملتان میں اس کا کاروبار نہ چل سکا اور یہ لاہور آگیا جہاں پہلے یہ دلال کا کام کرتا رہا اور پھر اس نے ہیجڑوں کی شکل اختیار کر کے ہیجڑوں کا اڈہ بنالیا اور اب ہیجڑوں سے جسم فروشی کا دھندہ کرواتا ہے۔

بازار شیخوپوریاں میں ٹبی گلی سے تھوڑا آگے بائیں ہاتھ ایک نئے تعمیر ہوئے مکان میں محمد اسلم عرف گڈو رانی نے چار کمرے کرائے پر لیکر ایک برائے نام میوزیکل گروپ قائم کر رکھا ہے۔ مقامی لوگوں کے مطابق گڈو رانی نہ صرف ہیجڑوں سے جسم فروشی کراتا ہے بلکہ شہر کے بااثر لوگوں کو لڑکیاں بھی سپلائی کرتا ہے۔ اس کے تعلقات کا دائرہ اعلیٰ بیوروکریسی اور سیاستدانوں تک وسیع ہے اور آج تک کسی پولیس والے نے اس کو تنگ نہیں کیا اور اس کا اڈہ بازار حسن کا واحد اڈہ ہے جہاں سے مقامی تھانے کو بھتہ نہیں ملتا بلکہ گڈو رانی ایک نام نہاد سماجی کارکن کی حیثیت سے تھانے کچہری میں پھنسے ہوئے لوگوں کے کام کرواتا ہے۔

گڈو رانی کے اڈے پر اس وقت 14 ہیجڑے ہیں جن کی عمریں 18 سال سے 40 سال کے درمیان ہیں۔ تمام ہیجڑوں نے اپنے اصل ناموں کے ساتھ اپنے اپنے پسندیدہ نام لگا رکھے ہیں اور ان کی اکثریت بیرون لاہور سے تعلق رکھتی ہے۔ گڈو رانی کے سیکرٹری کا نام اشرف ہے جس نے ہیجڑہ بننے کے بعد اپنا نام لاڈو رکھ لیا ہے۔ گڈو رانی اس کو پیار سے لاڈو رانی کہہ کر پکارتا ہے اور ان پر بہت زیادہ بھروسہ کرتا ہے۔ گڈو کے مطابق لاڈو اس کی جان ہے بلکہ جو کام بڑے بڑے لوگ نہیں کر سکتے لاڈو رانی ایک لمحے میں کر دیتا ہے۔ گڈو رانی کے بقول لاڈو نے بی۔ اے کر رکھا ہے اور ہیجڑا بننے سے پہلے وہ حبیب بنک میں کیشئر کی ملازمت کرتا تھا۔ گڈو رانی نے مزید بتایا کہ لاڈو کے ساتھ اس کی ملاقات مینار پاکستان گراؤنڈ میں ایک سرکس کمپنی میں ہوئی۔ اس کو لاڈو بہت پسند آیا اور دونوں ایک دوسرے کے گہرے دوست بن گئے۔ اشرف عرف لاڈو نے بتایا کہ "اس کو اپنے گرو کے ساتھ عشق ہے اور یہ سچا عشق ہے": جہاں میرا گرو رہے گا وہاں میں

رہوں گا اور جس حال میں گُرو رکھے گا میں رہوں گا"۔

گوشی کی طرح گڈورانی کا اڈہ بھی جسم فروشی کیلئے مشہور ہے۔ اس کے گاہکوں میں بھکاری، رکشہ ڈرائیور اور دوسرے لوگ شامل ہیں۔ 80 روپے سے 500 روپے تک اس کا سیکرٹری لوگوں سے وصول کرتا ہے اور ان کو ہیجڑوں کے حوالے کر دیتا ہے۔ گڈورانی کے سیکرٹری نے بتایا کہ ہمارے پاس عموماً ایسے لوگ آتے ہیں جو شادی بیاہ وغیرہ کیلئے میوزیکل گروپ بک کرنا چاہتے ہوں۔ پانچ چھ ہیجڑوں نے اپنے مستقل گرہیئے رکھے ہوئے ہیں پھر ہمارے کچھ مستقل گاہک ہیں جو ہفتہ میں ایک دو بار آتے ہیں۔ سیکرٹری نے اڈے کی آمدن بتانے سے انکار کر دیا۔ سیکرٹری نے دعویٰ کیا کہ وہ محض میوزیکل گروپ کی آمدن زندہ ہیں اور اگر شادی بیاہ کی تقریبات میں ان کی بکنگ نہ ہو تو یہ تمام لوگ بھوکے مر جائیں گے۔

گڈورانی کے سیکرٹری کے برعکس بازار شیخوپوریاں کے رہائشیوں اور دکانداروں نے بتایا کہ جسم فروشی کا یہ اڈا ان کیلئے وبالِ جان بن گیا ہے کیونکہ اوباش قسم کے لوگ ہر وقت یہاں موجود ہوتے ہیں اور اکثر اوقات یہ لوگ ہیجڑوں کا انتخاب کرتے وقت آپس میں الجھ جاتے ہیں اور بازار میں آئے روز فائرنگ ہوتی رہتی ہے۔ ایک مقامی باشندے نے بتایا کہ گڈورانی کا اڈہ چوبیس گھنٹے کھلا رہتا ہے اور ہیجڑے دروازے پر کھڑے ہو کر آتے جاتے لوگوں کو گناہ کی دعوت دیتے رہتے ہیں۔ پہلے اس بازار میں طوائفوں کا ہجوم رہتا تھا، اب ان کی جگہ ہیجڑوں نے لے لی ہے۔ طوائف چوری چھپے دھندہ کرتی تھی لیکن یہ سر عام آنے والوں کو بھاؤ تاؤ بتاتے رہتے ہیں۔ ان ہیجڑوں کی تعداد اتنی زیادہ بڑھ گئی ہے کہ ایسے لگتا ہے جیسے تمام جوان آپریشن کرا کے ہیجڑے بن جا رہے ہیں۔ اس شخص کے بقول گوالمنڈی کے علاقے میں ایک ڈاکٹر ہے جو دس ہزار روپے لیکر اچھے بھلے آدمی کو ہیجڑا بنا دیتا ہے۔ تمام لوگ اسی سے آپریشن کراتے ہیں حیران کن بات یہ ہے کہ جو بھی قبول صورت لڑکا ہیجڑا بننے پر آمادہ ہوتا ہے اس کے آپریشن کا خرچ گُرو خود اٹھاتا ہے اور پھر وہ ہیجڑا ساری زندگی گُرو کیلئے دولت کماتا۔

اور اس کے گھر والوں کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ ان کے بیٹے کے ساتھ کیا گزر گئی۔

گڈو رانی نے بتایا کہ ہیجڑوں کو جسم فروشی سے روکا نہیں جاسکتا کیونکہ یہ ان کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر یہ جسم فروشی نہیں کریں گے تو پھر کھائیں کہاں سے؟ گڈو رانی کے بقول جب ایک بار کوئی شخص ہیجڑا بن جاتا ہے تو پھر اس کے اندر خود بخود ایک جنسی خواہش پھوٹ پڑتی ہے جس کو روکنا یا اس پر طویل عرصے تک قابو پانا اس کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ گڈو رانی ایڈز کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اس کا خیال ہے کہ یہ انگریزوں کا چھوڑا ہوا شوشہ ہے جس سے لوگوں کو خواہ مخواہ ڈرایا جاتا ہے۔ اس کے بقول زندگی موت اللہ کے ہاتھ میں ہے کوئی ایڈز کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی جب زندگی کے دن ختم ہو جاتے ہیں تو دل کو تسلی دینے کیلئے بیماری کا نام دے دیا جاتا ہے حالانکہ موت اللہ کی طرف سے آتی ہے اور اس کا وقت بھی اللہ نے پہلے ہی مقرر کر رکھا ہوتا ہے۔

3 : شاہد عرف نائلہ کا اڈہ

ہیجڑوں کی تعداد اور علاقے میں شہرت کے لحاظ سے شاہد عرف نائلہ کا اڈہ تیسرے نمبر پر آتا ہے۔ ٹبی گلی کے ایک تاریک اور گندے مکان کو کرائے پر لیکر شاہد عرف نائلہ نے یہاں اپنا اڈہ بنایا ہے۔ موبائل فون پر تقریباً ہر وقت گفتگو کرنے کا عادی شاہد عرف نائلہ اپنے بارے میں بہت کم بتاتا ہے۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اس کا آبائی علاقہ کون سا ہے اور اس کے لواحقین کون ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ 35 سالہ نائلہ نامی اس ہیجڑے کے اڈے پر تقریباً ایک درجن جسم فروش ہیجڑے صبح 9 بجے سے رات 12 بجے تک دھندہ کرتے ہیں۔ ہیجڑوں کا یہ اڈہ علاقے کا بدنام ترین اڈہ ہے کیونکہ یہ بازار حسن کے سب سے بدنام علاقے ٹبی گلی میں واقع ہے۔ اس اڈے پر تقریباً بڑی عمر کے ہیجڑے مقیم ہیں جن میں زیادہ تعداد خود ساختہ ہیجڑوں کی ہے ان میں بعض ایسے بھی ہیں جو عادی نشئی ہیں اور ہیروئن وغیرہ خریدنے کیلئے آپریشن کے بعد جسم فروشی کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ نائلہ نامی اس ہیجڑے کا کوئی سیکرٹری نہیں، یہ خود گرو بھی ہے اور

سیکرٹری بھی۔ تمام گاہکوں سے خود پیسے وصول کرتا ہے اور خود ہی اڈے کے تمام اخراجات وغیرہ کا حساب رکھتا ہے۔ گندے مندے کمروں میں اونچی آواز میں ڈیک بجتے رہتے ہیں اور ہیجڑے گلی میں جھانک کر گاہکوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے رہتے ہیں۔

نائلہ کے اڈے پر موجود ایک ہیجڑے "روشنی" بتایا کہ ان کا گرو بہت زیادہ رابطوں والا ہیجڑہ ہے اور لاہور کی فلم انڈسٹری میں اس کا نام چلتا ہے۔ روشنی نامی اس ہیجڑے نے مزید بتایا کہ وہ روزانہ چار سے پانچ سو روپیہ کماتا ہے کیونکہ دیگر اڈوں کی طرح یہاں پر ہیجڑے مستقل رہائش نہیں رکھتے اس لئے ہر رات کام ختم ہونے کے بعد گرو اپنا کمیشن رکھ کر باقی رقم سب لوگوں میں برابر بانٹ دیتا ہے۔ "روشنی" نے گرو کا کمیشن بتانے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ نیا ہے اور اس کو خدشہ ہے کہ اگر گرو کو پتہ چل گیا تو وہ اس کو ڈیرے سے نکال دے گا۔ اس نے مزید بتایا کہ وہ اندرون لوہاری گیٹ کے علاقے میں کرائے پر کمرہ لے کر رہتا ہے اور جسم فروشی سے حاصل ہونے والے پیسے وہ باقاعدگی سے اپنے گھر واقع پتوکی بھیجتا ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ پیدائشی ہیجڑا ہے اور اس سے پہلے دیہات کے میلوں میں گانے والے "راس دھاریوں" کے ساتھ کام کرتا رہا ہے لیکن اس کے بقول میلوں ٹھیلوں کا سیزن صرف جون، جولائی اور اگست تک رہتا ہے، اس کے بعد مسلسل 9 ماہ کی بے روزگاری ہوتی ہے اس لئے اس نے استاد نائلہ کے ڈیرے پر کام کرنا شروع کر دیا ہے۔

"روشنی" نامی اس ہیجڑے نے بتایا کہ نائلہ کے اڈے پر کام کرنے والوں کے ساتھ نائلہ کا سلوک بہت اچھا ہوتا ہے اور وہ ہر طرح سے اپنے شاگردوں کا خیال رکھتا ہے۔ نائلہ کے ڈیرے پر کام کرنے والوں میں کوئی بھی کسی گریے کی رکھیل نہیں یہ سب فل ٹائم جسم فروش ہیں اور عموماً گاہک کا لگایا ہوا ریٹ قبول کر لیتے ہیں۔ اکثر اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ پورے دن میں ایک بھی گاہک ادھر کا رخ نہیں کرتا، جس دن کوئی گاہک نہ آئے یا بہت کم گاہک آئیں اس دن گرو نائلہ اپنی جیب سے دوسرے ہیجڑوں کو ادائیگی کر دیتا ہے اور جب گاہک آنا شروع ہو جائیں تو وہ اپنے پیسے قسطوں کی صورت میں کاٹنا

شروع کر دیتا ہے۔ عید، داتا صاحب کے عرس، چودہ اگست اور دیگر چھٹیوں کے موقع پر اڈے پر رش بڑھ جاتا ہے اور اکثر اوقات ہیجڑوں کے اڈے اپنا وقت بڑھا دیتے ہیں۔

نائلہ نامی گرو ہیجڑے نے بتایا کہ ہمیں کسی سے کوئی شکایت نہیں ہم اپنا کام کر رہے ہیں کسی کو تکلیف نہیں دیتے اور نہ ہی کسی کے ساتھ جھگڑا کرتے ہیں لیکن بعض اوقات ہم کو بلاوجہ تنگ کیا جاتا ہے۔ لوگ طے شدہ معاوضہ بھی نہیں دیتے بلکہ الٹا مار پیٹ پر اتر آتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا مقابلہ کرنے کیلئے ہم ایک کمیٹی بنا رہے ہیں تاکہ ہم اپنا تحفظ بہتر طریقے سے کر سکیں۔ اس نے مزید بتایا کہ اس نے حفاظت کی غرض سے اسلحہ لائسنس حاصل کر رکھا ہے اور دوسرے لوگوں کو بھی یہی مشورہ دینا چاہتا ہے کہ وہ بھی اسلحہ لائسنس حاصل کریں اور اپنی حفاظت خود کرنے کی عادت ڈالیں۔ حسب سابق نائلہ نامی ہیجڑے نے بھی ایڈز جیسی مہلک بیماری کے بارے میں مکمل لاعلمی کا اظہار کیا اور اس کو ایک فرضی بیماری قرار دیا جو محض اس جیسے لوگوں کو ڈرانے کیلئے گھڑی گئی ہے جبکہ اصل میں اس کا کوئی وجود نہیں۔ نائلہ نے کہا کہ جسم فروشی کو ساری مہذب دنیا میں تحفظ دیا گیا اور قانون میں چند شرائط کے ساتھ اس کی اجازت دی گئی ہے لیکن پاکستان میں کسی حکومت نے اس طرف توجہ نہیں دی اور اگر باقاعدہ قانون سازی کر کے قواعد و ضوابط مقرر کر دیئے جاتے تو اس پیشے سے وابستہ لوگوں کی زندگی آسان ہو سکتی تھی۔

4 : رحیم عرف ریما کا اڈہ

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ لاہور کے بازار حسن میں ایک درجن سے زائد ہیجڑوں کے اڈے قائم ہیں جہاں جسم فروشی کا دھندہ عروج پر ہے۔ طوائفوں کی یہاں سے نقل مکانی کے بعد ان کیلئے مزید آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں لیکن اب ان کو شکوہ ہے کہ پورے لاہور میں اور بازار حسن میں بھی پیشہ ور عورتوں کی تعداد بہت زیادہ بڑھ گئی ہے رحیم عرف ریما کی عمر اس وقت 40 سال سے زائد ہے۔ اڈہ کھولنے سے پہلے یہ ہیجڑہ داتا دربار پر بھیک مانگتا تھا اور عام لوگوں کے سامنے یہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ داتا دربار کا

خادم ہے اور اس کے ذمہ دربار میں جھاڑو دینا ہے۔ ریما نامی اس ہیجڑے کے پاس 8 ہیجڑے ہیں جو نیواں چیت رام روڈ پر واقع اس کے اڈے پر جسم فروشی کا دھندہ کرتے ہیں۔ ریما کا خیال ہے کہ اگر ہیجڑے جسم فروشی نہ کریں تو یہ بھوکے مر جائیں کیونکہ اس کے علاوہ یہ کوئی کام نہیں کر سکتے۔ ریما نے مزید کہا کہ ہیجڑوں میں عام آدمی جیسی طاقت اور مضبوطی نہیں ہوتی کہ وہ اس طرح کام کر سکیں۔

بازارِ حسن میں ہیجڑوں کے دیگر اڈے

لاہور کے بازار حسن کے چار بڑے اڈوں کا ذکر تفصیل کے ساتھ گزشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے تمام اڈوں کے حالات تقریباً ایک جیسے ہیں۔ ہیجڑے اپنے گُرو کی حکمت عملی اور ان کو اکٹھا رکھنے کی اہلیت کی بناء پر باہمی اتفاق کے ساتھ جسم فروشی جیسے دھندے میں مصروف ہیں۔ ان کو یقین ہے کہ ان کا گُرو ان کے اڈے کو قائم رکھے گا اور اگر کوئی مشکل آئی تو وہ تمام معاملات کو سنبھال لے گا۔ گزشتہ دس برسوں کے دوران کوئی بھی ایسی مثال نہیں ملتی کہ کوئی ہیجڑہ کسی اڈے کو چھوڑ کر دوسرے اڈے پر چلا گیا ہو۔ تمام اڈے ایک دوسرے کی مخالفت پر قائم ہیں۔ ہر گُرو دوسرے اڈے کے گُرو کو جعلی ہیجڑہ قرار دیتا ہے اور خود جسم فروش ہونے کے باوجود دوسرے پر جسم فروشی کا الزام لگاتا ہے۔ ان کی آپس میں لڑائی کی وجہ پنجاب کی چودھراہٹ ہے۔ ہر گُرو پورے صوبے کا چوہدری بننا چاہتا ہے اور اپنے ساتھ زیادہ سے زیادہ ہیجڑے ملانا چاہتا ہے۔

بازار حسن لاہور کے دیگر بڑے اڈوں میں اختر عرف سیاں کا اڈہ، راشد عرف شہزادی کا اڈہ، نیاز عرف پومی کا اڈہ، فرید عرف ہیمامالنی کا اڈہ، ناصر عرف شازی کا اڈہ، سلیم ناز عرف میرا کا اڈہ، ریما جان کا اڈہ، واحد عرف کاجل کا اڈہ، نصیر عرف تبو کا اڈہ، تاج عرف تاجی ملتان والی کا اڈہ اور اکرم عرف بلبل کا اڈہ زیادہ مشہور ہیں۔ ان اڈوں پر جسم فروشی کے ساتھ ساتھ باقاعدہ گریار رکھنے کا عام رواج ہے۔ ہیجڑوں کی بڑی تعداد نشہ کرتی ہے اور دھوم دھڑکے کے ساتھ سالگرہ مناتی ہے۔ لاہور کے ہیجڑے عموماً دہلی دروازے کے قریب واقع مالواڑہ نامی ہال میں اپنی سالگرہ کی تقریب منعقد کرتے ہیں۔ پورا ہال بک کروا لیا جاتا ہے اور لذیذ ترین کھانوں کا خصوصی بندوبست کیا جاتا ہے۔ پورے ملک کی ٹولیوں کو شرکت کی دعوت دی جاتی ہے جو لاکھوں روپے کے تحائف دیتے ہیں۔ بازار حسن میں قائم ہیجڑوں کے اڈوں کو ختم کرنا نہایت مشکل ہے کیونکہ یہ اڈے مقامی پولیس کیلئے بہت زیادہ فائدہ مند ہیں۔ ان اڈوں پر جسم فروشی کے علاوہ دیگر جرائم کی شرح بہت کم ہے

کیونکہ ہیجڑوں کی اکثریت فطرتاً پر امن ہوتی ہے اور ان کے پاس جو لوگ آتے ہیں ان کا تعلق سماج کے نچلے طبقوں سے ہوتا ہے۔ اکثریت ایسے گاہکوں کی ہوتی ہے جو سارا دن محنت کرتے ہیں اور شام کو تھوڑے سے پیسے خرچ کر کے سکون حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس طرح طوائفوں کے ہاں مجرے کے موقع پر تماش بین عموماً شراب نوشی کر کے ہنگامہ کھڑا کر دیتے ہیں ہیجڑوں کے ہاں ایسا نہیں ہوتا۔ طوائفوں کی نسبت ہیجڑے زیادہ حوفزدگی کی کیفیت میں زندگی گزارتے ہیں۔ انہیں ہر وقت تمسخر اڑائے جانے اور سر عام چھیڑ خانی کا خدشہ لاحق رہتا ہے اور انہیں یہ احساس بھی ہتا ہے کہ کسی بھی ناخوشگوار صورتحال کے بعد عام لوگوں میں سے ان کا کوئی ساتھ نہیں دے گا۔ تمام مسائل سے خود ہی عہدہ برآ ہونا پڑے گا اور جو ہمدردی کریں گے وہ فوراً صلہ مانگیں گے۔

طوائف کی نسبت ان ہیجڑوں کے ساتھی بہت کم ہیں جو ان کو تحفظ فراہم کر سکیں۔ طوائف عملی زندگی میں اپنے رابطے بڑھاتی ہے اور اپنے دھندے کو ذرائع ابلاغ جیسے سہارے استعمال کر کے ترقی دیتی ہے جبکہ ان کیلئے ایسا کوئی سہارا نہیں ہے۔ طوائف کا اگر کوئی رول کسی ٹی وی یا سٹیج ڈرامے میں کیا جاتا ہے تو عموماً اس میں طوائف کے ساتھ ایک طرح کی ہمدردی کا رویہ رکھا جاتا ہے جبکہ ہیجڑے کو ہر صورت میں تمسخر اور طنز کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اس کے ساتھ کسی قسم کی ہمدردی نہیں روا رکھی جاتی۔

لاہور کے بازار حسن میں اپنا تسلط جمانے کے بعد ہیجڑوں نے دیگر رہائشی علاقوں کا بھی رخ کرنا شروع کر دیا ہے۔ جعفریہ کالونی، شاہدرہ، ماڈل ٹاؤن، علامہ اقبال ٹاؤن اور دوسرے علاقوں میں کئی آسودہ حال ہیجڑوں نے مکانات خرید کر اور کرائے پر لیکر ان آبادیوں میں خاموشی کے ساتھ جسم فروشی کے اڈے چلانے شروع کر دیئے ہیں۔ مثال کے طور پر بازار حسن کے بعد ہیجڑوں کا سب سے مشہور اڈہ علامہ اقبال ٹاؤن کے نیلم بلاک میں تنویر عرف ریشم جان نے درجن بھر ہیجڑوں کے ساتھ شروع کیا ہے۔ اسی طرح جعفریہ کالونی اور شاہدرہ میں بھی چھوٹے چھوٹے اڈے شروع کئے گئے ہیں۔ بازار حسن کے رہائشی ایک ہیجڑے نے بتایا کہ جس طرح طوائفوں نے لاہور کے دوسرے

علاقوں میں اپنے دھندے کو کامیابی کے ساتھ چلایا ہے یہ ہیجڑوں کیلئے ایک مثال ہے اور ہیجڑوں کو بھی چاہئے کہ وہ دوسرے علاقوں میں صاف ستھرے اور اچھے اڈے بنائیں۔

لاہور میں ہیجڑوں کے اڈوں کی "کامیابی" نے کراچی، حیدر آباد، ملتان، اوکاڑہ، ساہیوال اور دوسرے علاقوں کے ہیجڑوں کو بھی لاہور کی طرف رجوع کرنے پر مجبور کردیا ہے اور ان شہروں کے ہیجڑے جوق در جوق لاہور پہنچ رہے ہیں۔ ایک حساس ادارے کے نچلے درجے کے ملازمین کی جنسی ضروریات کو پورا کرنے کیلئے شاہدو نامی ہیجڑے نے جسم فروشی کا ایک اڈہ ان ملازمین کے قریبی علاقے میں قائم کیا ہے اور دیگر ہیجڑوں کے بقول اس کا یہ اڈہ کامیابی کے ساتھ چل نکلا ہے۔ یہ تو تھی لاہور میں ہیجڑوں کے اڈوں کے بارے میں ایک تفصیلی رپورٹ اگلے ابواب میں ہیجڑوں کی رسومات اور خود ایجاد کردہ بولی کے بارے میں بتایا جائے گا۔

آزاد ہیجڑے اور جسم فروشی

گزشتہ صفحات میں ان ہیجڑوں کے بارے میں تفصیل کے ساتھ لکھا گیا ہے جو اجتماعی طور پر جسم فروشی کا دھندہ کرتے ہیں اور اڈوں پر رہتے ہیں۔ ان کا طریقہ کار کیا ہے اور وہ کس طرح اس دھندے کو چلاتے ہیں۔ جبکہ اس رپورٹ میں ان ہیجڑوں کے بارے میں لکھا جارہا ہے جو انفرادی طور پر جسم فروشی کا دھندہ کرتے ہیں اور عام لوگوں کے ساتھ گھل مل کر رہتے ہیں۔ انفرادی طور پر جسم فروشی کا کاروبار کرنے والے ہیجڑے عموماً پیدائشی ہیجڑے ہوتے ہیں یا پھر ایک طویل مدت تک جنسی طور پر مفعول کی زندگی گزارنے کے بعد اس کام کو پیشہ بنا لیتے ہیں۔ ان کا تعلق عام لوگوں کے ساتھ دیگر ہیجڑوں کی نسبت زیادہ گہرا ہوتا ہے اور یہ اپنی زندگی دوسرے لوگوں کے ساتھ ملکر گزارتے ہیں۔ بعض اوقات یہ اپنی وضع قطع بھی عام لوگوں کی سی اپنا لیتے ہیں اور ان کی شناخت مشکل ہو جاتی ہے۔ ان ہیجڑوں میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہوتی ہے جو جسم فروشی کا دھندہ تو نہیں کرتے لیکن عادتاً جنسی آسودگی حاصل کرنے کیلئے لوگوں کے ساتھ میل ملاپ رکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی بڑی تعداد بعض اوقات اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتی ہے اور یا پھر مالی طور پر آسودہ حال زندگی بسر کر رہی ہوتی ہے۔

ان لوگوں کی اکثریت اپنے آپ کو ہیجڑہ ظاہر نہیں کرتی اور انتہائی رازداری کے ساتھ جنسی تعلقات کی زندگی گزارتی رہتی ہے۔ اکثر اوقات ان کو پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے اور نہ ہی ان کی سماجی حیثیت سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ جنسی طور پر کج روی کا شکار ہیں۔ مثال کے طور پر پاکستان میں بعض اعلیٰ پائے کے سیاستدان جنسی طور پر مفعول زندگی گزار رہے ہیں لیکن ان کی سیاسی وجاہت اور رتبہ ان کے بارے میں معلومات پھیلنے نہیں دیتا اور وہ خاموشی کے ساتھ اپنی جنسی بھوک مٹاتے رہتے ہیں۔ اسی طرح بعض مذہبی رہنما اس علت کا بری طرح شکار ہیں لیکن ان کے بارے میں چونکہ عام تاثر نہایت پاکبازی اور راست بازی کا ہے اس لئے ان کی علت ہمیشہ پوشیدہ رہتی ہے اور لوگ ان کے بارے

ہیں یکطرفہ نظریہ رکھتے ہیں۔

لاہور کے ایک مشہور دینی عالم اور مبلغ کی اس عادت کا اس قدر چرچہ ہے کہ ہر پانچواں شخص ان کی جنسی مفعولیت کے بارے میں مکمل معلومات رکھتا ہے لیکن اس کا سر عام اظہار کرنے کی جرأت نہیں رکھتا۔ مذکورہ عالم دین کی اس علت میں پائی جانیوالی شدت کا یہ عالم ہے کہ وہ جس لڑکے کے ساتھ جنسی تعلقات رکھتے ہیں اس کو ایک پرکشش ماہانہ تنخواہ دیتے ہیں اور اس کو گھر سے لیجانے اور لانے کیلئے اعلیٰ قسم کی جدید گاڑی اور ڈرائیور کی سہولت بھی دیتے ہیں۔ ایک واقف حال کے مطابق اس وقت مذکورہ شخصیت نے اپنی جنسی تشفی کیلئے جس نوجوان لڑکے کی خدمات حاصل کر رکھی ہیں اس کی تنخواہ بیسویں گریڈ کے بیوروکریٹ سے زیادہ ہے اور اس کو جو مراعات حاصل ہیں ان کا محض اندازہ ہی لگایا جاسکتا ہے۔ موصوف عالم دین کی اس علت کے بارے میں تقریباً ہر آدمی کچھ نہ کچھ ضرور جانتا ہے لیکن سماجی طور پر ان کو حاصل مقام سے کوئی انہیں ہٹا نہیں سکتا اور نہ ہی ان کی جنسی زندگی کے بارے میں کوئی ان سے سوال کر سکتا ہے کیونکہ ان کی رسائی اعلیٰ ترین حکام تک ہے اور ان کے عقیدت مندوں میں بعض اوقات حکمران تک شامل ہوتے ہیں۔

یہ تو ایک مثال تھی جو اپنی پوری قوت کے ساتھ نہ صرف ایک عالم دین کے طور پر حاصل ہونے والی عزت، دولت اور شہرت کو سمیٹ رہی ہے بلکہ دن بدن اعلیٰ مقام حاصل کرتی جارہی ہے۔ اس کے علاوہ سیاستدانوں، بیوروکریٹس، دانشوروں اور زندگی کے دیگر شعبوں سے تعلق رکھنے والی کئی شخصیات جنسی طور پر مفعول کی زندگی گزار رہی ہیں اور اپنی قوت اور اختیار کے بل بوتے پر اپنے لئے جنسی فاعل کا انتخاب کرتی ہیں۔ ان میں بعض ایسی شخصیات بھی شامل ہیں جو اپنی جنسی بھوک مٹانے کیلئے اپنی عزیز عورتوں کو بھی پیش کرنے سے گریز نہیں کرتیں اور اگر کوئی نوجوان پسند آجائے تو اس کو اپنی عورتوں سے مستفید ہونے کا پورا موقع دیتی ہیں۔

جہاں تک انفرادی طور پر اور آزادانہ جسم فروشی کا تعلق ہے ایک محتاط اندازے کے

مطابق تین سے چار ہزار ہیجڑے صرف لاہور میں یہ کاروبار کر رہے ہیں، کراچی میں ا
کی تعداد سات ہزار سے زیادہ ہے جبکہ پشاور اور کوئٹہ کے علاوہ دیگر بڑے شہروں میں بھ
یہ ہزاروں کی تعداد میں اس کاروبار سے منسلک ہیں چونکہ یہ آزاد لوگ ہوتے ہیں لہٰذا اپ
علاقوں کے حالات کے مطابق اپنا پیشہ کرتے ہیں۔ ان کے گاہک عموماً ان کے گھروں
رہائش گاہوں اور دفاتر میں پہنچ جاتے ہیں یا پھر گاہکوں کو ان کے منتخب کردہ مقام یا ان کے
گھر پر "سروس" بہم پہنچائی جاتی ہے۔ اس طرح راز فاش ہونے اور عام لوگوں کو اس کا علم
ہونے کا خدشہ نہیں رہتا۔

اکیلے جسم فروشی کرنے والے عموماً بہت زیادہ محتاط رویئے کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان
کو بظاہر دیکھ کر محسوس نہیں ہوتا کہ یہ پیشہ ور ہیں اور نہ ہی ان سے کوئی شخص معاملہ طے
کر سکتا ہے۔ عموماً ان کے گاہک لگے بندھے لوگ ہوتے ہیں جو ہفتہ وار یا طے شدہ وقت
کے مطابق ان سے ملتے ہیں ان کا معاوضہ اڈوں پر جسم فروشی کرنے والوں سے قدرے
زیادہ ہوتا ہے کیونکہ یہ اپنے گاہک کے ساتھ اس کی انتخاب کردہ جگہ پر جا سکتے ہیں یا گاہک
کو اپنی جگہ پیش کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ چل پھر کر جسم فروشی کرنے والے افراد باقاعدہ
ڈیروں پر جسم فروشی کرنے والوں سے زیادہ صرف ستھرے اور نسبتاً سلجھے ہوتے ہیں۔
اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ گاہک اڈے پر خود چل کر آتا ہے جبکہ انفرادی جسم فروشوں کو
اپنا گاہک خود تلاش کرنا پڑتا ہے اور پھر اس کے ساتھ بھاؤ تاؤ کر کے اسے زیادہ پیسوں پر
مائل کرنا پڑتا ہے جبکہ اڈوں پر ریٹ مخصوص ہوتے ہیں اور وہاں پر کام کرنے والے کسی
ہیجڑے کو اپنی ذاتی کمائی بڑھانے کی فکر نہیں ہوتی، جو بھی آئے گا اور جو پیسے دے گا وہ
پہلے اکٹھے رکھے جائیں گے اور بعد میں اخراجات منہا کر کے ان کو تمام افراد میں برابر بانٹ
دیا جائے گا لیکن انفرادی جسم فروشوں کو اس طرح کا اطمینان ہوتا ہے کیونکہ انہیں جو کچھ
کمانا ہوتا ہے صرف اپنی محنت کے بل بوتے پر کمانا ہوتا ہے اس میں کسی دوسرے شخص کا
عمل دخل بہت کم ہوتا ہے۔

چل پھر کر گاہک تلاش کر کے جسم فروشی کرنے والے ایک ہیجڑے بوبی نے بتایا

کہ اڈوں پر کسی کی انفرادیت قائم نہیں رہتی سب کو ایک ہی لاٹھی کے ساتھ ہانکا جاتا ہے اگر کوئی بہتر کمائی کرتا ہے تو وہ بھی برابر اور اگر کوئی بوڑھا کھوسٹ کچھ بھی نہیں کماتا، شام کو اس کو بھی برابر کا حصہ ملتا ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ گزشتہ پانچ برسوں سے اس پیشے کے ساتھ وابستہ ہے اور ہر دن اس کو خود ہمت کر کے اور محنت کر کے اپنے گاہک تلاش کرنا پڑتے ہیں، بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کئی کئی دن کوئی گاہک نہیں ملتا اور فاقوں کی نوبت بھی آجاتی ہے جبکہ بعض اوقات اتنا رش ہوتا ہے کہ ایک ڈیڑھ ہفتہ اچھا لگا کر میں اپنے دوستوں کے ساتھ مری یا دوسرے صحت افزاء مقامات کی سیر کو چلا جاتا ہوں بوبی نے بتایا کہ دراصل خود کو بہت زیادہ سمارٹ رکھنا پڑتا ہے پھر جا کر کہیں کوئی آدمی آپ کی طرف مائل ہوتا ہے۔ لوگ بہت زیادہ نقائص نکالتے ہیں اور طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ بوبی نے بتایا کہ اس کی ماہانہ آمدن اوسطاً بارہ ہزار روپے ہے جبکہ اس کا سب سے زیادہ خرچ میک اپ اور لباس پر ہوتا ہے۔ بوبی نے بتایا کہ وہ مردانہ لباس میں پیشہ کرتا ہے اور اچھے کپڑے لبرٹی یا ڈیفنس سے خریدتا ہے۔ اس نے مزید بتایا کہ اس کے دس تک مخصوص گاہک ہیں جو اس کو اپنے گھروں میں یا اچھے ہوٹلوں میں لے جاتے ہیں اور بہت اچھا معاوضہ دیتے ہیں۔ اس نے بتایا کہ آج تک کبھی کسی نے اس کے ساتھ زیادتی نہیں کی اور نہ ہی اس کا معاوضہ روکا ہے۔ اس کو یقین ہے کہ وہ مزید پانچ سال تک اسی طرح یہ دھندہ جاری رکھے گا اور اس دوران پیسے جمع کر کے یورپ چلا جائے گا، جہاں وہ زیادہ آزادی کے ساتھ اور اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزار سکے گا۔ بوبی اپنے گھر اور خاندان کے بارے میں کچھ نہیں بتاتا اس کا دعویٰ ہے کہ وہ "اکوا" ہے اور پیدائشی ہیجڑہ ہے یہی وجہ ہے کہ اس کے مستقل گاہک کئی برسوں سے اس کے ساتھ منسلک ہیں اور ان کو کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔

بوبی نے مزید بتایا کہ وہ گلبرگ میں نہر کے کنارے کھڑا ہوتا ہے اور اس کے پاس اس کے ایک چاہنے والے کا دیا ہوا موبائل فون ہے۔ وہ اپنا نمبر صرف مخصوص گاہکوں کو ہی دیتا ہے بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس کے گاہک اس کو لیکر مری یا لال سوہانرہ

کے تفریحی مقامات پر چلے جاتے ہیں جہاں وہ کئی دن ان کے پاس رہتا ہے۔ واپسی پر اچھ خاصہ معاوضہ اور کپڑوں کی صورت میں تحفے تحائف بھی ملتے ہیں۔ اس نے دعویٰ کیا کہ وہ اپنے گاہک کو دور سے پہچان لیتا ہے۔ گاہک کی آنکھوں میں ایسی چمک ہوتی ہے کہ وہ آسانی کے ساتھ پہچانا جاتا ہے۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ میں نے کسی غلط آدمی کو روک لیا یا اس سے لفٹ مانگ لی۔ اس نے بتایا کہ پولیس اس کو پہچان ہی نہیں سکتی۔ اسے شک کیسے کرے گی کیونکہ میں ہمیشہ کھاتے پیتے گھرانے کا ایک آسودہ حال لڑکا محسوس ہوتا ہوں اور میرے بارے میں یہ گمان کرنا کہ میں محض ایک جسم فروش ہوں یہ تقریباً ناممکن ہے۔

میرے تمام مشاہدے میں "بوبی" مجھے سب سے الگ اور مطمئن ترین جسم فروش محسوس ہوا۔ وہ آئیڈیل طریقے سے خود کو خوش و خرم اور مصروف رکھتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اسے بہت کم محنت کرنا پڑتی ہے۔ شروع میں اس نے زیادہ محنت کی اور جان بوجھ کر اپنا معاوضہ کم رکھا لیکن اب جب اس کے مخصوص اور مستقل گاہک ہیں اس کو اپنا معاوضہ کم کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس نے ایک دلچسپ واقعہ سنایا کہ گزشتہ سال دسمبر کے مہینے میں جب وہ سخت سردی میں نہر کے کنارے کسی گاہک کے انتظار میں کھڑا تھا ایک کالے شیشوں والی بڑی سی گاڑی اس کے قریب آکر رکی اور اس کا آگے والا دروازہ آہستہ سے کھل گیا۔ وہ کار سوار کو گاہک سمجھ کر جلدی سے اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس کے ہوش اچانک اڑ گئے جب اس نے دیکھا کہ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک نوجوان لڑکی بیٹھی ہے اور آہستہ آہستہ سگریٹ پی رہی ہے۔ اس لڑکی نے جلدی سے گاڑی چلا دی اور وہ خاموشی کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھا رہا گاڑی گلبرگ کے ایک وسیع و عریض گھر میں داخل ہوئی تو خونخوار کتوں نے ان دونوں کا استقبال کیا۔ کتے لڑکی کے ساتھ لپٹے چلے جاتے تھے اور وہ ان کو انگریزی زبان میں کچھ کہتی رہی۔ بوبی کے بقول وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ایک انتہائی شاندار کمرے میں لے گئی اور فوراً بے لباس ہو گئی۔ میں نے چاہا کہ لڑکی کو تمام صورتحال بتا دوں لیکن مارے ڈر کے خاموش رہا۔ اچانک لڑکی کی نظر میرے بائیں ہاتھ کی نیل پالش لگے ناخن والی انگلی پر پڑی تو وہ دھڑام سے صوفے پر گر گئی اور مجھے انگریزی میں گالیاں دینے لگی۔

ں نے اس کو بتایا کہ اس نے مجھے بولنے کا موقع ہی نہیں دیا اور میں تو خود کسی مرد کی لاش میں تھا۔ اس لڑکی نے اتنے زور کے ساتھ مجھے تھپڑ مارے کہ میری آنکھوں کے گے اندھیرا چھا گیا۔ اس نے فوراً لباس پہنا اور مجھے دھکا دیکر گیٹ سے باہر نکال دیا۔ یہ تو تھی ایک کامیاب جسم فروش بوبی کی داستان جو اپنے بارے میں کچھ نہیں بتانا چاہتا جبکہ اس کا حلیہ اور بات چیت کرنے کا انداز کسی اچھے خاندانی پس منظر کی چغلی کھاتا ہے۔

دوسرا مشاہدہ بوبی نامی اس جسم فروش کے بالکل برعکس ہے۔ "نسیم" نامی ایک ہیجڑے کا تعلق اس کے بقول ملتان سے ہے اور اس کے ماں باپ فوت ہو چکے ہیں۔ اس نے بتایا کہ وہ ملتان شہر کے علاقے دہلی گیٹ میں رہتے تھے اور وہ ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہے۔ ابھی اس کی عمر بارہ تیرہ سال تھی کہ اس کے ماں باپ ایک حادثے میں مارے گئے۔ والدین کی وفات کے بعد وہ لاہور آگیا اور یہاں پر مختلف کام کرنے لگا۔ اس نے بتایا کہ وہ پیدائشی طور پر ہیجڑا نہیں۔ جہاں وہ کام کرتا تھا وہاں کام کرنے والے ایک نوجوان نے اس کے ساتھ زیادتی کی لیکن اس نے خوف اور بدنامی کے مارے کسی کے سامنے اس واقعے کا ذکر نہ کیا۔ نسیم کے بقول وہ لڑکا چونکہ اس سے بڑا تھا اور طاقتور تھا اس لئے وہ تقریباً روزانہ اس کے ساتھ زیادتی کرنے لگا۔ شروع شروع میں اس نے احتجاج کیا لیکن نوکری ختم ہو جانے اور دوسرے لوگوں میں بدنام ہو جانے کے خوف کے باعث وہ کسی کو بھی بتا نہ سکا اور یوں اس کی زیادتی کا سلسلہ کئی ماہ چلتا رہا۔ نسیم نے بتایا کہ ایک دن اس لڑکے نے فیکٹری کے مالک کے ساتھ ملکر اس کے ساتھ زیادتی کی۔ مالک نے اگلے دن اس کی تنخواہ جو کہ پہلے ایک ہزار روپیہ تھی بارہ سو روپے کر دی اور ساتھ ہی اس کو راز رکھنے کی سخت تاکید کی۔ رفتہ رفتہ فیکٹری مالک کے دوستوں نے بھی اس کے ساتھ جنسی عمل کرنا شروع کر دیا اور نسیم کے بقول اس کو عادت ہو گئی۔ جس دن اس کے ساتھ کوئی جنسی عمل نہ کرتا اس دن وہ بے چین رہتا اور اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکتا۔ نسیم کے بقول اس کے ساتھ ہونے والے جنسی عمل کے بارے میں فیکٹری کے تمام لوگوں کو پتہ چل گیا اور اس کو ایک دن فیکٹری سے نکال دیا گیا۔ اس نے دوسری برتن ساز فیکٹری میں ملازمت

کی کوشش کی تو وہاں بھی لوگوں کو اس کے کردار کے بارے میں بتا دیا گیا۔ نسیم کے پاس اس کی جسم فروشی کا جواز بے روزگاری ہے: "جب کوئی کام نہیں ملتا اور آپ کو کوئی نوکری دینے کو تیار نہیں ہوتا تو آپ کیا کریں گے، بھوک سے تو مرا نہیں جاتا اس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ میں جس عادت کا شکار بنا دیا گیا ہوں اسی عادت کے ذریعے اپنی روزی کماؤں گا"۔

بوبی کی نسبت نسیم کے تجربات تلخ ہیں اور وہ کسی پر بھی اعتبار کرنے کو تیار نہیں۔ اس کو معلوم ہے کہ جنسی تعلق ایک دھوکہ اور زبردستی ہے اور جو بھی جنسی تعلقات قائم کرنے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے وہ محض وقتی طور پر خود کو محظوظ کرنا چاہتا ہے اور اس کے استعمال کے بعد وہ یا تو کسی دوسری طرف متوجہ ہو جائے گا یا پھر اس کی تضحیک کرے گا اور اس کو اپنی طاقت کا احساس دلائے گا۔ نسیم فیکٹری میں جنسی تشدد کا شکار ہوا اور خاموش رہا لیکن اس کی خاموشی ہی اس کی دشمن ثابت ہوئی اور وہ آہستہ آہستہ عادی ہونے لگا۔ جس بات کو اس نے راز میں رکھنے کی کوشش کی تھی وہ اس کی کوشش کے باوجود راز میں نہ رہ سکی اور الٹا نقصان بھی اس کو اٹھانا پڑا کیونکہ وہ عادی جنسی مفعول بن گیا تھا۔ اس کی زندگی کا دارومدار صرف جسم فروشی تک محدود ہو کر رہ گیا اور اگر وہ اپنے تحفظ کیلئے پولیس وغیرہ کا سہارا لیتا تو اس کا لاوارث پن راستے کی رکاوٹ بن جاتا اور یہ پولیس اہلکاروں کی ہوس کا نشانہ بنتا رہتا اس کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اس کا پیشہ ناپسندیدہ ترین پیشہ ہے لیکن وہ "اصلاح کاروں" سے ڈرتا ہے اور اس کو کہیں بھی اپنا کوئی ہمدرد یا غم خوار نظر نہیں آتا۔ نسیم کے بقول جنسی فعل کے دوران بھی شروع میں اس کو دھمکیاں سننا پڑتیں اور فاعل اس کو دھمکاتا کہ اگر اس نے اس فعل کے بارے میں کسی سے ذکر کیا تو پھر اس کی جان جائے گی کسی دوسرے کا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ نسیم کے مطابق شروع میں اس کو نہ صرف جنسی زیادتی کا سامنا کرنا پڑا بلکہ اس پر رعب ڈالنے کیلئے اور اس کو دبانے کیلئے فاعل اس پر تشدد بھی کرتا۔ اس کے ساتھ کوئی بھی ہمدردی نہ کرتا۔ اب اس کو مکمل یقین ہے کہ ہر دوسرا آدمی محض اس کے جسم سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے اور اگر

اس فعل کے بدلے میں اس کو چند روپے دے دیتا ہے تو یہ اس کی طبیعت کی فیاضی
یں بلکہ یہ ایک طرح سے اپنا راز پوشیدہ رکھنے کی حقیر سی کوشش ہے۔

نسیم نے بتایا کہ وہ مال روڈ، لکشمی چوک اور نہر کے کنارے اپنا کاروبار کرتا ہے۔
ں نے والٹن کی ایک بستی میں پانچ سو روپے ماہوار کرائے پر ایک کمرہ حاصل کر رکھا
ہے۔ وہ شام کو سات بجے تیار ہو کر اپنے ٹھکانے پر پہنچ جاتا ہے، جہاں اس کو دو یا تین
ہک ضرور مل جاتے ہیں۔ "لوگ جنسی عمل کے دوران عجیب و غریب قسم کی حرکتیں
رتے ہیں، کوئی گالی دیتا ہے، کوئی تھپڑ مارتا ہے اور کوئی اپنے کئے پر شرمندہ ہوتا ہے
ر افسوس کے دوران اس پر تشدد کرتا ہے کہ وہ اس گناہ کا باعث بنا۔" نسیم کے بقول
ں وقت اس کی عمر 18 سال ہے اور اس کے اندر شادی کرنے کی کوئی خواہش نہیں
ونکہ وہ خود کو شادی کے قابل نہیں سمجھتا۔ "میں شادی کس طرح کر سکتا ہوں مجھے تو
ب اس چیز کا تجربہ ہی نہیں کہ مرد کیا ہوتا ہے اور مرد کے اندر کس طرح کے جذبات
یدا ہوتے ہیں، میں تو اب مردوں کے جذبات ابھارتا ہوں"۔

نسیم کے پاس سینکڑوں دلچسپ واقعات کا ایک خزانہ ہے۔ اس نے بتایا کہ گزشتہ سال
نوجوان لڑکے اس کے ساتھ ایک رات کا معاوضہ 300 روپے طے کر کے اس کو گاڑی
ں بٹھا کر نیو کیمپس (پنجاب یونیورسٹی) لے گئے۔ ظاہری طور پر دونوں کسی اچھے اور
ماتے پیتے خاندان کے محسوس ہوتے تھے۔ اس نے 300 روپے کا مطالبہ کیا، جو انہوں
نے فوراً قبول کر لیا۔ نسیم نے بتایا کہ جب اس نے کپڑے اتارنے سے پہلے روایت کے
طابق اپنا معاوضہ طلب کیا تو ایک نوجوان نے پستول اس کے سینے پر لگا دیا اور دھمکی دی کہ
ر اس نے شور مچایا یا کوئی حرکت کرنے کی کوشش کی تو اس کو گولی مار دے گا۔ "میں بہت
یادہ خوفزدہ ہو گیا اور خاموشی کے ساتھ برہنہ حالت میں فرش پر بیٹھ گیا۔ دونوں نے باری
ی میرے ساتھ جنسی عمل کیا اور ساتھ ساتھ شراب پیتے گئے۔ اس دوران میں نے
ئی احتجاج نہیں کیا لیکن انہوں نے مجھے جنسی عمل کے دوران تھپڑ اور مکے مارے۔ رات
قریباً ایک بجے کے بعد وہ دونوں کپڑے پہن کر کمرے سے نکل گئے اور دو مزید لڑکے اندر

آگئے انہوں نے نہ صرف میرے ساتھ زیادتی کی بلکہ مجھے شراب پینے پر بھی مجبور کیا۔
عمل صبح ہونے تک جاری رہا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تقریباً ایک درجن لڑکوں ۔
میرے ساتھ زبردستی جنسی فعل کیا تھا۔ شراب نوشی کے باعث مجھ پر غنودگی طاری تھ
اور تشدد کی وجہ سے میں چلنے پھرنے سے مجبور تھا۔ اس اثناء میں مجھے انہوں نے گاڑی میں
ڈالا اور نہر کے کنارے چھوڑ گئے۔ میرے دانتوں اور میرے ہونٹوں سے خون جاری
اور میں نہر کے کنارے پڑا تھا کہ پولیس کی ایک گاڑی میرے پاس آکر رکی۔ پولیس والوں
نے مجھے گاڑی میں ڈالا اور ماڈل ٹاؤن فلیٹس کی طرف لے آئے۔ مجھے تھانے میں لے جا
کی بجائے ایک نوجوان اے ایس آئی جسے باقی پولیس والے رانا صاحب کہہ کر پکار رہے تھے
دوسری منزل پر واقع ایک فلیٹ میں لے آیا۔ اس نے خصوصی توجہ کے ساتھ میری کہا
سنی اور مجھے کھانا کھلایا اور گرم دودھ پلا کر سونے کا حکم دیدیا۔ تقریباً چار گھنٹے بعد مذکورہ ا
ایس آئی نے مجھے اٹھایا اور دوبارہ رات کے واقعے کے بارے میں پوچھنے لگا۔ میں نے وہی قصہ
دوبارہ اس کو سنایا۔ میری بات سننے کے بعد اس نے مجھے کپڑے اتارنے کا حکم دیا، اس نے ک
کہ وہ اس کا معائنہ کرنا چاہتا ہے کہ واقعی اس کے ساتھ جنسی زیادتی ہوئی ہے یا وہ جھوٹ
بول رہا ہے۔ "دوران معائنہ" اس نے بھی میرے ساتھ جنسی زیادتی شروع کردی او
میری منت سماجت کو بالکل نظر انداز کردیا۔ وہ سارا دن میرے ساتھ بار بار جنسی زیادتی
کرتا رہا اور رات کو اس نے مجھے رکشہ میں بٹھا کر نہر کی طرف روانہ کردیا۔ رکشہ والے نے
ایف سی کالج کے پاس مجھے اتار دیا اور یوں میری جان چھوٹی"۔

نسیم جیسے واقعات سے گزرا تقریباً اس سے ملتے جلتے واقعات درجنوں ایسے جسم
فروش لڑکوں کے ہیں جو لاہور کی معروف مارکیٹوں اور شاہراہوں پر دھندہ کرتے ہیں۔
ان میں سے کسی ایک نے بھی آج تک اپنا طبی معائنہ نہیں کرایا اور خود کو مکمل طور پر صحت
مند تصور کرتے ہیں۔ مجھے ایک شخص نے بتایا کہ لڑکے ایک تو بہت کم پیسے لیتے ہیں او
دوسرا لڑکیوں جیسے نخرے نہیں کرتے۔ انہیں جو کہا جائے بلا چون و چرا کرنا شروع
کردیتے ہیں اور لڑکیوں کی نسبت زیادہ آسانی کے ساتھ دستیاب ہوتے ہیں اور ہر جگہ پہنچ

جاتے ہیں۔ بعض لوگ ان کو اپنے گھروں میں الیکٹریشن یا کاریگر کے طور پر لے جاتے ہیں اور معمولی پیسے دیکر ان کے ساتھ جنسی فعل کرتے ہیں۔ مذکورہ شخص کے بقول ان لڑکوں کی زیادہ تر تعداد گھروں سے بھاگی ہوتی ہے اور جسم فروشی کے ساتھ ساتھ چھوٹا موٹا جرم بھی کرتے رہتے ہیں۔ ان میں سے اکثر تو مقامی پولیس کیلئے بھی کام کرتے ہیں۔ پولیس ان کے ٹھکانوں سے چند گز کے فاصلے پر کھڑی رہتی ہے اور جب کوئی ان کو اپنی گاڑی یا موٹر سائیکل پر بٹھاتا ہے تو پولیس اس کے پیچھے لگ جاتی ہے اور جسم فروش لڑکا ہمیشہ لفٹ دینے والے کے خلاف گواہی دیتا ہے کہ اس نے زبردستی گاڑی یا موٹر سائیکل پر سوار کیا ہے اور وہ اس کے ساتھ زیادتی کرنا چاہتا تھا۔ پولیس لفٹ دینے والے کو حدود کیس بنانے کی دھمکی دیتی ہے جس کی کڑی سزا کا تصور ہی اس کے اوسان خطا کر دیتا ہے۔ بالآخر لفٹ دینے والے کو "حدود کیس" سے بچنے کیلئے بھاری رشوت دینا پڑتی ہے جس میں سے ایک حصہ اس جسم فروش لڑکے کو ملتا ہے جس نے گاہک پھانسا تھا۔

کراچی میں جسم فروش لڑکوں کی ایک بڑی تعداد میپر روڈ، طارق روڈ، کلفٹن، شاہراہ فیصل، صدر، پریڈی، ملیر اور دوسرے علاقوں میں مختلف طریقوں کے ساتھ جسم فروشی کرتی ہے ان لڑکوں میں زیادہ تر پنجاب سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں جبکہ گورے چٹے پہاڑی لڑکوں کی ایک بہت بڑی تعداد بھی یہ دھندہ کرتی ہے۔ کراچی کی مختلف سڑکوں پر یہ جسم فروش لڑکے سر شام اچھے اور شوخ کپڑے پہن کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور لفٹ مانگ کر گاہک بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پنجاب اور سرحد سے مزدوری کی خاطر گئے ہوئے غریب لڑکے بھی کراچی میں جسم فروشی کا دھندہ کرتے ہیں۔ ان کے گاہکوں میں زیادہ تر رکشہ ڈرائیور ہوتے ہیں یا پھر ہوٹلوں کے منیجر ان لڑکوں سے کمیشن وصول کر کے ان کو گاہک دیتے ہیں۔ صدر کے درجنوں ہوٹلوں میں جسم فروش لڑکوں کی ایک بہت بڑی تعداد ہر وقت موجود رہتی ہے جو تھوڑے سے معاوضے کے عوض جنسی فعل کراتی ہے۔

کراچی کے سستے ہوٹلوں میں دستیاب لڑکوں کی عمریں پندرہ سے پچیس سال کے درمیان ہوتی ہے اور وہ عادی جسم فروشوں کی طرح باقاعدہ پیشہ کرتے ہیں۔ ان کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کن کن بیماریوں کا شکار ہیں اور کس تیزی کے ساتھ یہ بیماریاں اپنے گاہکوں میں منتقل کر رہے ہیں۔ کراچی کے ہوٹلوں میں جسم

فروشی کرنے والے ان لڑکوں کو پولیس گرفتار نہیں کرتی کیونکہ وہ ہوٹل میں ملازم کی حیثیت سے مقیم ہوتے ہیں اور ہوٹل میں ٹھہرنے والوں کے بارے میں اندازہ لگا کر انہیں جنسی فعل کی دعوت دیتے ہیں۔

اسی طرح پشاور میں زیادہ تر افغان لڑکے جسم فروشی کا دھندہ کرتے ہیں۔ غریب علاقوں سے تعلق رکھنے والے یہ لڑکے بہت کم معاوضے پر جسم فروشی کا کام کرتے ہیں۔ ان لڑکوں سے فیض حاصل کرنے والوں میں مقامی باشندوں کے علاوہ دوسرے شہروں سے آئے ہوئے لوگوں کی اکثریت ہوتی ہے۔ افغان لڑکے عموماً مستقل گاہک رکھتے ہیں اور چائے کے ہوٹلوں وغیرہ کے علاوہ ٹرکوں کے اڈوں اور لاری اڈوں پر کھڑے ہوتے ہیں۔ جسم فروش افغان لڑکے زیادہ تر چھوٹا موٹا جرم کرتے رہتے ہیں اور ان کی اکثریت جیلوں کے اندر یہ کام کرتی ہے۔ جیلوں میں قید لوگ معاوضے سے زیادہ ان کو ڈرا دھمکا کر ان کے ساتھ جنسی فعل کرتے ہیں۔ اسی طرح کوئٹہ میں بھی مقامی لوگوں کے افغان مہاجر لڑکے جسم فروشی کا دھندہ کرتے ہیں۔ پنجاب اور سندھ کی نسبت سرحد اور بلوچستان میں مردانہ جسم فروشی کی روایت کمزور ہے اور یہاں پر مذکورہ بالا دونوں صوبوں کی طرح جسم فروشی کے اجتماعی اڈے بھی نہیں ملتے۔

لاہور --- عام آبادیوں میں جسم فروشی

تقریباً پچیس برس پہلے تک جسم فروشی کا باقاعدہ کاروبار صرف مخصوص بازاروں تک محدود تھا جن کو لوگ بازار حسن اور ہیرا منڈیوں کے طور پر جانتے تھے۔ بظاہر موسیقی اور ناچ وغیرہ کی آڑ میں طوائفیں جسم فروشی کا دھندہ کرتیں یا پھر ماہانہ مختص کر کے مخصوص لوگوں کے ساتھ جنسی تعلق روا رکھتیں۔ جسم فروشی کا یہ کاروبار ان مخصوص جگہوں تک محدود تھا۔ سماجی طور پر جسم فروش طبقوں کی ایک خاص شناخت تھی اور عام لوگ ان کو ایک طرح کی نفرت اور طنز کی نظر سے دیکھتے تھے۔ عام لوگوں کے ساتھ ان پیشہ ور خاندانوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا زیادہ میل ملاپ نہ تھا اور عموماً غیر پیشہ ور لوگ ان کے ساتھ تعلق رکھنے سے کتراتے تھے۔ ان طبقات سے تعلق رکھنے

والے لوگوں کا پہلا واضح رابطہ فلمسازوں کے ساتھ ہوا کیونکہ فلمسازوں کو اپنی فلموں کے نسوانی کرداروں کیلئے اس طبقے کی ضرورت پڑی۔ عام لوگوں کے ہاں یہ بات مشہور تھی کہ شریف گھرانوں کی عورتیں فلموں میں کام نہیں کر سکتیں۔ فلموں میں وہ عورت کام کرتی ہے، جس کا کردار اچھا نہیں ہوتا اور برے کردار کی وجہ سے اس کی مخصوص نسوانی شرم و حیا چونکہ ختم ہو جاتی ہے اس لئے وہ آسانی کے ساتھ فلموں میں بے حیائی کا مظاہرہ کر سکتی ہے۔ اس کے علاوہ معاشرے میں مذہبی اقدار کی موجودگی بھی عام لوگوں کو اس طرف نہیں آنے دیتی کیونکہ وہ پردے کو لازمی جزو قرار دیتے ہیں اور بے پردہ عورتوں کو بے حیا تصور کرتے ہیں۔

جن خاندانوں نے شروع میں فلموں اور اسٹیج کی طرف رخ کیا ان کو عام معاشرے میں خصوصی نفرت اور طنز کا سامنا کرنا پڑا۔ عام معاشرہ گانے والیوں اور ناچنے والیوں کو اخلاق باختہ تصور کرتا تھا اس لئے یہ تصور بھی عام ہو گیا کہ جو عورت فلموں میں کام کرے گی اس کا کردار خراب ہو گا کیونکہ کوئی شریف آدمی اپنی عورتوں کو فلموں میں کام کرنے کی اجازت اس لئے نہیں دیتا کہ فلموں میں خراب لوگ کام کرتے ہیں اور وہ اچھے کردار کے مالک لوگوں کا بھی کردار خراب کر دیتے ہیں۔ اس مضبوط تاثر نے عام پڑھے لکھے لوگوں کی اولادوں کو فلم انڈسٹری کی طرف رجوع کرنے سے روکے رکھا اور فلم انڈسٹری کی حقیقی ضرورت کو ان بازاروں سے تعلق رکھنے والی عورتوں نے پر کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عام عورتوں کی نسبت ایک گانے اور ناچنے والی عورت زیادہ بااعتماد رویے کی مالک ہوتی ہے اور لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکتی ہے۔ شروع میں پاکستان کی فلم انڈسٹری کو تین ایسے شہروں سے اداکار عورتیں میسر آئیں جہاں جسم فروشی اور ناچ گانے کے باقاعدہ بازار تھے۔ لاہور کی ہیرا منڈی ملتان کے حرم گیٹ، اور حیدرآباد کراچی کے ایسے بازاروں سے فلمسازوں کو عورتوں کی ایک بڑی تعداد ملی جو فلموں میں کام کرنے کی خواہش مند تھی۔ ان میں بعض ایسی عورتیں بھی تھیں جو تعلیم یافتہ تھیں اور فلموں کی ضروریات کو پورا کر سکتی تھیں۔

اس روایت نے ان بازاروں سے تعلق رکھنے والیوں کو فلموں کی ضرورت بنا دیا اور

عام لوگوں کو فلموں سے دور کر دیا۔ جب پاکستان میں ٹی وی شروع ہوا تو شروع میں انہی بازاروں سے تعلق رکھنے والی عورتوں نے اس میں کام شروع کیا لیکن چونکہ فلم کی نسبت ٹی وی کا دائرہ کار زیادہ وسیع تھا اور اس پر زیادہ لوگوں کے کام کرنے کی گنجائش تھی اس لئے تمام پڑھے لکھے خاندانوں کی عورتوں نے بھی ٹی وی کی طرف رجوع کیا۔ ٹیلی ویژن نے آکر اس روایت کو توڑا کہ شوبز کی دنیا میں صرف بازار حسن سے تعلق رکھنے والی عورتیں جا سکتی ہیں۔ بڑے بڑے معزز اور تعلیم یافتہ گھرانوں کی عورتوں نے ٹی وی کا رخ کیا اور اس روایت کو مضبوط کیا۔

جو لوگ صرف فلم سے منسلک ہو کر رہ گئے تھے ان کا تعلق اب بھی ہیرا منڈیوں اور بازار حسن سے تھا۔ فلم میں چونکہ زیادہ تعلیم یافتہ لوگوں کی ضرورت نہیں پڑی تھی اس لئے عام اور ان پڑھ ناظرین کیلئے جو فلمیں تیار کی جاتیں ان میں عام سی ذہانت کی مالک عورتوں کو ہی ہیروئن یا دوسرے کرداروں کے روپ میں دکھایا جاتا۔ فلم کو چونکہ زیادہ پذیرائی حاصل نہ ہو سکی اس لئے فلموں میں کام کرنے والوں کو وقت کے ساتھ ساتھ زیادہ معاوضہ نہ مل سکا۔ جو لوگ اس پیشے کے ساتھ منسلک تھے جب ان کو خاطر خواہ معاوضہ نہ مل سکا تو انہوں نے اپنے پچھلے پیشے کی طرف بھی رجوع کرنا شروع کر دیا اور فلم کے ذریعے حاصل ہونے والی شہرت کے ساتھ باقاعدہ جسم فروشی کا دھندہ شروع کر دیا۔

فلم کے باعث اس کی ہیروئن کی خوبصورتی اور اس کے جسم کی جزئیات عام لوگوں تک پہنچ جاتی تھیں اور جب اس ہیروئن کے چاہنے والوں کو یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ وہ اپنی من پسند ہیروئن کو ایک خاص رقم کے عوض حاصل کر سکتے ہیں تو پھر فلم سے منسلک ہیروئنوں کی جسم فروشی کا دھندہ خود ہی کامیابی کی منازل طے کرنے لگتا۔ فلم بین جب اگلی شام اپنی پسندیدہ ہیروئن کے ساتھ جسمانی تعلق قائم کر کے وقت گزار سکتا تھا تو اس صورت میں اس ہیروئن کا پیشہ کیوں نہ ترقی کرتا۔ 70ء کے شروع میں شاید کوئی بھی ایسی فلمی ہیروئن نہیں تھی جو اداکاری کے ساتھ ساتھ جسم فروشی کا دھندہ نہیں کرتی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ روایت زور پکڑنے لگی اور جسم فروشی کے باقاعدہ کاروبار کی طرف لوگوں نے رجوع کرنا شروع کیا۔ پاکستان میں جسم فروشی کے اس کاروبار کی شروعات کرنے والوں کا

جب تعین کیا جائے گا تو اس سلسلے میں فلمی ہیروئن اور ان کے خاندانوں کو ترجیح دی جائے گی جسم فروشی اور فلم انڈسٹری لازم و ملزوم کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ پاکستان میں کوئی بازار حسن یا ہیرا منڈی ایسی نہیں جس سے تعلق رکھنے والی عورتوں نے فلم انڈسٹری میں نام نہ کمایا ہو جیسے مثال کے طور پر لاہور کی ہیرا منڈی اس سلسلے میں "مال" سپلائی کرنے والی سب سے بڑی منڈی ہے۔ ملتان کے بازار حسن حرم گیٹ نے بھی پاکستان کی اردو اور پنجابی فلموں کو لاتعداد خوبصورت اداکارائیں دی ہیں اسی طرح حیدرآباد کی ہیرا منڈی سے بھی کئی اداکارائیں فلموں میں کامیاب ہوئیں ان تمام ہیروئنوں اور ان کے خاندانوں نے معاشی ترقی کی منازل کو تیزی کے ساتھ طے کرنے کیلئے جسم فروشی کے اڈے قائم کئے اور اپنی مشہور ہیروئنوں کو ان اڈوں پر بٹھایا اور ساتھ دیگر لڑکیوں کو بھی اس دھندے میں جھونک کر کامیابیاں حاصل کیں۔ جب فلموں کے ساتھ ساتھ جسم فروشی کے کاروبار نے دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کی تو حیدرآباد، کراچی اور ملتان سے تعلق رکھنے والی عورتوں کے خاندان لاہور آکر آباد ہو گئے۔ یہاں انہوں نے کروڑوں روپے کی جائیدادیں خریدیں اور مستقل جسم فروشی کے اڈے بنائے۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ان جسم فروشوں نے خلیجی ریاستوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا اور "ثقافتی طائفوں" کی آڑ میں عربوں کو عورتیں سپلائی کی جانے لگیں۔ درجنوں کی تعداد میں جسم فروش لڑکیاں خلیجی ریاستوں میں اپنے "فن کا مظاہرہ" کرنے جاتیں اور کروڑوں روپے لے کر لوٹتیں پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جسم فروشی کا کاروبار کرنے والوں کے پاس جسم فروش عورتوں کی کمی ہو گئی انہوں نے اپنے رشتہ داروں کو بھی ساتھ ملا لیا لیکن طلب کو پھر بھی پورا نہ کیا جا سکا تو باقاعدہ تنخواہوں اور کمیشن پر بے روزگار، بیواؤں، طلاق یافتہ اور حتیٰ کہ طالبات تک کی خدمات حاصل کر لی گئیں۔ ٹی وی اور فلموں میں اداکاری کے نام پر کالجوں اور یونیورسٹیوں سے خوبصورت اور نوجوان لڑکیوں کو اکٹھا کیا جاتا اور بالآخر ان کو پرکشش معاوضوں پر جسم فروشی کی طرف مائل کر لیا جاتا۔ اس طرح 80ء کے شروع میں پاکستانی معاشرے میں جسم فروشی کا دھندہ پوری قوت کے ساتھ اور جدید لوازمات کے ساتھ بڑے بڑے شہروں میں شروع ہوا۔ شروع میں بڑے ہوٹلوں، ریستورانوں اور کلبوں وغیرہ میں اس دھندے کو روشناس کرایا گیا جبکہ بعد میں پیشہ ور لوگوں نے اس مقصد کیلئے

ہوٹلوں کے کمرے اور پوش آبادیوں میں کوٹھیاں اور بنگلے حاصل کر لئے۔ بیوروکریٹوں اور سیاستدانوں کو اولین طور پر گاہک بنایا گیا اور نقد رقوم کے علاوہ ان کے ذریعے ٹھیکے اور دیگر کام کروائے جانے لگے اس مقصد کیلئے مقامی پولیس کی خدمات بھی حاصل کی جانے لگیں تاکہ ان کا کاروبار متاثر نہ ہو سکے۔ پولیس کو اس کا حصہ باقاعدگی کے ساتھ ملنے لگا اور وہ معاون کے طور پر اس کاروبار میں حصہ ڈالنے لگی۔

بڑے بڑے شہروں میں باقاعدہ جسم فروشی کے اڈے بن گئے اور لوگوں کی بڑی تعداد ان سے مستفید ہونے لگی۔ ضیاء الحق دور میں جب حدود آرڈی نینس کا نفاذ کیا گیا تو عام سیکولر حلقوں کی تنقید میں سب سے زور دار آواز ان اڈوں اور کاروبار کے مالک لوگوں کی تھی جو حدود آرڈی نینس کو اپنے کاروبار کیلئے خطرہ محسوس کرتے تھے۔ لیکن حدود آرڈی نینس نے ان لوگوں کا کچھ نہیں بگاڑا کیونکہ انہوں نے بیوروکریسی اور سیاستدان کو شروع ہی میں اپنا گرویدہ بنا لیا تھا اس لئے ان لوگوں کی موجودگی میں یا ان کی سرپرستی کے باعث کسی قانون نافذ کرنے والے ادارے کی جرات نہ تھی کہ وہ کسی اڈے پر ہاتھ ڈال سکے اور کسی پیشہ ور جسم فروش کے خلاف حدود آرڈی نینس کے تحت مقدمہ قائم کر سکے ضیاء الحق کی طرف سے حدود آرڈی نینس کا نفاذ دراصل معاشرے میں پائی جانے والی بے حیائی کا تدارک کرنے کیلئے تھا لیکن اس کو معلوم نہیں تھا کہ قوانین کے نفاذ کو عملی شکل دینے والے پہلے ہی قانون شکن قوتوں کے آلہ کار بن چکے ہیں اور اس کی طرف سے نافذ کئے جانے والے کسی کڑے قانون کی بھی پرواہ نہیں کی جائے گی۔ اس طرح اس کاروبار کو ختم کرنے کیلئے قانون سازی بھی کامیاب نہ ہو سکی اور یہ کاروبار تیزی کے ساتھ پھیلنے لگا اور چھوٹے بڑے شہر اس کی لپیٹ میں آتے گئے دھڑا دھڑ نئے اڈے قائم کئے جانے لگے اور گاہکوں کو پھنسانے کیلئے نت نئے حربے اختیار کئے جانے لگے۔

بڑے وثوق کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان کے مختلف شہروں میں جسم فروشی کے باقاعدہ اڈے جو بازار حسن سے ہٹ کر عام آبادیوں میں قائم کئے گئے ان کے بانی وہ لوگ تھے جن کا تعلق فلمی دنیا سے تھا۔ یا تو ان کے خاندان کی عورتیں فلمی دنیا سے تعلق رکھتی تھیں یا پھر وہ کسی نہ کسی حوالے سے فلمی دنیا سے تعلق رکھتے تھے۔ مثال کے طور پر 1973ء میں لاہور کے علاقے ماڈل ٹاؤن کی ایک بہت بڑی کوٹھی میں جسم فروشی

کا اڈہ قائم کیا گیا اس کا مالک ایک ریٹائرڈ پولیس آفیسر تھا جس کی دوسری بیوی فلموں میں اداکاری کرتی تھی۔ مذکورہ پولیس آفیسر نے جب دوسری شادی کی تو اس وقت وہ ایک بڑے ضلع کا ایس پی تھا جس عورت کے ساتھ اس نے شادی کی وہ دو بار کی طلاق یافتہ تھی اور فلموں میں کام کرتی تھی۔ شادی کے بعد مذکورہ پولیس آفیسر کو اس کے معزز خاندان خصوصاً پہلے سسرال والوں نے برا بھلا کہا اور بالآخر اس سے علیحدگی اختیار کر لی۔ مذکورہ آفیسر نے ماڈل ٹاؤن میں ایک بڑی کوٹھی خرید کر اس میں نئی بیوی کے ساتھ رہنا شروع کر دیا۔ جب اس نے پولیس کی ملازمت سے ریٹائرمنٹ حاصل کی تو پھر اس کا تعلق فلمی دنیا کے ساتھ پوری طرح مضبوط ہو چکا تھا لہٰذا اس نے اپنے آپ کو معروف رکھنے کیلئے اپنی اس کوٹھی میں ایک برائے نام ریسٹ ہاؤس کھول لیا اور مہمانوں کو فلمی دنیا سے تعلق رکھنے والی عورتیں پیش کرنے لگا ماڈل ٹاؤن کے اس ریسٹ ہاؤس کو لاہور کی ہیرا منڈی کے بعد عام آبادی میں کھولا جانے والا پہلا باقاعدہ چکلہ قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ اس ریسٹ ہاؤس نے جسم فروشی کے اڈے کی حیثیت سے تقریباً دس سال تک اپنے معزز گاہکوں کی خدمت کی۔ 1983ء کے وسط میں اس اڈے کو بند کر دیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مقامی پولیس کے ایک آفیسر نے سادہ کپڑوں میں اس ریسٹ ہاؤس پر چھاپہ مارا اور یہاں پر ایک حاضر سروس فوجی جرنیل کو داد عیش دیتے ہوئے گرفتار کر لیا۔ حاضر سروس جرنیل نے گرفتاری سے بچنے کیلئے مذکورہ پولیس آفیسر کو اپنا تعارف کرایا اور سنگین نتائج کی دھمکیاں دیں لیکن پولیس آفیسر نے ہتھکڑی لگا کر اس جرنیل کو تھانے کی حوالات میں بند کر دیا۔ بعد میں رسمی کارروائی کے طور پر اس پولیس آفیسر کو گرفتار کر لیا گیا اور کچھ عرصہ ملازمت سے معطل رکھنے کے بعد دوبارہ بحال کر دیا گیا۔ ایک واقف حال کے بقول یہ ساری کارروائی جنرل ضیاء الحق نے آئی ایس آئی کے ذریعے کروائی تھی۔ مذکورہ ایجنسی نے جب یہ معلوم کر لیا کہ ضیاء الحق کا ناپسندیدہ جرنیل ریسٹ ہاؤس میں داد عیش دے رہا ہے تو ضیاء الحق کی اجازت کے بعد مقامی پولیس آفیسر کے ذریعے اس کو گرفتار کرایا اور اعلیٰ فوجی کمان نے اس جرنیل کو چھ ہفتے میں فارغ کر دیا۔

اس واقعہ کے بعد مذکورہ ریسٹ ہاؤس میں موجود جسم فروشی کا اڈہ بند کر دیا گیا اور اس کا مالک پولیس آفیسر اپنی بیوی سمیت کراچی منتقل ہو گیا جہاں اس نے جدید علاقے

کلفٹن میں ایک کوٹھی خرید کر اس میں جسم فروشی کا دھندہ شروع کر دیا۔ ماڈل ٹاؤن کے اس ریسٹ ہاؤس کے علاوہ بعض لوگ گلبرگ کے علاقے میں واقع ماضی کی ایک معروف اداکارہ کے گھر کو بھی آبادی میں قائم پہلا جسم فروشی کا اڈہ قرار دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مذکورہ اداکارہ نے اپنے گھر میں 1972ء میں جسم فروشی کا اڈہ قائم کیا اس اڈے پر ذوالفقار علی بھٹو کابینہ کے بعض وزراء اور اعلیٰ فوجی افسران بھی باقاعدگی سے حاضری دیتے تھے۔ مذکورہ اداکارہ ان دنوں فلموں میں کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی تھیں اور ان کی ایک بہن ان کیلئے پوش علاقوں سے گاہک تلاش کرتی تھی۔ اس اداکارہ کا خاوند جو خود فلمی دنیا سے تعلق رکھتا تھا اس نے بھی اعلیٰ فوجی و سول حکام سے تعلقات استوار کئے اور ان رابطوں کو مستحکم بنانے کیلئے اپنی بیوی کے جسم کو استعمال کیا۔ اس کی اداکارہ بیوی جس کے حسن کے چرچے ہر طرف پھیلے ہوئے تھے اس نے اپنے گھر پر آنے والے گاہکوں کی تسلی کیلئے باقاعدہ مالش کرنے والی اور شراب بنا کر پیش کرنے والی لڑکیاں بھرتی کر رکھی تھیں۔ اس کے گھر میں قائم جسم فروشی کے اڈے کے بارے میں گورنر ہاؤس تک مکمل معلومات تھیں لیکن اس اداکارہ اور اس کے خاوند پر ہاتھ نہیں ڈالا جا سکتا تھا کیونکہ ان کے تعلقات کا دائرہ بہت وسیع تھا اور ذرائع کے مطابق اس وقت کا وزیر اعظم بھی ان کا ذاتی دوست تھا۔

اس اداکارہ کے جسم فروشی کے اڈے پر پہلی بار 1977ء میں مارشل لاء کے دوران ایک حساس ادارے کے افسران نے چھاپہ مارا۔ جس وقت اس اڈے پر چھاپہ مارا گیا تو وہاں بعض اعلیٰ عہدیداران موجود تھے جبکہ اڈے کی مالک اداکارہ نے اپنے مہمانوں کیلئے چھ لڑکیاں کراچی سے خصوصی طور پر منگوا رکھی تھیں۔ چھاپے کے دوران فوجی حکام نے مقامی انتظامیہ کو اس کی اطلاع نہ دی اور نہ ہی متعلقہ اداکارہ اس کے شوہر اور دیگر "معزز مہمانوں" کو کچھ کہا گیا۔ اگلے ہفتے اس اداکارہ کو حکم دیا گیا کہ وہ جسم فروشی کے اس اڈے کو بند کر دے اور آئندہ اس کے گھر پر کوئی سرکاری آفیسر نہ آئے۔ واقفان حال بتاتے ہیں کہ مذکورہ اداکارہ نے اسی رات جہاز کے ذریعے اسلام آباد کا سفر کیا اور اپنے قدیمی کرم فرماؤں سے ملاقات کر کے فریاد کی۔ اگلے دن بندش کا حکم نامہ واپس لے لیا گیا اور دوبارہ جسم فروشی کے کام کا باقاعدہ افتتاح سندھ کی ایک عظیم شخصیت نے اپنے مقدس ہاتھوں سے کیا۔ اس رات مذکورہ اداکارہ کے گھر میں جشن کا سماں رہا اور ساری رات

مہمانوں کو ولایتی شراب اور مقامی لڑکیاں پیش کی جاتی رہیں۔ غرض فوجی حکومت کے پورے دور میں مذکورہ اڈہ پوری آب و تاب کے ساتھ چلتا رہا اور جب تک اس اداکارہ نے دوسری شادی کر کے رہائش گاہ تبدیل نہ کر لی اس کے اڈے کو بند نہ کیا جا سکا۔ اس اداکارہ نے نئی اور جدید آبادی لاہور ڈیفنس میں نیا گھر لیا اور نئے شخص سے شادی کر لی۔ یہاں پر اس نے اپنا کاروبار نہیں شروع کیا بلکہ لاہور کے ایک فائیو سٹار ہوٹل میں ملازم ایک شخص کے ذریعے فون پر مال بک کرنا شروع کر دیا یہ سب سے محفوظ اور منافع بخش کام تھا۔ اس نے ایک درجن سے زائد لڑکیاں بھرتی کر لیں اور معزز مہمانوں کو ان کے کمروں میں سروس بہم پہنچائی جانے لگی۔ لڑکیوں کو فون کر کے ان کا کمرہ بتا دیا جاتا اور مہمان سے معاوضے کی رقم مذکورہ ہوٹل کا ملازم وصول کر لیتا۔ اگلے روز وصول شدہ رقم میں سے مذکورہ ملازم اپنا کمیشن رکھ کر باقی رقم "باجی" کو پہنچا دیتا جو اسی وقت اپنا کمیشن کاٹ کر باقی "مال" محنت کرنے والی لڑکیوں میں تقسیم کر دیتی۔

ماڈل ٹاؤن کے مذکورہ ریسٹ ہاؤس اور پھر گلبرگ میں واقع اداکارہ کے اڈے کے بعد لاہور میں نئے اڈے قائم کر کے جسم فروشی کا کاروبار کرنے کی ایک جاندار روایت کا آغاز ہوا۔ تیسرا اڈہ سمن آباد لاہور میں ایک فلم ایکٹر نے شروع کیا۔ یہ اڈہ 1980ء کے شروع میں قائم کیا گیا۔ سمن آباد کے ایک نئے تعمیر ہونے والے محلے میں مذکورہ اداکار کے بھائی نے ایک ڈبل سٹوری مکان تعمیر کروایا۔ شروع میں اس مکان میں ایک میوزک اکیڈمی قائم کی گئی جہاں ایک مشہور استاد طالب علموں کو موسیقی کا درس دیا کرتا تھا لیکن یہ اکیڈمی مطلوبہ نتائج برآمد نہ کر سکی اور اس کو بند کر کے مکان کا اوپر والا پورشن کرائے پر دیدیا گیا۔ نیا کرائے دار ایف آئی اے کا ملازم تھا جس نے گھر کے دروازے پر اپنی سرکاری نیم پلیٹ لگا دی اور یوں عام دیکھنے والے مرعوب ہونے لگے۔ مذکورہ اداکار کے بھائی نے نیچے والے پورشن میں جسم فروشی کا دھندہ شروع کر دیا۔ اس اڈے کے اولین گاہکوں میں فلمساز، فلموں میں سرمایہ کاری کرنے کے شوقین افراد، پولیس کے افسران، تاجر اور ضلعی انتظامیہ کے لوگ وغیرہ شامل تھے۔

جسم فروشی کے اس اڈے پر سات لڑکیاں بھرتی کی گئیں اور لوگوں کو اپنی پسند کی عورتیں ساتھ لیجانے کی بھی سہولت دی گئی۔ ایک واقف حال نے بتایا کہ مذکورہ اڈے

کیلئے اس کے مالک نے لاہور کے ایک مشہور کالج سے لڑکیاں حاصل کیں۔ اس اداکار کی بیٹی اس کالج میں زیر تعلیم تھی جس کے ذریعے وہ ایسی ضرورت مند اور خوبصورت لڑکیوں تک پہنچا جن کو رازداری کے ساتھ اپنے کاروبار کیلئے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ مختلف دیہات سے تعلق رکھنے والی ان لڑکیوں کو معاوضے کے طور پر بھاری رقوم ملنا شروع ہوئیں اور ان کے بارے میں ان کے گھر والوں اور سہیلیوں میں شکوک و شبہات پیدا ہونا شروع ہو گئے۔ زور دار دھماکہ اس دن ہوا جب سمن آباد کے اس اڈے سے لاہور لبرٹی مارکیٹ کے امیر کبیر تاجروں نے پانچ لڑکیاں ایک ایک ہفتہ کیلئے بک کیں اور ان کو اپنے ساتھ مری لے گئے۔ مری کے مضافات میں واقع ایک مہنگے ہوٹل میں ان لوگوں نے کمرے کرائے پر لئے اور سیر کے ساتھ ساتھ عیاشی بھی کرنے لگے۔ یہ لوگ لاہور سے ہی مکمل اہتمام کے ساتھ مری پہنچے تھے۔ مری کے عوامی مقامات پر ان لوگوں نے مذکورہ لڑکیوں کے ساتھ شراب پی کر غل غپاڑہ کرنا شروع کر دیا۔ انہی دنوں ایک اعلیٰ فوجی عہدیدار بھی اس ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا جس نے پولیس کے مقامی اعلیٰ افسر کو بھاری نفری سمیت ہوٹل میں طلب کر لیا۔ پولیس نے چھاپہ مار کر پانچ لڑکیوں سمیت ۹ افراد کو شراب کے نشے میں دھت برہنہ حالت میں گرفتار کر لیا گیا۔ اگلے روز پورے ملک کے اخبارات میں ان گرفتار شدہ لڑکیوں اور لڑکوں کی تصاویر، ان سے برآمد ہونے والی شراب، لڑکیوں کے خاندانوں کے بارے میں مکمل تفصیلات اور ان کے اڈے کے بارے میں ہر چیز نمایاں سرخیوں کے ساتھ شائع ہو گئی۔

پولیس کی ایک پارٹی نے سمن آباد میں چھاپہ مار کر اڈے کے مالک کی بیوی کو گرفتار کر لیا لیکن مالک دبئی فرار ہو جانے میں کامیاب ہو گیا۔ دولت مند تاجروں نے اگلے روز ضمانتیں کروالیں لیکن ان لڑکیوں کی مدد کرنے کو کوئی تیار نہیں تھا۔ ان لڑکیوں کے لواحقین نے بدنامی کے خوف سے ان کی طرف رخ نہ کیا جبکہ لاہور کی ایک معروف سیاسی شخصیت نے انہیں ضمانت پر رہائی دلائی۔ اس واقع کے بعد سمن آباد والا اڈا بند کر دیا گیا اور لڑکیوں کے بارے میں یہی سنا گیا کہ انہوں نے اپنے اپنے گھروں کو جانے سے انکار کر دیا جبکہ ایک لڑکی کو اس کے منگیتر نے انتہائی بے دردی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا۔ تقریباً ایک سال تک یہ اڈہ بند رہا اس کے بعد دوبارہ یہاں پر جسم فروشی کا دھندہ

شروع کر دیا گیا۔ واضح رہے کہ مری میں گرفتار ہونے والی لڑکیوں میں اڈے کے مالک کی اپنی بیٹی بھی شامل تھی جو بعد میں پنجابی فلموں کی ایک معروف اداکارہ بنی۔ تین چار سال تک اداکاری کرنے کے بعد اس نے ایک پروڈیوسر کے ساتھ شادی کر لی اور لندن میں ایک گھر لے کر رہنا شروع کر دیا۔ آج کل یہ ماضی کی اداکارہ لندن سے امریکہ شفٹ ہو چکی ہے اور اس نے امریکہ میں پاکستانیوں کیلئے عیاشی کا ایک اڈہ کھول رکھا ہے۔

ایک سال کی بندش کے بعد جب سمن آباد والے اس اڈے کو دوبارہ شروع کیا گیا تو اس کی ساکھ بہت زیادہ متاثر ہو چکی تھی اور اس کے پاس گاہک نہ ہونے کے برابر تھے۔ اب اڈے کے مالک نے جو عورتیں جسم فروشی کیلئے بھرتی کیں ان کا تعلق اندرون لاہور کے غریب خاندانوں اور لاہور کی ہیرا منڈی سے تھا۔ مقامی پولیس کو رشوت دی جاتی تھی۔ آہستہ آہستہ گاہکوں کا اعتماد بحال ہونے لگا۔ 1986ء میں اڈے کے مالک نے سمن آباد کا علاقہ چھوڑ کر کیولری گراونڈ میں نیا گھر خرید لیا اور اس جدید علاقے میں دھندہ شروع کر دیا۔ کیولری گراونڈ میں جسم فروشی کے اس اڈے نے بہت زیادہ شہرت اور کامیابی حاصل کی اور مسلسل دس سال تک یہ اڈہ اپنے گاہکوں کو تحفظ اور مال فراہم کر کے ان کی تعداد بڑھاتا رہا۔ 1996ء کے شروع میں اڈے کے مالک کو ایک جسم فروش لڑکی کے عاشق نے رات کے وقت گولی مار کر قتل کر دیا اور یوں "منتظم اعلیٰ" کی عدم موجودگی کے باعث یہ اڈہ ختم ہو گیا۔

سمن آباد سے شروع ہو کر کیولری گراونڈ میں ختم ہونے والے اس اڈے کو پولیس اور دیگر انتظامیہ کی مکمل حمایت حاصل رہی۔ اڈے کا مالک پولیس اور دیگر افسروں کو بھی مال فراہم کرتا رہا اور یوں اس کا کاروبار ترقی کرتا گیا۔ اس اڈے کے مالک نے پہلی بار لاہور میں (TAKE AWAY) کی سہولت فراہم کی اور لوگوں کو شخصی ضمانت پر لڑکیاں فراہم کر دی جاتیں، لوگ ان کو اپنے ٹھکانوں یا شہر کے ہوٹلوں یا شمالی علاقوں میں پر فضا مقامات پر لیجاتے اور وقت مقررہ پر واپس چھوڑ جاتے۔ جب اس کا کاروبار زیادہ ترقی کر گیا تو اس نے پانچ جدید گاڑیاں خرید لیں اور ڈرائیور بھرتی کر لئے۔ اس طرح اس کے کاروبار نے ایک اور رخ اختیار کر لیا۔ اب لوگوں کو اس کے پاس آ کر لڑکیاں منتخب کر کے ساتھ لیجانا نہیں پڑتا تھا بلکہ گاہک کے فون پر چار پانچ لڑکیاں

ڈرائیور کے ساتھ روانہ کر دی جاتیں، جو پسند آجاتیں انہیں وہیں چھوڑ کر باقی لڑکیوں کو واپس لیجایا جاتا۔ ہوشیار مالک نے ان گاڑیوں کے شیشے سیاہ کروا دیے اور پیشہ ور لڑکیوں کو برقع وغیرہ اوڑھنے کی ہدایت کر دی اس طرح شک کی گنجائش ہمیشہ کیلئے ختم ہو کر رہ گئی۔ بہت سے لوگ ان عورتوں کو اپنے گھروں پر بلاتے اور جب یہ عورتیں بڑی گاڑیوں سے باپردہ برآمد ہوتیں تو دیکھنے والے انہیں گھر کی عورتیں یا معزز مہمان تصور کرتے۔ ایک عینی شاہد کے مطابق اکثر ایسا ہوتا کہ کوئی اہم حکومتی یا سیاسی شخصیت کسی پر فضا مقام پر ٹھہرتی تو ان لڑکیوں کو بھی باپردہ انداز میں اس کی رہائش گاہ تک پہنچا دیا جاتا اور اس شخصیت کے ارد گرد موجود لوگوں کو کبھی یہ شک نہ گزرتا کہ آنے والے معزز مہمان دراصل پیشہ ور جسم فروش ہیں جنہیں ہوشیاری کے ساتھ یہاں پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ تو تھی کہانی ایک کامیاب ترین جسم فروشی کے اڈے کی۔

80ء کے عشرے کے وسط میں جب ملک میں سیاسی سرگرمیاں انتخابی مرحلوں سے گزر کر آگے بڑھنے لگیں تو معاشرے میں ایک طرح سے تبدیلی محسوس کی گئی۔ ضیاء الحق نے جس بے دردی کے ساتھ اپنے حواریوں میں دولت تقسیم کی تھی اس کے اثرات عام معاشرے پر بھی پڑنے لگے۔ غیر جماعتی انتخابات میں ایسے لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد اقتدار کے ایوانوں میں پہنچ گئی تھی جن کا تعلق باقاعدہ جرائم پیشہ خاندانوں سے تھا۔ نوجوانوں اور امیر ارکان پارلیمینٹ قانون سازی جیسے خشک اور دقیق معاملات کو کیسے نبھا سکتے تھے، انہوں نے پوری قوت کے ساتھ ایسے لوگوں کے ساتھ رابطے پیدا کرنا شروع کئے جو ان کو عیاشی کے لوازمات بہم پہنچا سکتے تھے۔ اکثر ارکان پارلیمنٹ فلم اور ٹی وی پر کام کرنے والی اداکاروں کی طرف متوجہ ہوئے اور بے تحاشہ دولت خرچ کر کے انہیں حاصل کرنے لگے۔ اس روایت نے جسم فروشی کے حامل لوگوں کے حوصلے بلند کر دیئے اور انہوں نے اس کاروبار کو بڑے پیمانے اور جدید خطوط پر شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ انتخابات میں فتح کے بعد ان لوگوں کی اہمیت بڑھ گئی تھی اور انہوں نے اپنی روایتی رہائش گاہوں کو چھوڑ کر پوش علاقوں میں گھر لینے شروع کر دیئے تھے۔ اس لئے جسم فروشی کا دھندہ کرنے والوں نے بھی ایسے علاقوں کی طرف رجوع کیا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق صرف لاہور میں 85ء سے 90ء تک کے پانچ برسوں

ں دو درجن سے زائد جسم فروشی کے اڈے ڈیفنس، کیولری گراؤنڈ، ماڈل
ؤن، گلبرگ، گارڈن ٹاؤن اور دیگر پوش علاقوں میں کھولے گئے۔ ان اڈوں پر خصوصی
ہتمام کے ساتھ جسم فروش لڑکیاں رکھی گئیں اور یوں اس کاروبار کو آگے بڑھایا گیا۔
اہکوں کی شکل میں بر سر اقتدار اور طاقتور لوگ موجود تھے لہٰذا کسی ڈر یا خوف کو ملحوظ خاطر
ہ رکھا گیا۔ اگلے صفحات میں ہم تفصیل کے ساتھ صرف لاہور کے ان اڈوں کا ذکر کریں
گے جہاں جسم فروشی کا دھندہ پورے زور و شور کے ساتھ شروع کیا گیا اور اڈوں کے
الکوں نے دولت اکٹھی کی۔ ان اڈوں کے مالکوں یا مالکنوں کے بارے میں لکھتے ہوئے یہ
حتیاط برتی گئی ہے کہ ان کے اصل نام نہ لکھے جائیں کیونکہ حقائق کو برداشت نہ کرنے کی
مضبوط روایت کے پیش نظر یہ لازم تھا۔ البتہ ان اڈوں کے مقام کے بارے میں مکمل
وائف یہاں درج کئے جا رہے ہیں۔

کلیم کا ڈیرہ

لبرٹی مارکیٹ کے عقب میں ایک مشہور جواری کلیم نے 1985ء کے آخر میں ایک
کوٹھی کرائے پر لے کر یہاں جسم فروشی کا دھندہ شروع کیا۔ کلیم کا تعلق لاہور کے
علاقے ماڈل ٹاؤن سے تھا اور اس نے کچھ عرصہ تک فلموں میں معمولی رول بھی ادا کئے۔
فلموں میں اس نے اداکاری حاصل کرنے کیلئے تقریباً 5 سال ضائع کر دیئے لیکن اس کو
صل کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ اس نے اس دوران ماڈل ٹاؤن میں ایک بوتیک بھی شروع
کی جہاں نوجوان لڑکیوں کو ملازم رکھا گیا لیکن اس کا یہ کاروبار بھی مطلوبہ ترقی نہ کر سکا۔
ذرائع کے مطابق کلیم نے بوتیک پر ملازم لڑکیوں کے ساتھ ناجائز مراسم قائم کئے اور پھر
ن کو اپنے دوستوں سے متعارف کروانے لگا۔ کلیم کے دوستوں نے ان لڑکیوں کو استعمال
کیا لیکن اس سے کلیم کو کوئی فائدہ نہ پہنچا اور اس کا بوتیک نہ صرف ناکام ہو گیا بلکہ بدنام
بھی ہونے لگا۔ تقریباً ایک سال تک اس نے خسارہ اور بدنامی اکٹھے برداشت کئے اس
دوران یہ کنگال ہو گیا۔ پیسہ ختم ہو جانے کے بعد ایک بار پھر اس نے فلم سٹوڈیو کا رخ کیا
اور فلمسازوں کے ساتھ تعلقات بڑھانے لگا۔ فلمسازوں کے ساتھ تعلقات کے دوران
اس نے محسوس کیا کہ ان فلمسازوں کے پاس فلموں میں کام کرنے کیلئے جو لڑکیاں آتی ہیں

ان سے روابط قائم کئے جائیں اور ان کو چانس دلوانے کا جھانسہ دیا جائے۔ اس کام میں اس کو کامیابی حاصل ہوئی اور اس نے بعض لڑکیوں کو چانس بھی لے کر دیا لیکن اس کی ذاتی معاشی حالت مزید دگرگوں ہونے لگی۔ اسی دوران کلیم نے اخبارات میں یہ اشتہار دیدیا کہ ماڈلنگ سکھانے کا ایک ادارہ لبرٹی مارکیٹ میں قائم کیا گیا ہے ماڈلنگ سیکھنے کی شوقین لڑکیاں اس کے ساتھ فوری رابطہ کریں۔ اس نے 3000 روپے کرائے پر ایک چھوٹا سا دفتر قائم کیا اور اس کی دیواروں پر فلمی دنیا سے اپنے تعلق کے حوالے سے یادگار تصاویر آویزاں کر دیں۔

ماڈلنگ سیکھنے کی خواہش مند لڑکیوں نے بڑی تعداد میں اس کے ساتھ رابطہ کیا اور اس کے دفتر میں رونق بڑھنے لگی۔ جب اس کو یقین ہو گیا کہ وہ ماڈلنگ کی شوقین ان لڑکیوں کو اپنے اصل مقصد کیلئے استعمال کر سکتا ہے تو اس نے ماڈل ٹاؤن میں واقع اپنا گھر فروخت کر دیا اور لبرٹی مارکیٹ کے پاس ایک کوٹھی خرید لی۔ اداکاری کے زمانے ہی میں اس کی بیوی اس کو چھوڑ کر جا چکی تھی لہٰذا اس نے اپنی بوڑھی ماں کو لبرٹی مارکیٹ کی اس کوٹھی میں منتقل کیا اور یہاں رہنا شروع کر دیا۔ ماڈلنگ کی شوقین لڑکیاں جن کا تعلق عموماً غریب گھرانوں سے تھا ان کو بھی اس کوٹھی میں عارضی رہائش فراہم کر دی گئی۔ کلیم جو خود ماڈلنگ سے قطعی نابلد تھا اپنی شاگرد لڑکیوں کو اپنی کوٹھی میں یہی تربیت دیتا اور ان کو ایسے دوستوں سے متعارف کروانے لگا جن کے بارے میں لڑکیوں کو بتایا جاتا کہ وہ ایڈورٹائزنگ کمپنیوں کے مالک ہیں اور اگر وہ چاہیں تو ان کی قسمت لمحوں میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ بے چاری غریب لڑکیاں یوں ان نام نہاد ایڈورٹائزروں کی بھینٹ چڑھنے لگیں اور کلیم کا کاروبار آہستہ آہستہ ترقی کرنے لگا۔ اس نے لبرٹی کے تاجروں کے ساتھ بھی اپنے تعلقات استوار کئے اور انہیں اپنے گھر میں دعوت دینے لگا جہاں شراب نوشی کی محفل کے دوران ماڈلنگ کی شوقین مجبور لڑکیاں شراب کے ساتھ ساتھ ان کو جسم پیش کرتیں۔ دو تین سال میں کلیم کے اڈے نے بہت زیادہ شہرت حاصل کر لی۔ اس دوران اس کی بوڑھی ماں بھی مر گئی اور یوں اس نے مکمل آزادی کے ساتھ اس کاروبار کو جدید خطوط پر استوار کرنا شروع کر دیا۔ اس کے حالات تیزی کے ساتھ تبدیل ہونا شروع ہوئے اور اس کے رابطوں میں بے تحاشہ وسعت آگئی۔

کلیم نے جم خانہ اور دوسرے کلبوں کی رکنیت حاصل کی اور اس کی ملاقات متعدد
یاستدانوں اور اعلیٰ بیوروکریٹس کے ساتھ ہونے لگی۔ یہ لوگ کلیم کی "مہمان نوازی" کا
لف اٹھانے لگے۔ 90ء کے شروع میں کلیم کو کروڑ پتی کہا جاسکتا تھا کیونکہ اس کے دائرہ
ر میں نہ صرف بہت زیادہ امیر کبیر لوگ تھے بلکہ اس کو اسمبلیوں تک بھی رسائی حاصل
ئی۔ اس کے بارے میں لوگوں کو معلوم تھا کہ وہ کون سا دھندہ کرتا ہے لیکن اس پر کوئی
تھ نہیں ڈال سکتا تھا۔ بڑھتے ہوئے کاروبار کو قانونی شکل دینے کیلئے اس نے گلبرگ کے
اقے میں ایک بڑی کوٹھی خرید کر اس کو ریسٹ ہاؤس بنادیا اور خوبصورت لڑکیوں کو اس
ں ملازم رکھ لیا۔ لبرٹی مارکیٹ کے عقب میں واقع کوٹھی اس نے فروخت کر دی اور
یسٹ ہاؤس کے ذریعے اپنے کاروبار کو آگے بڑھانے لگا۔

کلیم نے جسم فروشی کیلئے لاہور کے کالجوں سے لڑکیاں حاصل کیں جبکہ اس نے
یک ویلفیئر سوسائٹی بھی رجسٹرڈ کروالی اور اس کی آڑ میں بھی اس کے خصوصی رابطے "
ئمات" کے ساتھ قائم ہوگئے۔ "بیگمات" کے اجلاسوں پر کلیم بہت زیادہ پیسہ خرچ
تا اور ان کے ذریعے مطلوبہ کام کیلئے لڑکیاں حاصل کرنے لگا۔ ویلفیئر سوسائٹی نے
ب بار پھر اس کی ذاتی ویلفیئر میں اہم کردار ادا کیا اور یوں اس نے ایک ناقابل تسخیر
ت حاصل کرلی۔ آج کل کلیم کا ریسٹ ہاؤس کامیاب اڈوں میں شمار ہوتا ہے اور اس کا
لفیئر کا "کاروبار" بھی بہت زیادہ ترقی حاصل کر چکا ہے۔ ماڈلنگ میں اپنی ایک شاگردہ
ے اس نے شادی کرلی تھی اور اس کو علیحدہ گھر لے کر دیدیا تھا تاکہ اس کی اپنی اولاد "
لنگ" سے اور اس کے ماحول سے دور رہے۔ اس کی اولاد جوان ہوچکی ہے اور
ریکہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہی ہے جبکہ اس کا جسم فروشی کا اڈہ ایک نیک نام اور
ید ترین ریسٹ ہاؤس کی صورت میں آج بھی قائم ہے اور گاہکوں کی ایک بہت بڑی
راد کا حامل ہے۔

ند کا ڈیرہ

چاند نامی اس نام نہاد تاجر کا اصل نام کوئی نہیں جانتا لیکن چاند کے نام سے اس کا
زیادہ چرچا ہے۔ پچھلے سال جب نواز شریف حکومت ختم کی گئی تو نئے حکمرانوں میں

سے کسی ایک کے خصوصی حکم پر چاند کو گرفتار کر لیا گیا اس کی گرفتاری کے ساتھ ہی اس کا "کاروبار" بھی ٹھپ ہو گیا لیکن اس نے گذشتہ ایک دھائی میں اتنی زیادہ دولت کما لی تھی کہ اب وہ کوئی بھی ڈھنگ کا کاروبار کر سکتا تھا۔ اس نے اسی طرح کیا اور اہم سفارش کے ذریعے رہائی حاصل کر کے دبئی چلا گیا جہاں اس نے ایک بہت بڑا ڈیپارٹمنٹل سٹور خرید لیا اور یوں دبئی میں اپنے خاندان کے ساتھ خوش و خرم زندگی گذار رہا ہے۔

بہاولپور کے ایک زمیندار گھرانے سے تعلق رکھنے والے چاند نامی اس نوجوان نے گورنمنٹ کالج سے ایم اے انگلش کیا اور لیکچرار کے طور پر ملازمت شروع کر دی۔ ایک سال بعد کالج کی ملازمت سے اس کا دل اچاٹ ہو گیا اور اس نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ ملازمت چھوڑنے کے بعد اس نے اپنے ایک دوست کے ساتھ مل کر ڈیفنس میں پراپرٹی کا کام شروع کیا 1996ء میں اس کا پراپرٹی کا کاروبار اپنے عروج پر تھا کہ اس نے یہ کاروبار بھی ختم کر دیا اور لاہور میں واقع ایک فائیو سٹار ہوٹل کے ایک منیجر کے ساتھ مل کر ہوٹل میں رہائش پزیر شوقین حضرات کو لڑکیاں فراہم کرنے لگا۔ اس کاروبار نے نہ صرف اس کی دولت میں اضافہ کیا بلکہ اس کے تعلقات کا دائرہ بھی وسیع کر دیا۔ لاہور کے ایک ڈپٹی کمشنر نے جو کہ رشتے میں اس کا چچازاد بھائی تھا اس کی حتی المقدور مدد کی اور اسے ایسے اچھے گاہکوں سے متعارف کروایا جو اس کی ترقی کا باعث بنے۔ چاند نے شادمان کے علاقے میں ایک مکان خرید لیا اور مذکورہ ہوٹل منیجر کے ساتھ مل کر ہوٹل کے علاوہ اپنے گھر میں بھی گاہکوں کو بہترین سہولیات فراہم کرنے لگا۔ اس کے مکان میں ہر وقت چھ سات لڑکیاں موجود رہتیں جو آنے جانے والوں کی ہر طرح سے خدمت کرتیں۔ چاند نے اپنے تعلقات کو صوبائی کابینہ تک وسیع کیا اور کئی شوقین وزراء کو اس کے ساتھ دیکھا جانے لگا۔ اس دوران ایک خفیہ ایجنسی نے بھی اس کی خدمات حاصل کر لیں اور اس کے ذریعے اپنے اہداف تک پہنچنے لگیں۔ خفیہ ایجنسی کے ساتھ تعلقات کے بعد چاند کا کاروبار زیادہ محفوظ اور جاندار ہو گیا۔

باوثوق ذرائع کے مطابق چاند نے اسلام آباد میں واقع ایک فائیو سٹار ہوٹل کے مالک کے ساتھ بھی اپنے تعلقات استوار کر لئے اور اس کے ہوٹل میں بھی اس نے اپنی

پرکشش "سروس" کا اجراء کر دیا۔ اس کے پاس جو لڑکیاں کام کرتی تھیں وہ ان کی سہولیات کا مکمل خیال رکھتا اور یہ مشہور ہے کہ اس نے اپنی ملازم ہر لڑکی کو گاڑی لے کر دی تھی تاکہ اسے کہیں آنے جانے میں دقت نہ ہو۔ اردو فلموں کی ایک مشہور اداکارہ کی بیٹی بھی اس کی ملازمین میں شامل تھی جس کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کے گاہکوں میں صوبے کی ایک اہم ترین شخصیت بھی شامل تھی جس کی وساطت سے چاند نے کئی لوگوں کو اربوں روپے کے تعمیراتی ٹھیکے لے کر دیئے اور ان سے بھاری کمیشن حاصل کیا۔ جب اس کے تعلقات ہر سو پھیل گئے تو اس نے وفاقی حکومت کے ایک طاقتور وزیر کے ساتھ مل کر جدید ترین گاڑیوں کی درآمد کا کام شروع کیا اور جیل روڈ لاہور پر ایک شاندار شوروم بنایا۔ گاڑیوں کا کام بھی بہت کامیابی کے ساتھ چل نکلا جبکہ اس کا اصل "کام" بھی دن بدن ترقی کرتا چلا گیا۔ شادمان میں واقع اس کا گھر جلد ہی قحبہ خانے کے طور پر مشہور ہو گیا لیکن پولیس یا کسی دوسرے ادارے نے اس پر چھاپہ مارنے کی جرات نہ کی۔

جب 97ء میں نواز شریف دوسری مرتبہ وزیر اعظم بنے تو چاند کے ایک قریبی عزیز کو حکومت میں ایک انتہائی طاقتور عہدہ دیا گیا۔ ذرائع کے مطابق اس تقرری میں چاند کا کردار تھا اور سابق وزیر اعظم کے ساتھ اس کے تعلقات بہت زیادہ دوستانہ تھے۔ نواز شریف کے اقتدار کے آخری دنوں میں چاند ان کے ساتھ باغ جناح میں کرکٹ بھی کھیلتا رہا۔ جب 12 اکتوبر 99ء کو نواز شریف حکومت ختم کی گئی تو اس رات چاند کو بھی اس کے گھر سے گرفتار کر لیا گیا لیکن دو ماہ تک اس کو قید میں رکھنے کے بعد رہا کر دیا گیا۔ اس نے شادمان والا مکان فروخت کیا اور اپنے خاندان کو لے کر دبئی چلا گیا جہاں اس کا کاروبار دن بدن ترقی کر رہا ہے۔

چوہدری صاحب کا ڈیرہ

لاہور میں تاش پر جوئے اور کرکٹ بکی کی حیثیت سے چوہدری صاحب کا کوئی ثانی نہیں۔ چوہدری صاحب کا اصل نام چوہدری سلطان احمد ہے اور اس کا تعلق ماڈل ٹاؤن لاہور سے ہے۔ لاہور کی انڈر ورلڈ میں چوہدری صاحب کو ایک خاص مقام حاصل ہے اور آج تک کسی نے ان کے کاروبار پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔ گلبرگ میں واقع دو

جدید ترین کوٹھیوں کو ملا کر انہوں نے ایک بہت بڑے گھر کی شکل دیدی ہے جس میں خصوصی طور پر ایک سوئمنگ پول بھی تیار کروایا گیا ہے۔ چوہدری صاحب کی عمر اس وقت 60 سال سے زیادہ ہے اور اس کے تین بیٹے جوئے اور جسم فروشی کے کاروبار کو کامیابی کے ساتھ چلا رہے ہیں جبکہ چوہدری صاحب کی بک پاکستان کی سب سے بڑی بک قرار دی جاتی ہے۔ کرکٹ میچوں میں ان کا اڈہ کروڑوں روپے کا جواء کراتا ہے اور کئی کرکٹ کھلاڑی چوہدری صاحب کے دوست ہیں۔

چوہدری صاحب کے بارے میں بہت کم معلومات ملتی ہیں اور ان کے جاننے والے ان کو ایک خاندانی رئیس کے طور پر جانتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ چوہدری صاحب کے دوستوں میں سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو بھی شامل تھے۔ چوہدری صاحب کو ایک سیاسی مدبر کا بھی درجہ دیا جاتا ہے اور ان کی سیاسی پیش گوئیوں کے سچ ثابت ہونے کے کئی اخبار نویس بھی معترف ہیں۔ چوہدری صاحب کا حلقہ اثر بھی بہت زیادہ وسیع ہے۔ ان کے ایک پرانے دوست نے بتایا کہ ان کے والد نے ان کو عاق کر دیا تھا اور جب ان کے والد نے ان کو گھر سے نکالا اس وقت ان کی عمر بیس سال تھی۔ انہوں نے لاہور کی سبزی منڈی میں مزدوری شروع کی اور پانچ سال کی محنت کے بعد وہاں آڑھت کی دکان حاصل کر لی۔ سبزی منڈی میں ان کا کاروبار بہت زیادہ چمکا اور انہوں نے سانده میں ایک مکان خرید لیا۔ چوہدری صاحب نے ہیرا منڈی میں ایک طوائف کے ساتھ تعلقات استوار کئے اور اسے اس کے اڈے سے بھگا کر شادی کر لی۔ اس عورت سے ان کے ہاں تین بیٹے پیدا ہوئے جن کو چوہدری صاحب نے اعلیٰ تعلیمی اداروں سے تعلیم دلوائی۔ چوہدری صاحب نے آڑھت کا کاروبار ختم کر کے تعمیراتی کاموں کے ٹھیکے لینے شروع کر دیئے۔ اس کام میں بھی ان کو بہت زیادہ کامیابی حاصل ہوئی اور ساتھ ساتھ ان کے تعلقات سیاستدانوں اور اعلیٰ بیوروکریسی کے ساتھ قائم ہو گئے۔

90ء کے شروع میں چوہدری صاحب نے لکشمی کے ایک ہوٹل میں جواء کرانا شروع کیا۔ ان کا پولیس کا ساتھ براہ راست رابطہ تھا اس لئے کبھی ان کے جواء خانہ پر چھاپہ نہ مارا گیا جس سے ان کے کاروبار کو نقصان پہنچتا۔ چوہدری صاحب نے جلد ہی لکشمی کے اس ہوٹل کو چھوڑ دیا اور مال روڈ پر واقع ایک فائیو سٹار ہوٹل میں مستقل کمرہ

نے پھر جواء شروع کرایا۔ اس ہوٹل میں چوہدری صاحب کا" کام "بہت ترقی کرنے لگا اور ان کا شمار کروڑ پتی لوگوں میں ہونے لگا۔ فائیو سٹار ہوٹل کے جوئے سے حاصل ہونے والی رقم سے چوہدری صاحب نے گلبرگ لاہور میں واقع دو ایک جیسی کوٹھیاں دو کروڑ روپے میں خریدی تھیں۔ ان کوٹھیوں میں جوئے کے ساتھ ساتھ جسم فروشی کا دھندہ بھی شروع کر دیا گیا اور چوہدری صاحب کے کارندے پیشہ ور عورتوں کو یہاں لے آئے۔ جواء کھیلنے کیلئے آنے والوں کیلئے عورت کا بندوبست بھی کر دیا گیا۔ جوئے کا فاتح اپنے ساتھیوں سمیت ساری رات پیشہ ور عورتوں کو فتح کرتا رہتا اور یوں چوہدری صاحب دوہرا منافع کمانے لگے۔

چوہدری صاحب کے اس ڈیرے پر جواء کھیلنے اور اس کے بعد داد عیش دینے والوں میں کئی غیر ملکی مہمان بھی شامل ہیں جن کو چوہدری صاحب لاہور کے ایک فائیو سٹار ہوٹل میں ٹھہراتے ہیں۔ یہ غیر ملکی مہمان چوہدری صاحب کے اڈے پر جواء کھیلتے ہیں اور عورتوں سے فیضیاب ہوتے ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق چوہدری صاحب کے ڈیرے پر دس سے زیادہ لڑکیاں ہر وقت موجود رہتی ہیں جو آنے جانے والوں کی ہر طرح سے خدمت کرتی ہیں۔ چوہدری صاحب کا یہ ڈیرہ پوری آب و تاب کے ساتھ اپنا کاروبار کر رہا ہے اور آئے دن چوہدری صاحب کے معزز مہمانوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ چوہدری صاحب کے ایک دوست نے بتایا کہ یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ چوہدری صاحب کے پاس کتنی دولت ہے اسی طرح ان کے اثر و رسوخ کا بھی محض اندازہ ہی لگایا جا سکتا ہے۔ تمام لوگ ان کی عزت کرتے ہیں اور ان کے ذریعے سفارش کروا کے اپنے کام نکلواتے ہیں۔ آج تک کسی نے بھی چوہدری صاحب پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی مستقبل قریب میں ایسا کوئی امکان نظر آتا ہے۔

ذرائع نے اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ چوہدری صاحب اپنے کاروبار کو خلیجی ریاستوں تک وسعت دینے کی کوشش کر رہے ہیں اور وہ جلد ہی باہر منتقل ہو جائیں گے۔ ان کے کاروبار کو یہاں کوئی خطرہ نہیں لیکن خراب معاشی حالات کی وجہ سے ان کے گاہکوں اور ان کے ڈیرے پر جواء کھیلنے والوں کی تعداد میں کمی ہو جانے کا خدشہ

ہے۔ اس لئے وہ نئے امکانات تلاش کرنے میں مصروف ہیں۔ اگر چوہدری صاحب کو خلیجی ریاستوں میں جگہ مل گئی تو وہ اپنے اس کاروبار کو فوراً وہاں شفٹ کر دیں گے۔

خالدہ کا ڈیرہ

خالدہ کا تعلق بازار حسن سے ہے اور اس نے پندرہ سال تک مسلسل بازار حسن میں پیشہ کیا ہے۔ اس نے 1944ء میں لاہور کے علاقہ علامہ اقبال ٹاؤن کے نیلم بلاک میں ایک کوٹھی کرائے پر لیکر جسم فروشی کا دھندہ شروع کیا۔ خالدہ کے ڈیرے پر اس وقت چودہ لڑکیاں جسم فروشی کا دھندہ کرتی ہیں۔ خالدہ کے گاہک اس کے گھر پر آتے ہیں جہاں ان کو مکمل سہولیات فراہم کی جاتی ہیں۔ خالدہ کے ڈیرے پر کام کرنے والی لڑکیوں میں سے اکثر کا تعلق ہیرا منڈی کے علاقے سے ہے۔

خالدہ کے خاندان کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ملتیں۔ اس کے بارے میں عام لوگ یہ بھی جانتے ہیں کہ اس نے پہلے رحمت بائی اور پھر جمیلہ کے ڈیرے پر جسم فروشی کا دھندہ کیا۔ اس کا تعلق فیصل آباد کے ایک گاؤں سے ہے لیکن یہ خود نہیں بتاتی کہ وہ فیصل آباد کی رہنے والی ہے۔ وہ اپنے جاننے والوں کو یہی بتاتی ہے کہ اس کا تعلق ہیرا منڈی سے ہے اور اس کی ماں بھی بازار شیخوپوریاں میں پیشہ کرتی تھی۔ وہ مزید بتاتی ہے کہ اس کا کوئی بہن بھائی نہیں وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہے اور اس کے والدین مر چکے ہیں۔ 50 سالہ خالدہ ایک نیم بدصورت اور بھدی عورت ہے جو ہر وقت پان کھاتی رہتی ہے۔ اس کی خاص پہچان وہ غلیظ گالیاں ہیں جو یہ ہر وقت بکتی رہتی ہے۔

خالدہ کے ایک جاننے والے نے بتایا کہ ہیرا منڈی میں واقع بازار شیخوپوریاں میں وہ ایک کوٹھے پر پیشہ کرتی تھی۔ اس کو ناچ گانا بالکل نہیں آتا۔ یہ صرف ایک نکیائی کی حیثیت سے جسم فروشی کا دھندہ کرتی تھی۔ جمیلہ کے گھر میں اس کو خالو کے نام سے پکارا جاتا تھا اور اس کو شراب نوشی کی بھی عادت ہے۔ خالدہ نے کئی سال جمیلہ کے ڈیرے پر جسم فروشی کی ہے۔ اس کے ایک گاہک نے ایک مرتبہ اس کا بازو توڑ دیا تھا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اس کی بدتمیزی اس حادثے کا موجب بنی تھی۔ خالدہ نے دوران میں اپنے ایک پرانے گاہک کے ساتھ ملکر یہ پروگرام بنایا کہ لاہور کے کسی دوسرے علاقے میں کاروبار

شروع کیا جائے کیونکہ ہیرا منڈی میں گاہکوں کی تعداد کم ہوتی جارہی ہے۔ مذکورہ گاہک نے اور خالدہ نے ملکر نیلم بلاک میں ایک مکان کرائے پر لیا اور جمیلہ کے اڈے سے پانچ لڑکیاں توڑ کر یہاں لے آئے۔ شروع میں اس کا کاروبار بالکل نہ چل سکا اور پانچ میں دو لڑکیاں واپس جمیلہ کے اڈے پر چلی گئیں۔ اس دوران جمیلہ نے گھر میں فون لگوالیا اور تین چار دلال کمیشن پر رکھ لئے جو سارا دن گلیوں اور محلوں میں پھر کر گاہک تلاش کرتے خالدہ نے خود بھی نگار خانوں میں جانا شروع کر دیا اور وہاں سے مزید چار پیشہ ور لڑکیاں لے آئی۔

آہستہ آہستہ خالدہ کا اڈہ مشہور ہونے لگا اور گاہکوں کی ایک معقول تعداد نے اس طرف کا رخ کرنا شروع کر دیا۔ خالدہ اپنے گاہکوں کو شراب بھی مہیا کرتی اور اس کے ریٹ دیگر کوٹھی خانوں سے عموماً کم ہوتے۔ ایک اندازے کے مطابق اس کے ڈیرے پر کام کرنے والی لڑکیاں 500 روپے سے 2000 روپے تک گاہک کے ساتھ رات گزارتیں اور اس میں سے 75 فیصد کمیشن حاصل کرتیں جبکہ 25 فیصد خالدہ کو ملتا۔ گزشتہ دو سال سے خالدہ کا کاروبار عروج پر ہے اور اس کے گاہکوں میں مسلسل اضافہ ہوا ہے۔ خالدہ کے پڑوسی اور دیگر محلہ دار اس کے ڈیرے کی وجہ سے بے حد پریشان ہیں اور کئی بار مقامی پولیس کو درخواستیں بھی دے چکے ہیں لیکن پولیس ماہانہ وصول کرتی ہے لہٰذا اس کے خلاف کارروائی نہ کرنے کی پابند ہے۔ اس لئے خالدہ کے ڈیرہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ رابطہ کرنے پر خالدہ نے بات کرنے سے انکار کر دیا اور خود کو ایک گھریلو عورت قرار دیا جو غریبوں کی مدد کرتی ہے اور پرامن ہے لیکن لوگ اس پر طرح طرح کے الزامات لگاتے ہیں۔

خالدہ کے ڈیرے پر دلال کے طور پر کام کرنے والے ایک شخص اکرم نے مجھے بتایا کہ خالدہ کے روابط بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ ہیں۔ اس لئے اس پر کسی نے آج تک ہاتھ نہیں ڈالا۔ لوگ یہاں آتے ہیں اور ان کو مکمل سہولیات دی جاتی ہیں۔ اس نے مزید بتایا کہ اس کو ایک گاہک کی ادا کردہ رقم میں سے 5 فیصد کمیشن دیا جاتا ہے۔

راشدہ کا ڈیرہ

یہ بھی علامہ اقبال ٹاؤن کے نیلم بلاک کے ایک پرانے گھر میں قائم ہے۔ اس

ڈیرے کی مالکن ایک بوڑھی طوائف ہے جس کی ساری زندگی ہیرا منڈی میں پیشہ کرتے ہوئے گزری ہے۔ اس کی عمر اس وقت 65 سال سے زیادہ ہے جبکہ اس کے ڈیرے پر 12 لڑکیاں پیشہ کرتی ہیں۔ راشدہ جس کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کا اصل نام رحمت بی بی ہے، قصور شہر کی رہنے والی ہے اور معروف گلوکارہ نور جہاں کو اپنی رشتہ دار ظاہر کرتی ہے۔

راشدہ اپنے خاوند محمد خان کے ساتھ اس گھر میں رہتی ہے۔ ان کی ایک بیٹی ہے جس کو چاندنی کے نام سے پکارا جاتا ہے اور یہ چاندنی بھی اپنے گھر میں پیشہ کرتی ہے۔ رحمت بی بی عرف راشدہ کے ڈیرے پر کام کرنے والی عورتوں میں زیادہ تر خانہ بدوش خاندانوں سے تعلق رکھتی ہیں جو صبح سویرے برقع اوڑھ کر "کام" پر آتی ہیں اور شام کو چلی جاتی ہیں۔ راشدہ کا ڈیرہ رات 10 بجے تک چلتا رہتا ہے اور لوگ عموماً یہاں سے لڑکیوں کو اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ ایک مقامی باشندے نے بتایا کہ راشدہ ایک پرامن اور عام انسانوں کیلئے درد رکھنے والی عورت ہے۔ وہ اس گھر میں پیشہ کرتی ہے لیکن آج تک اس نے محلے میں کسی کے ساتھ جھگڑا نہیں کیا، لوگ اس کی عزت نہیں کرتے کیونکہ ان کو معلوم ہے کہ یہ ایک طوائف ہے جو ایک قبیح دھندہ کراتی ہے۔ راشدہ کے مقامی پولیس کے ساتھ اچھے تعلقات ہیں اور اکثر اوقات پولیس والے بھی اس کے ڈیرے پر آتے جاتے نظر آتے ہیں۔

ایک دلال نے بتایا کہ راشدہ نے ہیرا منڈی کے محلہ سمیاں میں کئی سال پیشہ کیا ہے اور ہیرا منڈی کی طوائفیں اس کو اپنا استاد مانتی ہیں۔ معروف کردار ماما موداً کے ساتھ راشدہ کے بہت اچھے تعلقات ہیں اور وہ جب بھی طوائفوں کا ثقافتی طائفہ لیکر بیرون ملک جاتا ہے۔ اپنے طائفے میں راشدہ کی بیٹی کو ضرور لیکر جاتا ہے۔ راشدہ اپنے اڈے پر کام کرنے والوں کو روزانہ اجرت دیتی ہے اور ہر لڑکی آٹھ گھنٹے کی شفٹ پر کام کرتی ہے۔ اس دوران اگر کوئی گاہک نہ آئے تو راشدہ اپنی جیب سے ان لڑکیوں کو معاوضہ ادا کرتی ہے۔

ایک سوال کے جواب میں راشدہ نے بتایا کہ اس نے جب سے ہوش سنبھالا ہے پیشہ کر رہی ہے۔ پہلے لوگ زیادہ تر ہیرا منڈی میں گانا سننے آیا کرتے تھے لیکن گزشتہ پندرہ

بیس برسوں سے گانا سننے والوں کی تعداد میں بہت زیادہ کمی ہوئی ہے اور اب صرف لوگ جسم خریدنے آتے ہیں۔ اس نے مزید بتایا کہ "لوگوں میں اب تہذیب نہیں رہی اور نہ ہی ان کو کوئی لحاظ رہا ہے۔ اب لوگ شراب نوشی کر کے آتے ہیں اور عموماً لڑکیوں کے ساتھ جھگڑا کرتے ہیں اور بعض اوقات تشدد پر اتر آتے ہیں ہم چونکہ کاروباری لوگ ہوتے ہیں اس لئے ان کے ساتھ جھگڑا مول نہیں لے سکتے۔"

راشدہ کے اڈے کے زیادہ تر گاہک عام دکاندار یا چھوٹا موٹا کام کرنے والے لوگ ہیں جن کے بارے میں وہ عموماً جانتی ہے۔ وہ شخصی ضمانت پر لڑکیوں کو ان کے گاہکوں کے حوالے کرتی ہے۔ شام کو لوگ عموماً زیادہ تعداد میں لڑکیاں لینے آتے ہیں جن کو صبح ہر صورت میں ڈیرے پر پہنچانا ہوتا ہے۔ بعض اوقات لوگ مری وغیرہ کیلئے بھی لڑکیاں لے جاتے ہیں اس صورت میں اڈے کی مالکن ان سے دگنا معاوضہ لیتی ہے اور لڑکی کو اڈے کی طرف سے موبائل فون دیا جاتا ہے تاکہ وہ اڈے پر رابطہ برقرار رکھ سکے۔

راشدہ کے اڈے پر کام کرنے والی ایک لڑکی رانی نے بتایا کہ وہ ایک رات کا معاوضہ 2000 روپے لیتی ہے۔ 2000 روپے میں 600 روپیہ مالکن کو دیا جاتا ہے جبکہ 1400 روپے اس کے حصے میں آتے ہیں۔ اس کے بقول بعض اوقات روزانہ گاہک مل جاتے ہیں جبکہ کئی مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ پورا پورا ہفتہ کوئی ادھر کا رخ ہی نہیں کرتا۔ اس نے بتایا: "اکثر لوگ شراب پی کر ہمارے پاس آتے ہیں اور دست درازی بھی کرتے ہیں۔ لوگ جب سودا کرتے ہیں تو اپنی تعداد کے بارے میں عموماً جھوٹ بولتے ہیں لیکن جب ہم موقع پر پہنچتی ہیں تو بتائی گئی تعداد سے ایک آدھ فرد زیادہ ہی ہوتا ہے لیکن چونکہ ہم نے پیشہ کرنا ہوتا ہے اس لئے ہم اعتراض نہیں کر سکتیں اور مجبوراً اپنا جسم ان کے سامنے پیش کر دیتی ہیں۔"

جسم فروشی کے اڈوں سے حاصل کی گئی عورتوں پر تشدد کی روایت بہت زیادہ عام ہے۔ سودا کرتے وقت اڈے کی مالکن کو بتایا جاتا ہے کہ لڑکی کے ساتھ رات گزارنے والوں کی تعداد دو ہے لیکن اکثر اوقات یہ تعداد تین سے چار تک بھی جا پہنچتی ہے جن کو سودا کرنے والے "اچانک آ پہنچنے والے" قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ایسا باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت کیا جاتا ہے۔ چار صحت مند افراد شراب کے

نشے میں دھت ہو کر ایک کمزور عورت کو ساری رات نوچتے رہتے ہیں۔ ان کو نفسیاتی طور پر اس بات کا شدید احساس ہوتا ہے کہ وہ معاوضہ پیشگی ادا کر چکے ہیں اور اب جس طرح بھی ممکن ہو سکے: "پیسے پورے کئے جائیں۔"

مجھے ایک پیشہ ور طوائف نے بتایا: "کئی لوگ تو ہمیں شراب پینے پر بھی مجبور کرتے ہیں اور برہنہ ڈانس کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ بعض اوقات تو انہوں نے پہلے ہی ویڈیو وغیرہ کا بندوبست کر رکھا ہوتا ہے جس پر انگریزی بلیو فلمیں چل رہی ہوتی ہیں۔ وہ ہمیں ان فلموں کے مطابق عمل کرنے پر مجبور کرتے ہیں اور انکار کی صورت میں تشدد سے بھی گریز نہیں کرتے۔ میں آپ کو ایک سچا واقعہ سناتی ہوں۔ ایک بار دو آدمی مجھے گاڑی میں بٹھا کر شاہدرہ کے ایک محلے میں لے گئے۔ میں وہاں پہنچی تو تین مزید افراد وہاں ہمارے منتظر تھے۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے ایک زوردار نعرہ لگایا اور ہر کوئی مجھے اپنی گود میں بٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کھینچا تانی میں میرے کپڑے پھٹ گئے میں نے احتجاج کیا تو مجھے تھپڑ مارے گئے۔ انہوں نے زبردستی مجھے برہنہ کر دیا اور شراب پلانے لگے۔ شراب پینے کا یہ میرا دوسرا موقع تھا، پہلی بار مجھے تین ٹرک ڈرائیوروں نے شراب نوشی پر مجبور کیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے برہنہ ہو کر مجھے اپنے ساتھ ڈانس پر مجبور کیا۔ میں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے تشدد کا نشانہ بنایا، مجھے مرغا بننے پر مجبور کر دیا۔ میں نے چیخنے کی کوشش کی تو ایک نے بندوق کی نال میرے ماتھے کے ساتھ لگا دی۔ میں ساری رات ان کے رحم و کرم پر رہی اور صبح نیم بے ہوشی کی حالت میں وہ مجھے علامہ اقبال ٹاؤن میں واقع مون مارکیٹ پر اتار گئے۔ میں نے اپنی مالکن کو فون کیا تو وہ مجھے میری حالت دیکھتے ہوئے ہسپتال لے گئی۔ یہ اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے کہ کون سا گاہک آپ کے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو بہت اچھا برتاؤ کرتے ہیں اور ان کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ کسی اچھے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔"

اس نے ہنستے ہوئے ایک مزیدار واقعہ سنایا: "بعض اوقات لوگ ہمیں راہ راست پر لانے کی کوشش بھی کرتے ہیں اور شاید ان کو یہ علم ہوتا ہے کہ اگر وہ ہمیں گناہ کی زندگی چھوڑ دینے پر مائل کریں گے تو یہ ان کیلئے بڑے ثواب کی بات ہو گی۔ ایک بار مجھے دو افراد

گاڑی میں بٹھا کر ریلوے اسٹیشن پر واقع ایک ہوٹل میں لے آئے۔ انہوں نے آتے ہی مجھے بہت اچھا کھانا کھلایا اور بڑے اخلاق کے ساتھ پیش آئے۔ میں حیران رہ گئی کہ پتہ نہیں یہ لوگ میرے ساتھ کیا کریں گے۔ تھوڑی دیر بعد ان میں سے بڑی عمر والے نے میرا انٹرویو شروع کر دیا۔ میں نے اپنی پوری داستان اس کو سنادی جو کہ عموماً ہم نہیں سناتیں کیونکہ ہمیں اس سے منع کیا جاتا ہے۔ ان دونوں کے حسن اخلاق نے مجھے اتنا زیادہ متاثر کیا کہ میں نے اپنی دکھ بھری داستان حرف بہ حرف ان کو سنادی۔ میری داستان سن کر وہ بہت مغموم ہوئے اور بڑی عمر والے نے مجھے نیکی کی باتیں بتانا شروع کر دیں۔ مجھے یہ تمام باتیں سن کر عجیب احساس ہوا اور بے اختیاری میں، میں رونے لگی۔ چھوٹی عمر والا بھی میری داستان سن کر رو دیا تھا اس نے بھی مجھے ایک گھنٹے تک اچھی باتوں کا درس دیا اور میرے ساتھ وعدہ کیا کہ وہ مجھے اچھی ملازمت لیکر دیں گے اور مناسب جگہ پر میری شادی کروادیں گے۔ آدھی رات کے وقت مجھے انہوں نے کہا کہ میں سو جاؤں۔ میں ایک گھنٹہ بھی سو نہ پائی تھی کہ بڑی عمر والے نے مجھے آہستگی سے جگا دیا اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کی ہدایت کی۔ میں حیران رہ گئی اور سوچنے لگی کہ شاید وہ دوسرے کو نہیں جگانا چاہتا اور میرے ساتھ کوئی بات کرنا چاہتا ہے۔ اس نے عام لوگوں کے انداز میں مجھے برہنہ کیا اور اپنے "پیسے پورے کرنے لگا" اس نے اس دوران میرے ساتھ کوئی بات نہ کی میں حیران، چپ چاپ پڑی رہی۔ اس نے دوبار میرے ساتھ جنسی عمل کیا اور خاموشی سے جاکر اپنے بستر پر لیٹ گیا جاتے ہوئے اس نے مجھے کپڑے پہن لینے کی ہدایت کی۔ ابھی میں دس منٹ لیٹی ہونگی کہ بالکل اس طرح چھوٹی عمر والے نے مجھے اٹھایا اور مجھے برہنہ کر دیا۔ اس نے بھی دوبار جنسی عمل کیا اور خاموشی سے جاکر بستر پر لیٹ گیا۔ صبح جب میری آنکھ کھلی تو وہ دونوں جا چکے تھے اور میں کمرے میں اکیلی پڑی تھی۔ میں نے اپنا پرس دیکھا جو بالکل محفوظ تھا اور اس میں میرا معاوضہ بھی اس طرح پڑا تھا۔"

اوّل تو پیشہ ور عورتیں ہدایت کے مطابق عام لوگوں کے ساتھ گفتگو نہیں کرتیں اور جب انہیں احساس ہو جائے کہ گفتگو کرنے والا ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا تو پھر وہ اپنے تجربات اور مشاہدات بتا کر حیران کر دیتی ہیں۔ لیکن ان میں سے اکثر اپنے ماحول کے اثرات کے تحت ہمیشہ جھوٹ بولتی ہیں اور ایسے واقعات سناتی ہیں جن سے ان

کی مراد اپنے گاہک کو دھوکہ دینا ہوتا ہے عموماً ہر لڑکی اپنے گاہک کو اپنی حرکات سے یہ باور کرانے کی کوشش کرتی ہے کہ وہ اس سے قبل باکرہ تھی اور وہ خوش قسمت ہے جس کو یہ اعزاز حاصل ہو رہا ہے کہ وہ اس کے کنوار پن کو ختم کر سکے۔ باقاعدہ پیشہ ور خاندانوں سے تعلق رکھنے والی عورتوں کی تعداد اب نہ ہونے کے برابر ہے۔ اب ایسی عورتیں اس پیشے کو اپنائے ہوئے ہیں، جن کا تعلق عموماً چھوٹی ذاتوں اور برادریوں سے ہے اور وہ اپنے ماحول اور غربت کے باعث اس پیشے کی طرف مائل ہو جاتی ہیں۔

آجکل اڈوں پر ملنے والی ان پیشہ ور عورتوں میں سے بڑی تعداد خانہ بدوش عورتوں کی ہے۔ کبھی یہ عورتیں بھیک مانگتی پھرتی تھیں یا معمولی قسم کی اشیاء بیچ کر گزارہ کرتی تھیں لیکن گرتی ہوئی مجموعی معاشی صورتحال نے انہیں تقریباً محفوظ پیشے کی طرف پھیر دیا ہے۔ خانہ بدوش عورتیں عموماً بہت کم معاوضہ طلب کرتی ہیں اور کوشش کرتی ہیں کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو یہ سہولت پہنچا کر زیادہ سے زیادہ پیسے کما سکیں۔ خانہ بدوش عورتوں کی بڑی تعداد کے اس طرف مائل ہو جانے کی وجہ سے عام پیشہ ور عورتوں کو مشکلات کا سامنا ہے ایک خاندانی پیشہ ور عورت نے مجھے بتایا: "جب سے یہ خانہ بدوش عورتیں اس پیشے کی طرف آئی ہیں انہوں نے تو گند ڈال دیا ہے اور وہ پان کی ایک گلوری یا چند روپوں کی خاطر سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتی ہیں۔ پہلے یہ بھیک مانگ کر سارے دن میں 100 روپیہ کماتی تھیں اب تین گاہکوں کو ایک گھنٹے میں فارغ کر کے 300 روپیہ کما لیتی ہیں۔ ان کی وجہ سے لوگوں میں ہماری کوئی عزت نہیں رہی کیونکہ یہ صرف گندی اور جاہل ہوتی ہیں بلکہ بہت زیادہ ناقابل برداشت بھی ہوتی ہیں۔"

بالے کا ڈیرہ

اقبال عرف بالے کا جسم فروشی کا اڈہ غالباً سمن آباد کا سب سے مشہور مقام ہے۔ اس علاقے کا ہر رہائشی بخوبی جانتا ہے کہ بالے کے مکان پر کیا ہوتا ہے۔ اس کے پاس سر شام رش کیوں ہو جاتا ہے اور لوگ آدھی رات تک مسلسل کیوں آتے جاتے رہتے ہیں۔ بالا ایک کرسی پر بیٹھا آنے جانے والوں کا حساب رکھتا ہے اور اس کی بیوی مہمانوں کی خاطر مدارت میں مصروف رہتی ہے۔ بالے کی تین بیٹیاں بھی روزانہ مختلف لوگوں کی گاڑیوں میں دیکھی جاتی ہیں جبکہ کئی ایسی عورتیں بھی ہیں جن کو محلے کا کوئی آدمی نہیں جانتا لیکن وہ

ہیں اس کے بارے میں کسی کو معلوم نہیں۔

اقبال عرف بالے نے تقریباً دس سال پہلے سمن آباد کے اس گھر میں کرائے پر رہائش اختیار کی۔ محلے داروں کیلئے بالا بھی عام کرایہ دار تھا جیسے کہ وہ خود تھے۔ رفتہ رفتہ بالے کے ہاں لوگوں کی آمدورفت بڑھنے لگی اور اس کے بارے میں افواہیں اڑنے لگیں۔ عام لوگوں کا خیال تھا کہ بالے جواء کراتا ہے اور جواری اس کے گھر کو ایک محفوظ پناہ گاہ تصور کرتے ہیں لیکن جوئے خانے کا تصور بھی دھندلانے لگا اور لوگوں نے اس بار جو اندازہ لگایا وہ بالکل ٹھیک تھا۔ بالے نے اس گھر میں جسم فروشی کا اڈہ قائم کر لیا تھا۔ معززین علاقہ ایک دن مقامی پولیس اسٹیشن میں بالے کے کوٹھی خانے کی شکایت لے کر گئے لیکن تھانیدار نے بالے کو پرامن اور وسیع رابطوں والا شہری قرار دے کر اس کے گھر پر چھاپہ مارنے سے انکار کر دیا۔ بالے کو اہل محلہ کی اس حرکت کی خبر ہوئی تو اس نے اپنے تین چار ملازموں کو حکم دیا کہ وہ ہوائی فائرنگ کریں اور اہل محلہ کو جی بھر کر گالیاں دیں۔ اگلے روز سمن آباد کے اس علاقے میں اتنی شدید ہوائی فائرنگ ہوئی کہ لوگ سارا دن اپنے اپنے گھروں میں دبکے بیٹھے رہے۔ بالے کے لوگوں نے پورے محلہ کو گالیاں دیں لیکن کسی نے جواب دینے کی ہمت نہ کی۔

بالے نے اپنے ڈیرے پر آنے والوں کی خاطر مدارات کی اور انہیں اچھا مال دینے لگا۔ روزانہ شرفاء اور اعلیٰ سرکاری عہدیدار اس کے مہمان ہوتے۔ وہ ان لوگوں کو شراب اور عورت فراہم کرتا اور یوں اس کا کاروبار تیزی کے ساتھ ترقی کرنے لگا۔ بالے کے بارے میں کوئی نہیں جانتا کہ اس کا تعلق کس علاقے اور کس خاندان کے ساتھ ہے۔ یہ کہاں سے لاہور آیا اور پھر اس نے سمن آباد ہی کو کیوں اس پیشے کیلئے منتخب کیا۔ بالے کا کاروبار اپنے پورے جوبن پر ہے اور اس کے گاہکوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ بالے کو تقریباً چار سال پہلے اس وقت تھوڑی سی مشکل کا سامنا کرنا پڑا جب سمن آباد کے علاقے میں رہائش اختیار کرنے والے ایک سابق طالب علم رہنما ارشد امین چودھری نے اس کے ڈیرے پر دھاوا بول دیا اور اس کو دھمکی دی کہ اگر اس نے ان کی تنظیم کو بھتہ نہ دیا تو پھر اس کا کاروبار نہیں چلنے دیں گے۔ بالا چند دن پریشان رہا لیکن ایک دن اس کی پریشانی ختم ہو گئی جب ارشد امین چودھری نے پیغام بھیجا کہ وہ کسی خوبصورت اور نوجوان لڑکی کو رات

بھر کیلئے اس کے ڈیرے پر بھیجے۔ بالے نے پورے اڈے کی سب سے خوبصورت عورت کو ارشد امین کے ہاں بھیجا اور اس کے بعد اس نے ارشد امین کے ساتھ دوستی کر لی۔

بالے کا ڈیرہ اس وقت علاقے کا سب سے بدنام ڈیرہ ہے اور اس نے جسم فروشی کے ساتھ ساتھ جواء بھی شروع کرا دیا ہے۔ اب جواری بھی اس کے ڈیرے کا رخ کرنے لگے ہیں اور اگر وہ جیت گئے تو ان کی خوشی کو دوبالا کرنے کا اہتمام بھی اسی ڈیرے پر موجود ہے۔

بالے کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ایک سابق ممبر قومی اسمبلی، جس کا تعلق پاکستان مسلم لیگ سے ہے، کا اچھا دوست ہے اور اس سابق رکن اسمبلی نے بھی ہمیشہ اس کا ساتھ دیا ہے۔ بالے کے پاس جو لڑکیاں پیشہ کرتی ہیں ان میں سے اکثر کا تعلق بازار حسن کے ساتھ ہے اور تین چار لڑکیاں خانہ بدوش خاندانوں سے بھی تعلق رکھتی ہیں۔

ناصرہ کا ڈیرہ

کرشن نگر کے علاقے میں ایک شاندار کوٹھی کے اندر بڑے زور و شور کے ساتھ جسم فروشی کا دھندہ جاری ہے۔ اس کوٹھی کو ناصرہ نامی ایک خاتون نے پانچ سال قبل کرائے پر حاصل کیا تھا۔ ناصرہ نے جسم فروشی کیلئے پہلے فیصل ٹاؤن میں ایک کوٹھی کرائے پر لی لیکن اس علاقے میں رہائش پذیر ایک اعلیٰ حکومتی عہدیدار نے اس کے خلاف شکایت وزیراعلیٰ سے کی تو اس کو یہ علاقہ چھوڑنا پڑا۔ اس نے کرشن نگر کے علاقے کو منتخب کیا اور دس ہزار روپے ماہوار کرائے پر ایک شاندار کوٹھی حاصل کر لی۔ ناصرہ کا تعلق کراچی سے ہے اور اس سے پہلے وہ نیپئر روڈ پر باقاعدہ جسم فروشی کا دھندہ کرتی رہی ہے۔ ناصرہ کے گاہکوں میں آج بھی زیادہ تر لوگ کراچی سے تعلق رکھنے والے ہیں جن کے ساتھ اس کی پرانی جان پہچان ہے۔ یہ لوگ جب کاروبار یا کسی دوسرے کام کیلئے لاہور آتے ہیں تو ان کو ناصرہ تمام سہولیات فراہم کرتی ہے۔ کراچی پولیس نے کئی بار اس کے ڈیرے پر ایم کیو ایم کے مفرور کارکنوں کی گرفتاری کیلئے چھاپہ مارا ہے لیکن یہاں سے کوئی شخص آج تک گرفتار نہیں ہو سکا۔

ناصرہ کے اڈے پر زیادہ تر بنگلہ دیشی عورتیں پیشہ کرتی ہیں جبکہ ملتان اور جنوبی پنجاب سے تعلق رکھنے والی کئی عورتیں بھی یہاں پیشہ کرتی ہیں۔ ناصرہ کے اڈے کا عام

آبادی کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں اور نہ ہی مقامی لوگ اس کے بارے میں زیادہ جانتے ہیں۔ ایک مقامی باشندے نے بتایا کہ ناصرہ نامی اس عورت نے یہاں کے لوگوں کو بتا رکھا ہے کہ اس کا خاوند امریکہ میں کاروبار کرتا ہے اور وہ خود ایک فیکٹری کو چلا رہی ہے جو ملتان میں واقع ہے۔ اس کے گھر میں رہنے والی عورتوں کے بارے میں اس کا موقف ہے کہ یہ عورتیں اس کی رشتہ دار ہیں اور وہ ان کی کفالت کرتی ہے۔ ناصرہ نے جسم فروشی کا کاروبار کرنے کے الزام کو اپنے خلاف سازش قرار دیا جو اس کے کاروباری مخالفین اس کے ساتھ کر رہے ہیں۔

مقامی پولیس کا موقف ہے کہ ناصرہ ایک بڑے خاندان کی عورت ہے جو کراچی کے نامساعد حالات کے باعث لاہور میں شفٹ ہو گئی ہے اور اس کے گھر میں جسم فروشی کا کوئی کاروبار نہیں ہوتا۔ پولیس کے مطابق چونکہ اس کا تعلق ایک معروف خاندان کے ساتھ ہے اس لئے اس کے ملنے والے یہاں اکثر آتے رہتے ہیں۔ اس کے گھر میں موجود عورتوں کے بارے میں پولیس کوئی واضح جواب نہیں دیتی اور اس کو ناصرہ کا گھریلو معاملہ قرار دیتی ہے۔

ذرائع کے مطابق ناصرہ کے اس اڈے کو ایک خفیہ ایجنسی کی حمایت حاصل ہے جو کراچی میں جاری فسادات میں اپنا رول ادا کرنے کیلئے اس اڈے اور اس پر آنے والوں کو استعمال کرتی ہے۔ عموماً اس کے گھر کے باہر سرکاری نمبر پلیٹ والی گاڑیاں بھی کھڑی ملتی ہیں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک ایسے گھر میں جہاں صرف ایک اکیلی عورت مالک کے طور پر رہائش پذیر ہے اور اس کے پاس دس گیارہ بہاری عورتیں رہتی ہیں اور اس کے علاوہ اس گھر میں سر شام لوگوں کا رش شروع ہو جاتا ہے اور بعض اوقات گھر سے نکلنے والے لوگ اپنے ساتھ باپردہ عورتوں کو بھی لے جاتے ہوئے دیکھے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر ویک اینڈ کو گھر سے اونچی آواز میں موسیقی اور ناچنے کی آوازیں تقریباً ساری رات آتی رہتی ہیں۔ اس اڈے پر کوئی دلال نہیں بلکہ مقامی لوگوں کا بھی اس گھر میں آنا جانا بہت کم ہے۔

اس میں شک نہیں کہ پورے ملک میں لاتعداد ایسے جسم فروشی کے اڈے ہیں جن کے بارے میں عام لوگوں کو کچھ معلوم نہیں لیکن ان گھروں میں باقاعدگی کے ساتھ جسم

فروشی کا دھندہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر لاہور میں لاتعداد ایسے گھر ہیں جن میں غیر ملکی عورتیں مہمان ٹھہرتی ہیں لیکن اصل میں ان عورتوں کے ذریعے امراء جسم فروشی کا دھندہ کرتے ہیں۔ اسی طرح ایسے گھر بھی ہیں جہاں لوگ ہفتہ میں ایک دوبار پیشہ ور عورتوں کے ہمراہ مہمانوں کی حیثیت سے آتے ہیں اور اصل میں یہ جسم فروشی کے کاروبار کا ایک حصہ ہے جس میں رازداری کو اولین ترجیح دی جاتی ہے۔ ناصرہ کا اڈہ بھی اسی ذیل میں آتا ہے جس کے بارے میں عام لوگوں کو بہت کم معلوم ہے لیکن دراصل یہاں پر جسم فروشی کا دھندہ انتہائی ہوشیاری کے ساتھ جاری رہتا ہے۔

رمضانے کا اڈہ

رمضان نامی ایک شخص نے اچھرہ کی ایک پرانی آبادی میں جسم فروشی کا ایک باقاعدہ اڈہ کھول رکھا ہے۔ رمضان نے محکمہ پولیس سے انسپکٹر کی حیثیت سے ریٹائرمنٹ کے بعد پہلے اپنے گھر میں جوئے اور شراب فروشی کا دھندہ شروع کیا اور بعد میں اس کو ایک کوٹھی خانے کی شکل دیدی۔ مقامی لوگوں کے مطابق رمضان کی ساری زندگی جرائم پیشہ لوگوں کو تحفظ دیکر ان سے مفادات حاصل کرنے میں گزری ہے اور پولیس کے ریکارڈ میں بھی اس کے بارے میں یہی درج ہے کہ اس کا کردار ہمیشہ مشکوک رہا ہے۔ رمضان کا تعلق سرحد پار سے سمگلنگ کرنے والے گروپوں کے ساتھ ہے جو پار آنے اور جانے سے پہلے لاہور میں رمضان کے ہاں ٹھہرتے ہیں۔ رمضان شروع میں صرف ان مہمانوں کی "خاطر مدارت" کیلئے پیشہ عور عورتیں ہیرا منڈی سے منگواتا تھا لیکن بعد میں اس نے اس پیشے کو مستقلاً اپنالیا۔

مقامی آبادی رمضان سے خوفزدہ ہے کیونکہ عام لوگوں کے بقول اس کا تعلق جرائم پیشہ گروہوں کے ساتھ ہے اور اگر کسی نے اس کے ساتھ جھگڑا کیا تو وہ کرائے کے قاتلوں کے ذریعے اس کو قتل کرادے گا۔ رمضان کے اڈے پر پیشہ کرنے والی سات عورتوں کا تعلق لاہور کے بازار حسن سے ہے جبکہ دو لڑکیاں ملتان سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ تمام عورتیں سارا دن اور آدھی رات تک اس اڈے پر موجود رہتی ہیں اور تین چار دلال ان کیلئے گاہک تلاش کرتے رہتے ہیں۔ ان دلالوں کا خاص ٹھکانہ اچھرہ بس سٹاپ ہے جہاں ان کو ان کے مطلوبہ افراد آسانی کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ اس اڈے پر جسم فروشی

کرنے والی عورتیں صبح سویرے یہاں آتی ہیں اور پھر آدھی رات کے بعد اپنے گھروں کو چلی جاتی ہیں۔

مقامی پولیس کا بھی رمضانے کے اڈے پر بہت زیادہ آنا جانا ہے اور ذرائع کے مطابق رمضانا ان کو باقاعدہ بھتہ بھی دیتا ہے۔ رمضانے کو اپنا اڈہ دو سال پہلے اس وقت بند کرنا پڑا، جب اس کے گھر میں ہونے والی مجرے کی ایک محفل میں دو گروپوں نے ایک دوسرے پر فائرنگ کر دی جس میں ایک شخص موقع پر ہلاک جبکہ تین افراد زخمی ہو گئے۔ پولیس نے اڈے پر چھاپہ مارا لیکن متحارب گروپ مقتول اور زخمیوں کو چھوڑ کر یہاں سے بھاگ چکے تھے۔ پولیس نے رمضانے اور اس کی بیوی کو گرفتار کر لیا جنہیں کچھ عرصہ حوالات میں رکھنے کے بعد ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔ پولیس نے اس قتل کے بارے میں بتایا کہ رمضانے کے گھر میں مہمان آئے، دو رشتہ دار گروپوں میں رشتہ کے تنازعہ پر جھگڑا ہو گیا تھا جس میں ایک شخص مارا گیا بعد میں مقتول کے لواحقین نے قاتل کو معاف کر دیا اس لئے رمضانے اور اس کی بیوی کو چھوڑ دیا گیا۔ پولیس نے اس کے گھر میں جسم فروشی کے کاروبار کی تردید کر دی اور اس کو پولیس کا ایک ریٹائرڈ افسر اور معزز شہری قرار دیا۔

ہیرا منڈی کی ایک طوائف شریفاں نے بتایا کہ رمضانے کے اڈے پر اس کی تین سابقہ ملازمائیں کام کرتی ہیں جن کو رمضانا زبردستی اس اڈے پر لے گیا تھا۔ اس کے گاہکوں میں پولیس والے اور دیگر ایسے لوگ شامل ہیں جن کا تعلق جرائم کی دنیا سے ہے۔ اس طوائف نے مزید بتایا کہ وہ اپنی ان ملازماؤں کو اس لئے واپس نہ لا سکی کہ رمضانے کو مقامی پولیس اور جرائم پیشہ لوگوں کی مدد حاصل تھی اور ایک مشہور بدمعاش اکرام عرف اکو نے اس کو جان سے مار دینے کی دھمکی دی تھی۔

مذکورہ طوائف نے مزید بتایا کہ پورے لاہور میں کئی ایسے اڈے ہیں جہاں ظاہری طور پر بہت زیادہ معزز اور شریف شہری جسم فروشی کا دھندہ کر رہے ہیں۔ اس کے بقول ہیرا منڈی کا تو محض نام ہی مشہور ہے اصل ہیرا منڈیاں تو ہر محلے میں زور و شور کے ساتھ کاروبار چلا رہی ہیں اور ان کو چلانے والے بااثر اور طاقتور لوگ ہیں۔ شریفاں کے بقول لوگ ہیرا منڈی سے لڑکیوں کو لے جاتے ہیں اور پھر ان کو زبردستی اپنے گھروں میں ڈال کر ان سے پیشہ کرواتے ہیں۔ اس نے دعویٰ کیا کہ لاہور میں ایک بھی ایسی آبادی

نہیں جہاں دو یا تین جسم فروشی کے اڈے نہ ہوں۔ ان اڈوں پر کئی کئی لڑکیاں کام کرتی ہیں لیکن یہ اڈے ہیرا منڈی کی طرح بدنام نہیں ہیں۔

کوثری کا اڈہ

مشہور طوائف کوثر عرف کوثری کا اڈہ باغبانپورہ لاہور کے ایک بہت بڑے مکان میں واقع ہے۔ کوثری جو کہ خود بھی پیشہ کرتی ہے اس نے اپنے اڈے پر چھ لڑکیاں باقاعدہ ملازم رکھی ہیں جن کو وہ کمیشن ادا کرتی ہے۔ کوثری کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کا تعلق ہیرا منڈی کے بازار نیواں چیت رام روڈ سے ہے اور ایک سابق ایس پی پولیس کی رکھیل ہے۔ اس وقت بھی یہ سابق پولیس آفیسر اس کی حفاظت کا ضامن اور اس کے کاروبار میں معاون ثابت ہو رہا ہے۔ کوثری کے اڈے کو اس وقت بہت زیادہ "پذیرائی" ملی جب یہاں سے لاہور پولیس نے خطرناک قاتلوں کو گرفتار کر کے پولیس مقابلے میں ہلاک کر دیا تھا۔ کوثری کو اس دوران محض چند دنوں کیلئے اپنا کاروبار روکنا پڑا، پھر اس کے بعد اس نے پورے زور و شور سے دھندہ شروع کر دیا۔

کوثری کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کو اس کے دوست سابق ایس پی نے خطرناک بور کا اسلحہ لائسنس لیکر دے رکھا ہے اور وہ کئی بار گھر کی چھت پر اسلحہ لہراتے ہوئے دیکھی گئی ہے۔ اس کے پاس کام کرنے والی لڑکیوں میں سے سب کا تعلق ریلوے لائن کے کنارے آباد ایک کچی آبادی سے ہے۔ ایک اقلیتی فرقے سے تعلق رکھنے والی یہ عورتیں دھندہ کرنے میں بہت مشہور ہیں اور ان کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ ان کو جسم فروشی کے فن پر عبور حاصل ہے اور ان کا گاہک کبھی نہیں ٹوٹتا۔

کوثری کے بارے میں ہیرا منڈی کی ایک طوائف نے بتایا کہ وہ بہت دلیر عورت ہے اس نے کئی بار پولیس والوں کو تھپڑ مارے ہیں اور لوگ اس کے ساتھ بات کرتے ہوئے بھی گھبراتے ہیں۔ کوثری کا خاوند ایک نشئی ہے جو سارا دن نشہ کر کے گھر کے باہر پڑا رہتا ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ شخص اصل میں کوئی رشتہ دار ہے خاوند نہیں لیکن کوثری نے لوگوں کی باتوں سے بچنے کیلئے اس کے ساتھ شادی کا ڈھونگ رچا رکھا ہے۔

دراصل کوثری نے اپنے دوست سابق ایس پی پولیس کے ساتھ شادی کر رکھی ہے لیکن دونوں اس شادی کو خفیہ رکھنا چاہتے ہیں۔ مقامی پولیس کوثری کو مکمل تعاون فراہم کرتی ہے اور آج تک اس کے اڈے پر کبھی چھاپہ نہیں مارا گیا بعض ذرائع کے مطابق کوثری کا تعلق ایک سابق رکن اسمبلی کے ساتھ بھی ہے جو اپنی دشمنی کے باعث مشہور ہے۔ اس سابق رکن اسمبلی کی بھی کوثری کو مکمل حمایت حاصل ہے۔

کوثری کی عمر اس وقت 35 سے 40 سال کے درمیان ہے اور اس نے گھر میں فون کی تین لائنیں لگوا رکھی ہیں جبکہ ہر وقت اس کے پاس 2 موبائل فون بھی موجود ہوتے ہیں جن پر وہ تقریباً ہر وقت کسی سے گفتگو کرتی رہتی ہے۔ ذرائع کے مطابق کئی اخباری رپورٹر اس کے دوست ہیں اور وہ اس سے باقاعدہ ماہانہ وصول کرتے ہیں اور اس کو درپیش مسائل کو حل کرتے ہیں۔ کوثری کے پاس 99ء ماڈل کی ایک جدید گاڑی ہے جس کو وہ خود ڈرائیو کرتی ہے جبکہ اس کے پاس آنے والوں کی اکثریت پجارو سوار ہے۔

کوثری اکثر اوقات دو دو تین تین ماہ کیلئے دبئی اور شارجہ وغیرہ بھی چلی جاتی ہے اور اپنے ساتھ تین چار لڑکیوں کو لیکر جاتی ہے لیکن اس کی عدم موجودگی میں بھی اس کا اڈہ باقاعدگی کے ساتھ چلتا رہتا ہے۔ اس کے گھر کے دروازے پر ہر وقت ایک باوردی سیکورٹی گارڈ رائفل لئے کھڑا رہتا ہے جو گیٹ پر کھڑا کوثری کو آتے جاتے فوجی انداز میں سلیوٹ کرتا رہتا ہے۔ پورا محلہ کوثری سے مرعوب ہے اور کوئی بھی اس کے کاروبار کے بارے میں زبان کھولنے کو تیار نہیں کیونکہ اس صورت میں اس کی جان بھی جاسکتی ہے۔ مجھے ایک مقامی باشندے نے بتایا کہ کوثری بلدیاتی انتخابات میں بہت زیادہ سرگرم ہو جاتی ہے اور لوگوں کے گھروں میں جاکر ان سے اپنے امیدوار کے حق میں ووٹ مانگتی ہے۔ آج تک ایسا نہیں ہوا کہ کبھی کوثری کا حمایت یافتہ کوئی امیدوار بلدیاتی انتخابات میں شکست سے دوچار ہوا ہو۔

پٹھانی کا اڈہ

ٹاؤن شپ لاہور میں سب سے مشہور اڈہ پشاور سے تعلق رکھنے والی ایک طوائف کا ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ اس نے پشاور میں اپنے ایک بے وفا دوست کو قتل کر کے جسم فروشی کا دھندہ شروع کر دیا تھا۔ پٹھانی کو کوئی اس کے اصل نام سے نہیں جانتا

سب اس کو پٹھانی کہہ کر پکارتے ہیں جبکہ آج تک کسی نے اس پٹھانی کو نہیں دیکھا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ ایک جوان عورت ہے جو جسم فروشی کا دھندہ کرتی ہے اور اس کے تعلقات پولیس والوں کے ساتھ ہیں جو اس کو کاروبار کرنے میں مدد فراہم کرتے ہیں۔

عام لوگوں کا خیال ہے کہ پٹھانی ایک خدا ترس عورت ہے جو غریب افراد کی بہت زیادہ مدد کرتی ہے اور اپنے ہاں آنے والے مہمانوں سے خصوصی طور پر محلے کے غریب لوگوں کیلئے چندہ وصول کرتی ہے اور پھر اس چندے کو ان غریبوں میں بانٹ دیتی ہے۔ پچھلے دنوں اس نے محلے کی ایک غریب لڑکی کیلئے جہیز کا سامان تیار کروایا تھا اور خود اپنے ہاتھوں سے اس کی رخصتی کی تھی۔ ذرائع کے مطابق پٹھانی نام کی یہ عورت اصل میں مرد ہے جس نے خود کو پٹھانی ظاہر کر رکھا ہے۔ پردے کی سختی کے باعث چونکہ عام لوگوں کا اس کے گھر میں آنا جانا نہیں اس لئے لوگوں کو معلوم نہیں کہ پٹھانی کون ہے۔ اس گھر میں زیادہ تر افغانستان سے ہجرت کر کے آنے والی عورتیں پیشہ کرتی ہیں اور ان کے گاہکوں میں زیادہ تر وہ افغان لوگ ہیں جو تجارت و سمگلنگ وغیرہ کا دھندہ کرتے ہیں۔ عام لوگوں کو بہت کم اس گھر میں جاتے دیکھا گیا ہے۔ اس گھر میں ہونے والے دھندے کے بارے میں پہلی بار اس وقت معلوم ہوا جب ایک مقامی لڑکی کسی کام کیلئے اس گھر میں گئی۔ گھر کے مکینوں نے اس لڑکی کو چند گھنٹوں کیلئے روک لیا اور اس کے ساتھ ایک مرد نے زیادتی کر ڈالی۔ لڑکی کو پیسے کا لالچ دیا گیا اور جان سے مار دینے کی دھمکیاں بھی دی گئیں۔ کچھ عرصہ تک یہ لڑکی خاموش رہی لیکن پھر اس نے اپنے گھر والوں کو ساری داستان سنادی۔ لڑکی کے گھر والوں نے مقامی تھانے میں مقدمہ درج کرادیا اور پولیس نے ایک شخص کو وہاں سے گرفتار کر لیا جس نے بعد ازاں اعتراف جرم کر لیا اور پٹھانی کے اڈے کے بارے میں پولیس کو سب کچھ بتادیا۔ پولیس نے جب اس گھر پر چھاپہ مارا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔

کچھ عرصہ بعد اس مکان کے مقیم لوٹ آئے اور دوبارہ اس گھر میں اجنبیوں کا آنا جانا شروع ہو گیا۔ ذرائع کے مطابق پٹھانی کے اس اڈے کے زیادہ تر گاہکوں میں لاہور میں مقیم افغان باشندے اور افغانستان سے آنے والے لوگ شامل ہیں۔ پٹھانی کے اڈے سے پولیس کو باقاعدہ بھتہ پہنچایا جاتا ہے۔

شاہدرہ آبادی سے تھوڑا آگے امامیہ کالونی کے ساتھ اور دیگر آبادیوں کے درمیان لاہور فیصل آباد، شیخوپورہ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ تقریباً دو میل لمبائی میں پھیلے ہوئے خانہ بدوشوں کے اس محلے کو گڈوی محلہ کہا جاتا ہے۔ کثیر آبادی والے اس پورے محلے میں تقریباً 40 ایسے گھر ہیں جہاں جسم فروشی کا باقاعدہ کاروبار ہوتا ہے۔

گڈوی محلہ کو ایک طرح سے مکمل طور پر جسم فروشی کا اڈہ قرار دیا جاسکتا ہے جہاں ایک محتاط اندازے کے مطابق ڈیڑھ سو سے زائد عورتیں باقاعدہ جسم فروشی سے منسلک ہیں۔ اس محلے میں شاہدرہ، امامیہ کالونی، فیروز والہ اور دیگر قریبی آبادیوں کے لوگ باقاعدگی سے آتے ہیں اور نہ صرف ان لوگوں کے کچے اور گندے مکانات اور جھونپڑیوں میں وقت گزارتے ہیں بلکہ اکثر یہاں سے عورتوں کو اپنے ساتھ بھی لے جاتے ہیں۔ ایک طوائف کے مطابق پورے لاہور کی طوائفوں کے کاروبار پر گڈوی محلہ کی رہنے والیوں نے لات ماردی ہے۔ یہ عورتیں 20 روپے سے لیکر 500 روپے تک وصول کر کے خود کو گاہک کے سپرد کردیتی ہیں مجھے بتایا گیا: "ان کو بس ایک فون کردو یہ ہر جگہ پہنچ جاتی ہیں۔" اس سوال پر کہ کیا انہوں نے جھونپڑیوں میں فون لگوا رکھے ہیں، اس نے بتایا کہ یہاں پر درجنوں پی سی او ہیں انہوں نے پی سی او والوں کے ساتھ یارانہ بنا رکھا ہے اور وہ ان کے پیغامات دیتے اور وصول کرتے رہتے ہیں۔ ایک سوال کے جواب میں مذکورہ طوائف نے بتایا کہ اب انہوں نے ہیرا منڈی کا بھی رخ کرلیا ہے اور یہاں بھی گند ڈال دیا ہے۔ گڈوی محلہ بھی دراصل اسی طرح ایک گالی ہے جس طرح ہیرا منڈی ایک گالی ہے۔

گڈوی محلہ میں رہائش پذیر لوگوں کا تعلق چنگڑ، اوڈ، پکھی واس وغیرہ خانہ بدوش قبیلوں سے ہے۔ ان لوگوں نے گزشتہ پندرہ بیس برسوں سے ریلوے کی زمین پر جھونپڑیاں اور کچے مکان بنا کر رہائش اختیار کر رکھی ہے۔ ان لوگوں کے پاس جسم فروشی کے علاوہ کوئی ڈھنگ کا کاروبار نہیں۔ بہت سے خاندان ایسے بھی ہیں جن کی عورتیں پیشہ نہیں کرتیں اور مٹی کے اور تام چینی کے برتن فروخت کر کے گزر بسر کرتی ہیں جبکہ زیادہ تر خاندان جسم فروشی کو اپنائے ہوئے ہیں۔ ان کے پاس عموماً ایک یا دو جھونپڑیوں پر

مشتمل گھر ہیں جن میں ان کے لاتعداد بچے ننگے دھڑنگے پڑے رہتے ہیں۔ جسم فروشی کے ساتھ ساتھ اس آبادی کی عورتیں چوری کی وارداتیں بھی کرتی ہیں جبکہ ان کے مردوں کی غالب تعداد نشہ کی عادی ہے، جو سارا دن نشہ کر کے گھروں میں پڑی رہتی ہے اور ان کی عورتیں جسم فروشی کر کے گھر کا چولہا گرم رکھتی ہیں۔

کشمیر بلاک

نیلم بلاک کی طرح کشمیر بلاک کی آبادی بھی علامہ اقبال ٹاؤن کی ان بستیوں میں شمار ہوتی ہے جہاں اکثر گھروں میں پیشہ ور عورتوں نے کرائے پر مکان حاصل کر کے جسم فروشی کا دھندہ شروع کر رکھا ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق صرف کشمیر بلاک میں 13 ایسے گھر ہیں جہاں باقاعدہ جسم فروشی کا دھندہ اپنے عروج پر ہے۔ ان گھروں کے مکین لاہور کے بازار حسن سے یہاں منتقل ہوئے ہیں اور انہوں نے اس آبادی میں اپنے کاروبار کو جدید خطوط پر آگے بڑھایا ہے۔ یہاں سے فلم انڈسٹری کے ساتھ ان کا رابطہ آسان ہوا ہے اور نگار خانوں میں ان کی آمدورفت زیادہ آسان اور محفوظ ہو گئی ہے اور دوسرے نئے آباد ہونے والے اس ٹاؤن میں آباد کاروں کی سہولت کیلئے انہوں نے یہاں پر ہی کاروبار شروع کر دیا۔

کشمیر بلاک کے ان 13 گھروں میں پچاس سے زیادہ عورتیں جسم فروشی میں مصروف ہیں۔ ان کے دلال سارا دن ان کیلئے گاہک تلاش کرتے رہتے ہیں جبکہ ٹیلی فون کے ذریعے بھی ان کی بکنگ کا کام ہر وقت چلتا رہتا ہے۔ ان کی لڑکیاں اعلیٰ تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کرتی ہیں اور فراغت کے لمحات میں دھندہ کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کو شوبز میں کام کرنے کا بھی بہت زیادہ شوق ہے اور شوبز میں ان کی ایک معقول تعداد پرفارم کر رہی ہے۔ فلم، ٹی وی اور سٹیج پر بھی ان کی نمائندگی کافی زیادہ ہے۔

کشمیر بلاک میں قائم ہونے والے اڈوں کے بارے میں ایک مقامی رہائشی نے بتایا کہ ان لوگوں کا تعلق ہیرا منڈی سے ہے اور انہوں نے ہیرا منڈی چھوڑ کر اس علاقے میں رہائش اختیار کر لی ہے لیکن ہیرا منڈی والا دھندہ نہیں چھوڑا اور یہاں اس آبادی کا ماحول

خراب کر رہے ہیں۔ ان لوگوں کی وجہ سے یہ آبادی بدنام ہو گئی ہے اور ہمارے رشتہ دار یہاں ہم سے ملنے نہیں آتے اکثر لوگ ان اڈوں کے قائم ہونے کے بعد یہاں سے چلے گئے ہیں جبکہ جو باقی رہ گئے ہیں وہ مصیبت میں دن گزار رہے ہیں۔ ان لوگوں کی وجہ سے اوباش لوگ یہاں آنے لگے ہیں اور ان کی موجودگی میں کوئی شریف آدمی اپنے خاندان کے ساتھ کہیں آ جا نہیں سکتا۔

کریم پارک کے اڈے

جس طرح گزشتہ دس بارہ برسوں میں لاہور کی ہیرا منڈی سے طوائفوں کی بڑی تعداد نے علامہ اقبال ٹاؤن کے نیلم بلاک، کشمیر بلاک اور زینت بلاک میں رہائش اختیار کر کے یہاں پر جسم فروشی کے اڈے قائم کیے، اسی طرح گزشتہ دو تین برسوں سے ہیرا منڈی کی طوائفوں نے قریبی آبادی کریم پارک میں مکان کرائے پر لیکر یہاں جسم فروشی کے کاروبار کو فروغ دیا ہے۔ کریم پارک میں اس وقت 7 بڑے اڈے ہیں جہاں پچاس سے زائد پیشہ ور عورتیں جسم فروشی کر رہی ہیں۔ کریم پارک چونکہ اقبال ٹاؤن سے زیادہ سستی رہائشی آبادی ہے اس لئے یہاں پر طوائفوں کی آبادکاری دن بدن بڑھ رہی ہے کریم پارک میں قائم اڈوں میں ثمینہ نامی طوائف کا اڈہ سب سے زیادہ مشہور ہے۔ یہ طوائف اس سے پہلے ہیرا منڈی کی حیدری سٹریٹ میں اپنا کاروبار کرتی تھی لیکن حیدری سٹریٹ میں گاہکوں کی عدم دلچسپی سے خوفزدہ ہو کر اس نے کریم پارک منتقل ہو جانے کا فیصلہ کیا اور اپنے ساتھ ان لڑکیوں کو بھی لے آئی جو حیدری سٹریٹ میں اس کے ساتھ کام کر رہی تھیں۔

ثمینہ کے اڈے پر آنے جانے والوں نے اہل محلہ کو شدید کوفت میں مبتلا کر رکھا ہے اور لوگوں نے کئی بار مقامی پولیس تھانے کو اپنی شکایت سے آگاہ کیا ہے لیکن ابھی تک ان کی شنوائی نہیں ہو سکی۔ ایک مقامی باشندے نے بتایا کہ کریم پارک اس طرح کی آلائشوں سے پاک علاقہ تھا لیکن بدقسمتی سے یہاں بھی طوائفوں نے ڈیرے ڈال دیئے ہیں اور ان کے دلال گلی محلوں میں پھر کر ہر وقت گاہک تلاش کرتے رہتے ہیں۔ ان لوگوں نے سارے محلے کا ماحول خراب کر دیا ہے اور ہمیں خدشہ ہے کہ اگر ہم نے رہائش تبدیل نہ کی

تو ہمارے نوجوان بری عادات کا شکار ہو جائیں گے۔ اس نے مطالبہ کرنے کے سے انداز میں کہا کہ انتظامیہ کو چاہئے کہ وہ جسم فروش عورتوں کو عام آبادیوں سے دور رکھے اور ان کیلئے جو علاقہ مخصوص کر دیا گیا ہے ان کو ہر صورت میں وہاں رہنے کا پابند بنایا جائے۔ کریم پارک میں واقع ثمینہ کے اڈے پر ہر وقت رش لگا رہتا ہے اڈے پر ثمینہ نے باقاعدہ ایک منشی بٹھا رکھا ہے جو آنے جانے والے گاہکوں کا اندراج کر کے حساب رکھتا ہے۔

ثمینہ کے علاوہ شبنم کا اڈہ بھی خاصی شہرت کا حامل ہے۔ موہنی رام روڈ پر واقع اس اڈے پر 6 پیشہ ور لڑکیاں ہر وقت موجود رہتی ہیں اور گاہکوں سے 300 سے 500 روپیہ لیکر ان کے ساتھ جنسی فعل کرتی ہیں۔ شبنم کے بارے میں یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ شیخوپورہ کی رہنے والی ہے اور اس نے تقریباً پانچ سال پہلے ہیرا منڈی میں عتیقہ کے کوٹھی خانے پر جسم فروشی کا دھندہ شروع کیا۔ شبنم کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ایک سخت جان طوائف ہے جو عام عورتوں کی نسبت زیادہ مضبوط ہے اور اس کا معاوضہ بھی بہت کم ہے۔ ذرائع کے مطابق شبنم نے کچھ عرصہ کیلئے گلبرگ کے ایک کوٹھی خانے پر بھی کام کیا لیکن بعد میں اس نے کریم پارک میں اپنا ذاتی اڈہ بنالیا۔

شبنم کے اڈے پر اس کی چھوٹی بہن بھی پیشہ کرتی ہے جبکہ شبنم نے اپنے ایک پرانے گاہک سے شادی کر رکھی ہے جو فراڈ کے کئی مقدمات میں پولیس کو مطلوب ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ اگر پیشہ نہ کرے تو کیا کرے، اس نے میٹرک تک تعلیم حاصل کر رکھی ہے جبکہ اس کے ساتھ بچپن میں ایک پڑوسی لڑکے نے زبردستی زیادتی کر ڈالی تھی۔ اس کے والدین کمزور تھے اس لئے وہ اس لڑکے کے خلاف کوئی کارروائی نہ کر سکے اور اس کے والدین نے مجبوراً شیخوپورہ چھوڑ کر لاہور کے علاقے گرین ٹاؤن میں رہائش اختیار کر لی۔ اس کا والد دو سال پہلے ایک حادثہ میں ہلاک ہو گیا اور بھائی نہ ہونے کی وجہ سے سارے خاندان کی کفالت کی ذمہ داری اس پر آپڑی۔ اس نے مزید بتایا کہ دو بہنیں جو اس سے چھوٹی ہیں وہ ابھی زیر تعلیم تھیں جبکہ والدہ فالج کے حملے کے باعث چلنے پھرنے سے قاصر تھی۔ اس نے ایک فیکٹری میں پیکنگ کا کام کرنا چاہا لیکن دوسرے ہی دن اس کو احساس ہو گیا کہ ملازمت لیکر دینے والا اس کی تنخواہ اس شرط پر اچھی مقرر کرائے گا اگر وہ اس کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرے گی۔ اس نے مزید بتایا کہ میں نے یہ ملازمت

تیسرے دن چھوڑ دی اور ایک پرائیویٹ سکول میں بچوں کو پڑھانے کی نوکری کرلی۔ سکول کے پرنسپل نے جو کہ خود مالک بھی تھا اس کو ایک دن دفتر میں چھٹی کے بعد روک لیا اور اس سے تقاضہ کیا کہ وہ اس کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرے اور اگر وہ ایسا کرے گی تو سکول میں اس کی تنخواہ سب دیگر استانیوں سے زیادہ مقرر کی جائے گی۔ لہٰذا یہ ملازمت بھی چھوڑنا پڑی۔ جب گھر میں فاقے آگئے تو پھر دوبارہ فیکٹری کا رخ کیا اور اچھی تنخواہ مقرر کرانے کے عوض اپنے پہلے "مہربان" کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرنے کی حامی بھر لی۔ اس نے مزید بتایا کہ: "تنخواہ تو اچھی نہ تھی لیکن اس نے تقریباً زبردستی میرے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرلئے۔ وہ ہر دوسرے دن مجھے فیکٹری کے مالک، جو اس کے دوست تھے کے کمرے میں لے جاتا اور اپنی ہوس کا نشانہ بناتا۔ میں نے احتجاج کرنا چھوڑ دیا تو وہ مجھے تحفے تحائف دینے لگا، کبھی کبھار نقدی کی صورت میں بھی مدد دینے لگا۔ اس نے رفتہ رفتہ اپنے دوستوں کو بھی میرے ساتھ متعارف کرادیا اور وہ سب ملکر مجھے استعمال کرنے لگے۔ اس کے دوستوں نے مجھے اچھی خاصی رقم دینا شروع کردی اور میں نے فیکٹری کی ملازمت چھوڑ دی۔ وہ مجھے جہاں بلاتے میں بلا خوف و خطر وہاں چلی جاتی اور تنخواہ سے کئی گنا زیادہ پیسے لیکر ان کی خواہشات پوری کرتی"۔

اب شبنم مکمل طور پر پیشہ ور کی سی زندگی گزار رہی ہے اور اس نے شادی کا خیال دل سے نکال دیا ہے اس نے شادی کے ذکر پر کہا: "شادی تو روزانہ ہوتی ہے، مجھے تو معلوم ہی نہیں کہ شادی کس کو کہتے ہیں اگر شادی جنسی تعلق کا نام ہے تو پھر میں روزانہ شادی کرتی ہوں۔ اس کے علاوہ مجھے معلوم نہیں کہ کیا ہوتا ہے۔ مجھے اولاد کی بھی کوئی خواہش نہیں، میں بھی تو اپنے والدین کی ایک اولاد تھی اور مجھے جن حالات کا سامنا کرنا پڑا اسی طرح کے حالات کا سامنا میری اولاد کو بھی کرنا پڑے گا۔ میری چھوٹی بہن راحت بھی میرے ساتھ یہی پیشہ کرتی ہے اور وہ خوش ہے، ایک بار اس نے مجھے بتایا کہ اسے کسی سے محبت ہوگئی ہے۔ میں نے اس کو کہا کہ وہ اس لڑکے کو کہے کہ وہ اپنے حصے کی جائیداد لکھ کر اس کے نام کردے اور اگر اس کے پاس جائیداد نہیں تو پھر وہ ماہانہ دس ہزار روپے خرچ لکھ کر دے اور طلاق کا حق صرف لڑکی کو حاصل ہو۔ اس نے اپنے محبوب سے بالکل اسی طرح کہا تو وہ خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا اور پھر کبھی نہیں آیا"۔

شبنم ایسے باتیں کرتی ہے جیسے کوئی عمر رسیدہ اور تجربہ کار تعلیم یافتہ عورت کرتی ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ شروع دن سے ہی مسائل اور مشکلات کا شکار رہی ہے ان مشکلات نے اس کو کھل کر بولنے اور ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کرنے کے قابل بنادیا ہے۔ اس نے مزید بتایا کہ وہ کامیابی کے ساتھ کاروبار کر رہی ہے اور اسے امید ہے کہ وہ اسی طرح کام کرتی رہے گی۔

کریم پارک میں طاہرہ بیگم، سلیم اور مونا کے اڈے بہت زیادہ مشہور ہیں۔ ان اڈوں پر بھی کئی لڑکیاں جسم فروشی کا دھندہ کر رہی ہیں اور وہ مالکوں سے اور مالکوں سے کمیشن وصول کرتی ہیں۔ ان لڑکیوں کی بڑی تعداد ہیرا منڈی سے روزانہ ان اڈوں پر آتی ہے اور رات کو اپنی اجرت لیکر واپس ہیرا منڈی چلی جاتی ہے۔ مونا نامی طوائف کے اڈے پر تین لڑکیاں بہاری خاندانوں سے تعلق رکھتی ہیں اور باقاعدہ شادی شدہ زندگی گزار رہی ہیں۔ ان عورتوں کے خاوند کوئی کام نہیں کرتے اور ان کی کمائی پر ان کا گزارہ ہوتا ہے۔ ایک دلال نے بتایا کہ لوگ عام طور پر ان بہاری عورتوں کو زیادہ پسند نہیں کرتے اس لئے ان کے ریٹ سب سے کم ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ کالے رنگ کی کمزور عورتیں شاید بیمار ہیں جبکہ دوسری عورتیں جوان اور موٹی تازی ہیں۔

والٹن میں شریف کا اڈہ

گڈوی محلے کی طرح والٹن میں بھی ایک پوری بستی جسم فروشی کے دھندے سے منسلک ہے۔ پیر کالونی والٹن کے کئی گھروں میں ایک اقلیتی فرقے کی عورتیں جسم فروشی کا دھندہ کرتی ہیں جبکہ ان کے مرد شہر کے فائیو سٹار ہوٹلوں میں شراب فروخت کرتے ہیں۔ یہ عورتیں عموماً چل پھر کر جسم فروشی کرتی ہیں جبکہ کچھ گھروں میں گاہکوں کی خاطر مدارت کا بھی اہتمام ہوتا ہے۔ مقامی پولیس اس کاروبار کو روکنے کیلئے کچھ بھی نہیں کر سکتی کیونکہ کاروبار رک جانے کی وجہ سے اس کو ایک خطیر رقم سے ہاتھ دھونا پڑیں گے جو تمام پیشہ ور گھروں سے اکٹھی ہو کر مہینے کے آخر میں عاشق نامی ایک ٹاؤٹ کے ذریعے مقامی پولیس کو پہنچتی ہے۔ اس علاقے کے لوگوں کا کہنا ہے کہ

پانچ سال پہلے اس علاقے میں کوئی جسم فروش عورت نہیں رہتی تھی لیکن معلوم نہیں کہاں سے ان عورتوں کا ایک سیلاب والٹن میں آ گیا ہے۔ یہ عورتیں سارا دن جسم فروشی کرتی ہیں اور ان کے مرد شراب نوشی کرتے ہیں۔ لوگ گاڑیوں میں سوار ہو کر یہاں آتے ہیں اور ان عورتوں کو بٹھا کر ساتھ لے جاتے ہیں۔

والٹن کی اس بستی میں سب سے بڑا اڈہ شریف عرف شریفے کا ہے۔ شریفا تقریباً اس سارے علاقے کو شراب مہیا کرتا ہے جبکہ اس کے کارندے ضرورت مندوں کو عورتیں فراہم کرتے ہیں۔ آج تک شریفے کے اس کاروبار کو روکا نہیں جا سکا۔ دن بدن اس کے اڈے پر طوائفوں اور گاہکوں کا رش بڑھتا جا رہا ہے۔ شریفے کے بارے میں مقامی لوگ یہ جانتے ہیں کہ وہ اوکاڑہ کا رہنے والا ہے اور وہاں ہیرا منڈی میں دلالی کیا کرتا تھا۔ دس سال پہلے اس نے اس علاقے میں یہ مکان کرائے پر حاصل کیا اور دو تین عورتیں رکھ کر جسم فروشی کا دھندہ شروع کر دیا۔ اس کے کاروبار نے اتنی ترقی کی کہ جس مکان میں وہ کرایہ پر رہتا تھا وہ اس نے منہ مانگی قیمت ادا کر کے خرید لیا اور زیادہ دھڑلے کے ساتھ جسم فروشی کا دھندہ کرنے لگا۔ اس کے اڈے کا سارا انتظام اس کی بیوی سنبھالتی ہے جبکہ وہ خود مال روڈ پر واقع ایک بڑے ہوٹل میں شراب فروخت کرتا ہے۔

والٹن کے اس علاقے میں شریف کے علاوہ بھی کئی ایسے اڈے ہیں جہاں درجنوں لڑکیاں جسم فروشی کا دھندہ کرتی ہیں۔ ان اڈوں سے پولیس باقاعدہ بھتہ وصول کرتی ہے اور ان کو کاروبار کی اجازت دیتی ہے۔ ایک پیشہ ور عورت نے بتایا کہ اس کا خاوند نشہ کرتا ہے اور ان کے چھ بچے ہیں۔ ان بچوں کو پالنے کیلئے اور خاوند کے نشے کیلئے پیسے اکٹھے کرنے کیلئے وہ یہ دھندہ کرتی ہے۔ اس کا تعلق ایک اچھے گھر سے ہے لیکن وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ نہیں مل سکتی کیونکہ اس نے گھر سے بھاگ کر شادی کی تھی اور نہ ہی وہ بھیک مانگ سکتی ہے، اس لئے وہ چوری چھپے جسم فروشی کا دھندہ کرتی ہے۔ تقریباً اس عورت سے ملتی جلتی داستان دیگر پیشہ ور عورتوں کی بھی ہے جو اس پیشے کو اپنی مجبوری قرار دیتی ہیں اور اس مجبوری کے اندر اس کام کا جواز تلاش کرتی ہیں۔ اس علاقے میں جسم فروشی کا دھندہ کرنے والی عورتیں زیادہ بیمار ہیں کیونکہ انہیں ایک آلودہ ماحول میں زندگی گزارنا پڑ رہی ہے جبکہ ان کو مکمل خوراک بھی حاصل نہیں ہوتی۔

اندرون لاہور کے اڈے

بازار حسن کے علاوہ اندرون لاہور کے جسم فروشی کے اڈے خاص شہرت کے حامل ہیں۔ تنگ و تاریک گلیوں میں جہاں ہر وقت رات کا سماں ہوتا ہے جسم فروش عورتیں اپنے گاہک تلاش کرتی رہتی ہیں۔ اندرون لاہور جسم فروشی کے اڈے اصل میں مختلف گھروں میں قائم ہیں۔ عموماً ان اڈوں پر دو یا تین پیشہ ور عورتیں اپنا کاروبار چلاتی ہیں۔ ان عورتوں کا تعلق عموماً گھرانوں سے ہے اور ان میں سے اکثر کے خاوند یا دیگر گھر والے نشہ کے باعث کمانے کی صلاحیت نہیں رکھتے اس لئے وہ زیادہ تر جسم فروشی پر انحصار کرتی ہیں۔ ان اڈوں میں ثمینہ کا اڈہ جس پر چار عورتیں کام کرتی ہیں، اندرون بھاٹی کے علاقہ میں زیادہ مشہور ہے۔ ثمینہ نے بھی کچھ عرصہ ٹبی گلی کے ایک اڈے پر کام کیا ہے اور وہ گزشتہ دس برسوں سے اس پیشے کے ساتھ وابستہ ہے۔ دہلی دروازے کے قریب بھی جسم فروشی کا ایک چھوٹا اڈہ قائم ہے جہاں تین عورتیں دن کے وقت اپنے گاہکوں کو جسم فروخت کرتی ہیں۔ ان عورتوں کے زیادہ تر گاہک لنڈا بازار کے تاجر اور مقامی لوگ ہیں۔

گزشتہ صفحات میں لاہور میں عام آبادیوں کے اندر جسم فروشی کے اڈوں کے بارے میں تفصیلات فراہم کی گئی ہیں۔ ممکن ہے ان میں سے کچھ اڈے رہ گئے ہوں لیکن حتیٰ المقدور کوشش کی گئی ہے کہ عام آبادیوں میں قائم جسم فروشی کے اڈوں کے بارے میں جو معلومات حاصل ہو سکی ہیں ان کو اپنے قارئین کیلئے پیش کر دیا جائے۔ اس دوران خصوصی طور پر یہ کوشش کی گئی ہے کہ ان جسم فروشی کے اڈوں کو چلانے والوں اور ان اڈوں پر کام کرنے والیوں کے اصل نام نہ دیئے جائیں لیکن بعض اوقات حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے اور کتاب کے موضوع کی ضرورت کے مطابق اصل نام بھی استعمال کئے گئے ہیں۔

نگار خانے اور جسم فروشی

"میرا خاندان قصور کا رہنے والا ہے، میرا والد مالشیا تھا اور وہ ہر ہفتے لاہور سے گھر واپس آتا۔ اس کی ساری زندگی محنت کرتے ہوئے گذری ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بار اس کی ٹانگ پر چوٹ لگ گئی اور وہ پورے بیس دن لاہور نہ جا سکا۔ اس دوران ہمارے پاس ایک پیسہ بھی نہیں تھا کہ ہمارا چولھا ہی جلتا رہتا۔ میرے والد نے مجھے ایک رقعہ لکھ کر دیا اور بادشاہی مسجد لاہور کے قریب واقع ایک محلے میں رہنے والی ارشد بیگم عرف اچھو بیگم کے ہاں بھیجا۔ میں نے اسے باپ کے زخمی ہونے اور گھر کی حالت کے بارے میں بتایا۔ اچھو نے مجھے پانچ سو روپے دیئے اور تاکید کی کہ اگر ضرورت پڑے تو دوبارہ آ جانا۔ جب والد ٹھیک ہو گیا تو وہ دوبارہ کام پر جانے لگا۔" فرزانہ نے مزید بتایا کہ: اس کا کوئی بھائی نہیں وہ تین بہنیں ہیں ایک شادی شدہ ہے اور اس کا خاوند بیرون ملک ملازمت کرتا ہے۔ چھوٹی دونوں بہنیں پیشہ کرتی ہیں اور انہیں معلوم نہیں کہ ان کی کبھی شادی ہو گی اور وہ بھی اپنی مرضی کے ساتھ کسی ایک مرد کے ساتھ زندگی گزار سکیں گی۔

فرزانہ کی داستان دیگر جسم فروش عورتوں سے بہت زیادہ مختلف نہیں لیکن اس داستان میں ایک ایسی سبق آموز کشش ہے جو سننے والے کو حیران کر دیتی ہے۔ فرزانہ کی عمر اس وقت 27، 28 سال ہے۔ یہ اپنی پیشہ ور کی سی زندگی کا حساب لگاتے ہوئے یہ مدت پانچ سال بتاتی ہے اور ساتھ ہی اس کو اچھی طرح یاد ہے کہ وہ اس دوران چار مرتبہ اسقاط حمل کے مراحل سے گزر چکی ہے اور اب اس نے ایک ایسا آپریشن کروالیا ہے جس کے موثر رہنے کی مدت پانچ سال ہے یوں وہ بغیر کسی خوف کے مزید پانچ سال آزادی کے ساتھ جسم فروشی کا دھندہ کر سکتی ہے۔ اس کی چھوٹی بہن شبانہ جس کی عمر 24 سال ہے اس نے 18 سال کے عمر سے دھندہ شروع کیا اور اب وہ بڑی بہن کے ساتھ شاہ نور سٹوڈیو کے عقب میں واقع آبادی کے ایک گندے سے گھر میں رہ رہی ہے۔ یہ دونوں بہنیں اپنے گھر میں دھندہ نہیں کرتیں بلکہ ان کا زیادہ وقت شاہ نور سٹوڈیو، ایورنیو سٹوڈیو یا باری سٹوڈیو میں گزرتا ہے۔ دونوں ایکسٹرا کے طور پر بھی کام کرتی ہیں

اور اصل میں یہاں ان کو اپنے گاہک مل جاتے ہیں۔ سٹوڈیوز کے اندر ہی ان کو "بیٹھنے" کی جگہ مل جاتی ہے اور بعض اوقات اچھے گاہک ان کو اپنی رہائش گاہوں یا ہوٹلوں میں بھی لیجاتے ہیں۔

فرزانہ نے ایک بار ایک میک اپ کرنے والے سے عشق لڑایا لیکن اس نے بھی جسم کا مزہ چکھنے کے بعد ایک دوسری لڑکی کی طرف رجوع کر لیا۔ شبانہ کو عشق کرنا نہیں آتا اس کو صرف یہ معلوم ہے کہ ماہواری کے ایام کے علاوہ اس کو ہر صورت میں ایک دن میں دوسروں کو پھانسنا ہے۔ ان سے حاصل ہونے والی رقم سے اس نے تین سگریٹ چرس بھرے پینا ہیں اور بڑی بہن کو رات کو 100 روپے دینا ہے تاکہ وہ گھر کے معاملات صحیح طرح سے چلا سکے اور بوڑھی ماں کو سنبھال سکے۔ ان کا والد ہیرا منڈی میں ایک طوائف کے ڈیرے پر پڑا رہتا ہے۔ اس کی مالش کرنے والی طاقت عرصہ پہلے ختم ہو گئی تھی اب وہ مذکورہ طوائف کے کوٹھے پر آنے والوں کی خدمت کرتا ہے۔ بازار سے سود سلف لاتا اور سر شام ہیروئن کا ایک سگریٹ پی کر رات بھر کے لئے مدہوش ہو جاتا ہے۔ فرزانہ اور شبانہ کا ایک بھائی بھی تھا۔ اس کا نام سلیم تھا اور وہ جوانی کے ایام میں ہی رائیونڈ کے قریب ایک پولیس مقابلے میں مارا گیا تھا۔ بھائی کے بارے میں شبانہ اور فرزانہ زیادہ نہیں جانتیں، بس ان کو اس کی ہلاکت کے بارے میں معلوم ہے کہ کس طرح پولیس نے اس کو گھیر کر ڈھیر کر دیا تھا کیونکہ اس کے پاس کارتین تھی اور وہ کسی واردات کی نیت سے ایک گھر میں داخل ہو گیا تھا۔ ان کو یہ بھی یاد ہے کہ بھائی ان سے دس سال بڑا تھا اور اکثر گھر سے باہر وقت گزارتا تھا۔

بھائی کی ہلاکت کے بعد مقامی پولیس اسٹیشن والے دونوں بہنوں کو باپ سمیت پکڑ کر تھانے لے گئے۔ ساری رات ان کے باپ کو پولیس والے ننگا کر کے مارتے رہے جبکہ دونوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنے چیختے چلاتے ننگے باپ کو دیکھیں: "اگلے دن صبح تقریباً 10 بجے ہم دونوں کو ایک اے ایس آئی رکشہ میں بٹھا کر نامعلوم مکان میں لے گیا۔ وہاں پہلے سے چار پانچ افراد جمع تھے۔ انہوں باری باری ہمارے ساتھ جنسی زیادتی کی۔ ہم دونوں بہنیں چیختی چلاتی رہیں لیکن ان کو ترس نہ آیا۔ ہم دونوں بے ہوش ہو گئیں اور پھر جب ہم کو ہوش آیا تو ہم اپنے گھر کے صحن میں پڑی تھیں۔ ہماری ماں بین کر رہی تھی او

ہمارے باپ کو پولیس نے ابھی تک آزاد نہیں کیا تھا۔"

بھائی کی ہلاکت اور باپ پر تشدد کے بعد دونوں بہنوں نے اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کے بارے میں کسی کو بھی کچھ نہ بتانے کا فیصلہ کیا۔ باپ کی رہائی کے بعد انہوں نے اپنے آبائی مکان کو کوڑیوں کے بھاؤ بیچ کر لاہور کا رخ کیا۔ گھر کے سربراہ کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ جہاں گذشتہ دس سال سے مالش کر رہا تھا وہیں پہنچ کر کسی سے بات کرے۔ بے چارہ رفیق ہیرا منڈی کے محلہ شیخوپوریاں پہنچا اور اپنی محسن اچھو بیگم سے ملا، اس کو ساری داستان سنائی۔ اچھو نے ٹبی گلی میں دو کمرے کا ایک تاریک مکان سات سو روپے ماہوار کرائے پر لے دیا۔ دونوں میاں بیوی اور ان کی جوان بیٹیاں ٹبی گلی کے اس نئے گھر میں منتقل ہو گئے۔ ارد گرد کوئی ان کو جاننے والا نہ تھا، نہ ہی رائے ونڈ کے ساتھ ان کا کوئی رابطہ باقی بچا تھا۔ باپ سارا دن سویا رہتا اور شام کو تیل کی شیشیاں لے کر نکلتا، صبح تا صبح کو لوٹتا اور یوں گھر چلنے لگا۔ تقریباً ڈیڑھ ماہ یہ خاندان ٹبی گلی میں خاموشی کے ساتھ رہائش پذیر رہا اور پھر ایک دن ان کی زندگیوں میں انقلاب آگیا۔ اس "انقلاب" کے بارے میں فرزانہ نے بتایا:

"ہمارے اخراجات لاہور آکر بہت زیادہ بڑھ گئے تھے۔ ہمارے باپ کی ساری کمائی مکان کے کرائے اور بجلی پانی کے بلوں پر خرچ ہو جاتی اور گھر میں فاقے آنے لگے۔ ایک دن ہم خالہ اچھو کے ہاں گئے اور ان کو بتایا کہ یہاں حالات اچھے نہیں ہیں ہم دونوں بہنیں جوان ہیں اور لوگوں کے گھروں میں اگر صفائی وغیرہ جیسا کوئی کام مل جائے تو ہماری زندگی تبدیل ہو سکتی ہے۔ اچھو بیگم نے ایک گھر میں فرزانہ کو کام لے دیا اور یوں ہماری گذر بسر بہتر ہونے لگی۔ جہاں فرزانہ کام کرتی تھی وہاں اس نے مجھے (شبانہ) بھی بلا لیا اور کہا کہ اس کو شادی کی کوئی ضرورت نہیں۔

اب انہوں نے شادی کے بارے میں سوچنا تقریباً ترک کر دیا ہے۔ ماں اتنی بوڑھی اور کمزور ہو چکی ہے کہ کسی بھی وقت اس کی موت واقع ہو سکتی ہے۔ باپ سے ان کی ملاقات کو تین برس گذر چکے ہیں اور اس نے نہ کبھی ان کو ملنے کی کوشش کی ہے اور نہ کبھی ان کو ملاقات کی خواہش ہوتی ہے۔ دونوں بہنوں کا خیال ہے کہ اب ان کے باپ کو ان کی ضرورت نہیں رہی کیونکہ وہ دو تین گاہک تلاش کر کے اچھو کے ڈیرے پر لے آتا

ہے اور ان سے جو کمیشن ملتا ہے وہ اس کے ہیروئن بھرے سگریٹ اور تین کپ چائے کے لئے کافی ہے۔ کھانا اس کو اچھو کے گھر سے مل جاتا ہے۔

اب دونوں نے اپنے کام دھندے کو خاصا کم کر دیا ہے اور ان کے گاہکوں کی تعداد بھی رفتہ رفتہ کم ہونے لگی ہے۔ بڑی بہن روزانہ تین سگریٹ ہیروئن کے پیتی ہے جبکہ چھوٹی نے کمال چابک دستی کے ساتھ اپنے بائیں بازو کی نیلی رگوں میں سرنج چبھونے کا ہنر سیکھ لیا ہے۔ تینوں سٹوڈیوز کے باسی ان کو "فرزانی" اور "شبانی" کے ناموں سے جانتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ کسی دوسرے کے سامنے ان دونوں کے ساتھ بات چیت نہ کریں۔ باری سٹوڈیو میں واقع چاچے کے ٹی سٹال پر سارا دن یہ دونوں بہنیں بیٹھی رہتی ہیں اور گاہک ملنے کی صورت میں یہ ایک پرانے سٹور میں چلی جاتی ہیں۔ سٹور کیپر فی گاہک دس روپے وصول کرتا ہے اور فلمی عکاسی کے دوران استعمال ہونے والی لائٹوں کے ٹوٹے ہوئے کھوپڑوں کے درمیان ان کو تھوڑے وقت کیلئے جگہ فراہم کر دیتا ہے: "یہاں ان کو اس دھندے سے کوئی روکنے والا نہیں کیونکہ جو بھی یہاں آتا ہے اس کیلئے یہ دھندہ کوئی نئی چیز نہیں ہوتی۔ یہاں پر درجنوں عورتیں جسم فروشی کا دھندہ کرتی ہیں اور اپنے خاندانوں کا پیٹ پالتی ہیں، وہ کسی کو کچھ نہیں کہتیں تو ان کو ان کے کام سے روکنے والا کون ہے؟ جو ان کو اس دھندے سے روکتا ہے وہ ان کو کوئی دوسری باعزت نوکری لے دے۔ یہ عورتیں اگر جسم فروشی نہ کریں تو پھر کون ان کو روزی دے گا، کون ان کو سہارا دے گا۔ جب تک یہ زندہ ہیں اپنا جسم بیچ کر پیٹ بھرتی رہیں گی۔" یہ ایک ہدایتکار کے خیالات تھے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اپنی ہر فلم میں طوائف کا سین ضرور رکھتا ہے۔

دونوں بہنیں کسی قیمت پر دھندہ چھوڑنے پر تیار نہیں کیونکہ انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ اب اس ماحول کے علاوہ ان کی گنجائش ختم ہو چکی ہے۔ کوئی بھی شخص ان کو عزت دینے کو تیار نہیں اور نہ ہی کوئی ان کے منہ لگنا چاہتا ہے۔ ان کو عموماً کراہت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور جب تک ان کو دیکھنے والا جو ان کا ماضی بھی جانتا ہو ان پر آوازہ نہ کس لے اس کو سکون نہیں ملتا کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اگر اس نے ان کو دیکھتے ہی ان کی زندگی اور پیشے کے بارے میں کوئی آوازہ نہ کسا تو وہ ان کا حق ادا نہیں کر

سکے گا، اس لئے وہ ادائیگی حق کیلئے ان پر آوازے کستا ہے۔ چائے والا، کھوکھے والا، پھیری والا غرض بھیک مانگنے والا بھی ان کو ایک مخصوص نظر کے ساتھ دیکھتا ہے جس میں عجیب قسم کی نفرت اور شہوت کے یکساں جذبات موجود ہوتے ہیں۔ بڑے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ان دونوں بہنوں کو مذید دو تین سال گاہک ملتے رہیں گے اور ان کی زندگی کی گاڑی چلتی رہے گی۔ سب لوگ جانتے ہیں کہ اس عرصے کے بعد ان کا کوئی پرسان حال نہ ہوگا۔ لوگ مذید نفرت کے ساتھ ان سے مخاطب ہوں گئے اور عین ممکن ہے کہ سٹوڈیو کی انتظامیہ ان کا داخلہ بند کر دے۔ گاہکوں کی عدم موجودگی کے باعث یہ دونوں کرائے کا مکان اپنے پاس نہیں رکھ سکیں گی اور ان کو مجبوراً سڑکوں پر آنا پڑے گا۔ اس طرح کی کیفیت عموماً اس طرح کی عورتوں کے ساتھ زندگی کے آخری ایام میں رونما ہوتی ہے۔ بالآخر یہ عورتیں ایسی جگہوں پر بھیک مانگیں گی جہاں ان کے ماضی سے کوئی آشنا نہ ہو۔ بھیک نہ ملنے یا کم ملنے کی صورت میں یہ عورتیں روٹی کے چند ٹکڑوں کیلئے بالآخر کسی بھکاری کو اپنا جسم پیش کریں گی اور اس طرح شاید بھکاری گاہکوں کی وجہ سے ان کی کسمپرسی کی زندگیوں کے چند لمحات طویل ہو جائیں۔ آخر کار ایک بھیانک اور عبرتناک موت ان کا تعاقب کرتی ہوئی انہیں کسی سڑک پر یا کسی جھونپڑی میں آئے گی اور ان کے کفن دفن کا معاملہ عموماً میونسپل کارپوریشن کو نبٹانا پڑے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی قوی امکان ہے کہ ان کی موت سے پہلے ہی ان جیسے حالات سے دوچار عورتوں کی ایک بہت بڑی تعداد ان کے نقش قدم پر چل پڑی ہو اور وہ بھی ہو بہو ان جیسی زندگی گذارے۔

پاکستان فلم انڈسٹری کے پاس صرف لاہور میں تین قدیمی نگار خانے موجود ہیں جہاں اردو، پشتو اور پنجابی فلموں کی شوٹنگز وغیرہ ہوتی ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے کراچی میں بھی نگار خانہ سٹی سٹوڈیو کے نام سے شروع کیا گیا لیکن ستر کے عشرے کے وسط میں فلمسازوں کا لاہور کی طرف رجحان بڑھ جانے کے باعث بند کر دیا گیا۔ بعض فلمساز پشاور اور کوئٹہ کے بعض مقامات پر شوٹنگ وغیرہ کر لیتے ہیں لیکن لاہور کی طرح کسی دوسرے شہر میں باقاعدہ سٹوڈیو نہیں ملتے۔ لاہور کے ان سٹوڈیوز میں ایورنیو سٹوڈیو اور باری سٹوڈیو شامل ہیں۔ شاہ نور سٹوڈیو معروف فلمساز، ہدایتکار اور پروڈ[illegible] نے بنایا۔

ایورنیو سٹوڈیو فلمساز آغا جی اے گل نے بنایا جبکہ باری سٹوڈیو فلمساز باری ملک نے تعمیر کرایا۔ ان کے علاوہ بند روڈ لاہور پر اے ایم سٹوڈیو کے نام سے ایک نگار خانہ بنایا گیا لیکن یہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے علاوہ شباب کیرانوی نے چوہنگ کے قریب شباب سٹوڈیو کے نام سے ایک نگار خانہ بنوایا، کچھ عرصہ بند رہنے کے بعد ایک بار پھر شباب سٹوڈیو میں فلموں کی عکاسی وغیرہ ہو رہی ہے۔

شروع میں ان سٹوڈیوز میں عام لوگوں کا رش بہت کم ہوتا تھا جس کے باعث ان مقامات پر کاروباری مواقع بہت کم تھے۔ رفتہ رفتہ فلمسازی کا ادارہ ترقی کرتا گیا اور ذرائع ابلاغ میں تشہیر کے باعث لوگوں نے ادھر متوجہ ہونا شروع کیا۔ سینما گھروں میں جانے والے لوگ اس بات کی بھی خواہش رکھتے کہ وہ پردہ سکرین پر نظر آنے والے مناظر کو حقیقی انداز میں دیکھیں اور وہ جو ایکشن پردہ سکرین پر دیکھتے ہیں اس کو اگر سامنے دیکھا جائے تو کیسا لگے گا۔ 60ء کے عشرے کے شروع میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے شوٹنگ دیکھنے کیلئے نگار خانوں میں آنا شروع کر دیا۔ شروع کی فلمیں انتہائی سادہ اور بلیک اینڈ وائٹ تھیں اس لئے معمول کے مطابق فلمسازی کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ رنگین فلموں کی آمد کے ساتھ ہی نگار خانوں کی دنیا بدل گئی اور فلموں میں بھی جدت کا رنگ نظر آنے لگا۔ سٹوڈیوز میں بڑے بڑے اور رنگین سیٹ لگائے جانے لگے۔ ہیروئن اور ہیرو کے لباس رنگین اور شوخ رنگوں کے تیار کئے جانے لگے اور نئی تیار ہونے والی فلموں میں گانے کے موقع پر ہیروئن کے ساتھ کئی کئی لڑکیاں ڈانس کرتی اور ہنسی مذاق کرتی نظر آنے لگیں ان لڑکیوں کو جو ہیروئن کے ساتھ گانوں میں ناچتی گاتی تھیں اور ہیروئن کی سہیلیوں کا کردار ادا کرتی تھیں "ایکسٹرا" کہا جانے لگا۔ بہت سی ایسی لڑکیاں بھی ایکسٹرا بن گئیں جو گھر سے ہیروئن بننے کیلئے نکلی تھیں اور سفارش وغیرہ نہ ہونے کے باعث ان کو فلموں میں کام نہ مل سکا تو انہوں نے ایکسٹرا کے طور پر کام کرنا شروع کر دیا اور کسی نہ کسی طرح پردہ سکرین پر آنے لگیں۔ ایکسٹرا لڑکیاں سارا دن ایک ایک گانے کی ریہرسل میں محنت کرتیں اور فلمسازوں کی منت سماجت کے بعد ان کو چند روپے ملتے۔ اس تھوڑی سی رقم کے ساتھ یہ بے گھر لڑکیاں گذر بسر نہیں کر سکتی تھیں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ ایکسٹرا اداکار کو فلمساز ایک پیسہ بھی نہ دیتا اور وہ اپنی گذر بسر کیلئے جسم فروشی کا

دھندہ کرتا یا اس دھندے میں دلالی کرتا اور پیٹ پالتا۔

ایک سابق اداکار نے بتایا کہ شروع میں وہ لڑکیاں فلموں میں ایکسٹرا رول کرنے کیلئے آتیں جو ہیرا منڈی میں طوائفوں کے ہاں جسم فروشی کا دھندہ کرتی تھیں کیونکہ کوئی بھی عام آدمی اپنی لڑکی کو ایکسٹرا کے رول کیلئے نہیں بھیج سکتا تھا۔ ایکسٹرا کو ایک خاص قسم کے طنز کا سامنا کرنا پڑتا۔ فلمساز ان ایکسٹرا اداکاروں کو فلم کے کسی گانے یا دو تین منٹ کے کسی سین میں کاسٹ کر لیتا اور ان سے تھوڑے بہت پیسے بھی بٹور لیتا۔ بعض فلمساز ایکسٹرا لڑکیوں کو جنسی تعلقات قائم کرنے کے عوض فلم میں رول دیتے اور اس کو باور کراتے کہ ہو سکتا ہے مستقبل میں وہ بھی ہیروئن بن جائیں اس دعوے کی سچائی کیلئے وہ متحدہ ہندوستان کی کئی ہیروئنوں کے بارے میں بتاتے کہ وہ شروع میں ایکسٹرا کے رول میں نمودار ہوئیں لیکن اپنی محنت اور فلمساز کی نظر کرم نے ان کو ایکسٹرا کے رول سے اٹھا کر ہیروئن کا رول دیدیا اور وہ کامیاب ہیروئن بن گئیں۔

بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ نگار خانوں میں ایسی لڑکیوں کی ایک خاصی بڑی تعداد جمع ہونے لگی جو فلمی ہیروئن بننے کیلئے گھروں سے بھاگی ہوئی تھی یا ان کے آشنا انہیں اغواء کر کے لاہور لے آئے تھے جہاں انہوں نے بے روزگاری سے تنگ آکر نگار خانوں کا رخ کیا اور یہاں پر کام تلاش کرنے لگے۔ ایکسٹرا اداکار یا اداکارہ کیلئے کوئی خاص معیار نہیں۔ اس رول کے خواہشمند کیلئے خوبصورت اور جاذب نظر ہونا بھی ضروری نہیں، نہ ہی اس کیلئے کسی روایتی تعلیم کی ضرورت ہے بس ایک جسم کی ضرورت پڑتی ہے جو گانے کی سچویشن یا سین کی ڈیمانڈ کے مطابق حرکت کرتا ہے۔

ایکسٹرا اداکار کیلئے معاوضے کا کوئی تصور نہیں، یہ فلمساز کی صوابدید ہے کہ اگر اس کی فلم ہٹ ہو گئی اور اس نے خاطر خواہ منافع کمایا تو وہ اس میں سے تھوڑی سی رقم ایکسٹرا اداکاروں کو بھی دیدے گا اور اگر فلم نے کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کی تو پھر ایکسٹرا اداکار کو کسی معاوضے یا شاباش کی کوئی توقع نہیں رکھنی چاہئے۔ ایک سینئر اداکار نے بتایا کہ 80ء تک تینوں سٹوڈیوز میں دو درجن سے زائد ایکسٹرا اداکارائیں نہ تھیں۔ یہ عورتیں زیادہ تر بازار حسن سے تعلق رکھنے والی تھیں اور یہ دن کو فلموں کی شوٹنگز میں محض اس خیال کے ساتھ حصہ لیتیں کہ شاید ان کی قسمت چمک اٹھے اور وہ ہیروئن کا رول ...

اہم رول حاصل کرلیں لیکن اکثر ایسا نہ ہوتا بلکہ یہ عورتیں ایکسٹرا کرداروں کیلئے کام کرتیں اور ایکسٹرا لڑکوں اور دیگر کاریگروں اور ہنر مندوں کو اپنا جسم فروخت کرتیں۔ رات کو دوبارہ یہ ہیرا منڈی میں جسم بیچتیں۔ مذکورہ اداکار کے بقول فلم، ٹیلی ویژن میں جتنا اہم ہیرو یا ہیروئن ہوتی ہے اتنا ہی غیر اہم ایکسٹرا اداکار ہوتا ہے۔ فلم کے شعبہ کے متعلقہ تمام لوگ ان کو فالتو اور ناکارہ تصور کر کے ان کے ساتھ برملا نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔ بعض ایسے ایکسٹرا اداکار اور اداکارائیں بھی تھیں جو سارا دن شوٹنگ کراتی رہتیں اور ان کا معاوضہ محض دو وقت کی روٹی تھی جو فلمساز ان کو دیتا تھا۔ ایکسٹرا اداکار محض اس لئے فاضل کردار ادا کرنے کو تیار ہو جاتے تھے کہ فلم میں ان کا چہرہ بھی چند لمحے کیلئے دکھائی دے گا۔

80ء کے عشرے کے وسط میں نگار خانوں میں ایکسٹرا اداکاروں اور اداکاراؤں کی تعداد بڑھنے لگی۔ اس کی بڑی وجہ اردو، پنجابی اور پشتو فلموں کی تعداد میں اضافہ کے ساتھ ساتھ ذرائع ابلاغ پر ہندوستانی فلموں کی یلغار تھی۔ ہر روز نئی بھارتی فلمیں سمگل ہو کر پاکستان آنے اور ویڈیو کے ذریعے اپنے ناظرین میں اضافہ کرنے لگیں۔ ادھر پاکستان میں بھی فلمی صنعت میں تیزی کا رجحان آیا اور دھڑا دھڑ رنگین فلمیں بنائی جانے لگیں۔ ایک ہدایتکار نے مجھے بتایا کہ 85ء کے بعد نگار خانوں میں اداکار اور اداکارہ بننے کے خواہشمند لڑکے اور لڑکیوں کی بڑی تعداد آنے لگی۔ ان میں بعض شریف گھرانوں کے لڑکے اور لڑکیاں بھی تھیں جو گھر والوں کی مرضی کے خلاف گھر سے بھاگ کر لاہور آئے اور اداکاری کا شوق ان کو نگار خانوں میں لے آیا۔ جیسے طوائف کے کوٹھے پر جا کر ایک شریف اور معزز گھرانے کا نوجوان تباہی و بربادی کے راستے پر گامزن ہو جاتا ہے اور اس کی باعزت واپسی کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں اسی طرح نگار خانوں کا رخ کرنے والے لڑکے اور لڑکیاں بھی اپنی واپسی کے تمام دروازے بند کر دیتے ہیں اور اکثر کسمپرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ 85ء کے بعد شریف اور کھاتے پیتے گھرانوں سے درجنوں لڑکے لڑکیاں نگار خانوں میں آئے۔ شروع میں چونکہ ان کے پاس پیسے ہوتے تھے اس لئے گھاگ قسم کے فلمساز اور کہانی نویس ان کی بہت آؤ بھگت کرتے، ان کو یقین دلاتے کہ اگر وہ فلم میں آجائیں تو وہ

دلیپ کمار، راج کپور اور نرگس وغیرہ کو مات دیدیں گے، جیسے خدوخال اور مکالموں کی ادائیگی کا ہنر ان کے پاس ہے وہ برصغیر کے کسی اداکار کو نصیب نہیں ہو سکا۔ یہ باتیں ان بھگوڑے لڑکوں اور لڑکیوں کا حوصلہ بڑھاتیں اور وہ جی کھول کر خرچ کرتے جب کچھ عرصہ بعد ان کی جیبیں خالی ہو جاتیں تو فلمساز اور کہانی نویس جو ہر وقت ان کی تعریفیں کیا کرتے تھے انہیں یکسر نظر انداز کر دیتے اور کسی نئے شکار کی تلاش میں نکل پڑتے۔ تمام رقم ختم ہو جانے کے بعد "متوقع" ہیرو یا ہیروئن کو ہوش آتا تو بہت دیر ہو چکی ہوتی۔ اس کا اولین فیصلہ نگار خانے کو مسکن بنانے کے متعلق ہوتا، یا پھر کچھ نوجوان آوارہ اور جرائم پیشہ لوگوں میں شامل ہو جاتے۔

اکثر لڑکے اور لڑکیاں ایکسٹرا رول کیلئے نگار خانوں میں ہی قسمت آزمائی کا فیصلہ کرتے، یوں ان کا تعلق نگار خانوں کے ساتھ بڑھ جاتا اور اکثر نگار خانوں میں ہی رہائش بھی اختیار کر لیتے۔ چونکہ ایکسٹرا رول کرنے والوں کو عموماً معاوضہ نہیں دیا جاتا تھا اس لئے انہیں گزر بسر کرنے کیلئے یا تو شوٹنگ دیکھنے کیلئے آنے والوں کی جیب تراشی کیلئے یا تاڑ کی خدمات حاصل کرنا پڑتیں یا پھر وہ جسم فروشی کی طرف مائل ہو جاتے۔ اول تو ایکسٹرا لڑکیوں کو فلم میں رول لینے کیلئے فلمساز، ہدایتکار، کہانی نویس یا کسی ہنر مند کو جسم پیش کرنا پڑتا اور پھر کام ملتا۔ اس صورت میں جسم پیش کرنے کے دھندے کو بطور پیشہ اپنانے کیلئے کسی خاص محنت کی ضرورت نہ تھی اس لئے تقریباً تمام ایکسٹرا لڑکیاں جسم فروشی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئیں۔ شوٹنگز دیکھنے والوں کی اکثریت نگار خانوں کے ماحول اور ان کے باسیوں میں ایک کشش محسوس کرتی تھی اس لئے وہ بہت جلد ایکسٹرا لڑکیوں کے جال میں پھنس جاتے اور تھوڑا سا معاوضہ دیکر اپنی تسکین کرنے لگتے۔

میرے بہت زیادہ اصرار اور ایک معروف فلمساز کی سفارش پر ایک معروف ایکسٹرا اداکارہ، جس کی عمر تقریباً چالیس سال تھی، نے بتایا کہ اس کا تعلق فیصل آباد کے ایک زمیندار گھرانے سے ہے۔ وہ میٹرک کی طالبہ تھی کہ اس کی گاؤں کے ایک زمیندار کے بیٹے کے ساتھ دوستی ہو گئی۔ دونوں خاندانوں کو جب معلوم ہوا تو پورے گاؤں کی صورتحال کشیدہ ہو گئی اور ایک خونریز لڑائی میں اطراف کے تین افراد مارے گئے۔ مقدمات عدالتوں میں چلے گئے اور کشیدگی تھوڑی کم ہوئی تو وہ اپنے آشنا کے ساتھ

کراچی بھاگ گئی۔ گھر والوں نے بہت تلاش کیا لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ دونوں کو ان کے والدین نے عاق کر دیا اور چونکہ گھر سے فرار کے وقت وہ بہت سارا پیسہ اور زیور گھر سے لیکر بھاگے تھے اس لئے ان کی کراچی میں اچھی گزر بسر ہونے لگی جب ان کی دولت کم ہوئی تو وہ لاہور آگئے۔ اسی اثناء میں ان کے ہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ اس کا خاوند نشہ کرنے لگا اور تیزی کے ساتھ ساری دولت ختم ہو گئی۔ ان کے ایک مشترکہ دوست نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ نگار خانے جائیں اور فلموں میں کام حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ اس کا خاوند اسے لیکر شاہ نور سٹوڈیو ملتان روڈ پر آگیا اور اس نے مختلف فلمسازوں اور مصنفوں سے ملنے کی کوشش کی لیکن اس کو کنگال جان کر کسی نے بھی گھاس نہ ڈالی۔ ان کے دوست نے مشورہ دیا کہ شروع میں ایکسٹرا کا رول بھی مل جائے تو کر لیا جائے۔ اس خاتون نے مزید بتایا کہ ایکسٹرا کا رول حاصل کرنے کیلئے بھی اس نے اپنا زیور بیچ کر 5000 روپیہ فلمساز کو دیا تو اس کو چند منٹ کیلئے نوکرانی کا رول دیا گیا۔ فلم جب ریلیز ہوئی تو اس کو امید تھی کہ اب بغیر پیسہ ادا کئے بھی فلمساز اس کو کاسٹ کریں گے لیکن کسی نے اس کو نہ پوچھا۔ آہستہ آہستہ نوبت فاقوں تک پہنچ گئی اور ایک دن اس کا خاوند بچی لیکر غائب ہو گیا اس کے بعد وہ کبھی نظر نہیں آیا اور یہ عورت نگار خانے سے باہر قدم نہیں رکھ سکی۔ اس کو یقین ہے کہ اول تو اس کا خاوند اب اس کو نہیں ملے گا اور اگر ملنے کی کوئی موہوم سی امید نظر آتی ہے تو پھر وہ اس کو نگار خانے ہی میں ملے گا۔ خاوند کے چھوڑ جانے کے بعد اس نے باقاعدہ جسم فروشی کا دھندہ شروع کیا اور زندگی گزارنے لگی۔ اس کو یقین ہے کہ نگار خانوں میں کوئی کسی کے ساتھ مخلص نہیں اور نہ ہی کوئی کسی کے ساتھ سچ بولتا ہے۔ وہ نگار خانے کو جھوٹ اور دھوکے کا کارخانہ قرار دیتی ہے۔ اس نے مزید بتایا: "یہاں کوئی کسی کا دوست نہیں، بھائی نہیں، رشتہ دار نہیں، حتیٰ کہ کسی بیوی کا کوئی خاوند بھی نہیں، اگر کوئی پیار کرنے کا ڈھونگ رچاتا ہے تو اس کی وجہ عورت کا جسم اور اس کے جسم سے وابستہ دولت ہو سکتی ہے۔" یہ عورت اب پیشہ کرتی ہے اور جب سے اس کی مزدوری میں سختی اور بے دردی کا عنصر شامل ہوا ہے اس نے نشہ کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ چرس پیتی ہے اور کبھی کبھار اس کا کوئی گاہک اس کو شراب بھی پلا دیتا ہے لیکن وہ شراب نہیں خرید سکتی۔ اس نے کہا:

"مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میرا گاؤں کون سا ہے اور اس وقت میرے گھر والے ایک ہشاش بشاش زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کو معلوم ہے کہ ان کی بیٹی شاہ نور اسٹوڈیو میں کن حالات میں ہے لیکن وہ میرا نام بھی نہیں سننا چاہتے میرے شوہر کے خاندان والے بھی ہمارے انجام کے بارے میں باخبر ہیں لیکن وہ مجھے کسی قیمت پر بھی قبول کرنے کو تیار نہیں ان کو یہ بھی معلوم ہے کہ ان کا بیٹا مجھے چھوڑ چکا ہے اور میں جسم فروشی کا دھندہ کرتی ہوں"۔

مذکورہ واقعہ کی طرح کے لاتعداد واقعات اور داستانوں سے یہ نگار خانے بھرے پڑے ہیں جس کسی کو بھی ٹٹولا جائے وہ ایک داستان لئے بیٹھا ملتا ہے۔ شاید تینوں نگار خانوں میں ایک بھی ایکسٹرا عورت ایسی نہیں جو جسم فروشی کا دھندہ نہ کرتی ہو۔ ایکسٹرا لڑکیوں کیلئے جسم فروشی ایک لازمی پیشہ ہے کیونکہ اس کے علاوہ ان کو کہیں سے کوئی آمدن متوقع نہیں ہوتی۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق اس وقت شاہ نور سٹوڈیو میں 35 سے 40 ایکسٹرا لڑکیاں روزانہ جسم فروشی کا دھندہ کرنے میں مصروف ہیں۔ باری سٹوڈیو میں ان کی تعداد 25 سے زائد ہے جبکہ ایورنیو سٹوڈیو میں ایکسٹرا کردار ادا کرنے والی لڑکیوں کی تعداد 60 کے قریب ہے۔ یہ عورتیں سٹوڈیو کے گردو نواح میں رہائش پذیر ہیں اور سٹوڈیو کے بعد یہ گھروں میں بھی جسم فروشی کا دھندہ کرتی ہیں۔

نگار خانوں کی قریبی آبادی سید پور اس حوالے سے بہت مشہور ہے کہ وہاں سینکڑوں گھروں میں جسم فروشی کا دھندہ ہوتا ہے۔ بعض ایکسٹرا ایسی بھی ہیں جنہوں نے میوزیکل گروپس کے پردے میں جسم فروشی کا دھندہ شروع کر رکھا ہے اور مقامی پولیس کو ماہانہ دے کر وہ اپنا کاروبار چمکائے ہوئے ہیں۔ ایک مقامی باشندے کے مطابق: "اس وقت صرف سید پور کی آبادی میں 30 سے زیادہ گھر ایسے ہیں جہاں جسم فروشی کا دھندہ ہوتا ہے اور پولیس سمیت ہر ایک کو معلوم ہے کہ ان گھروں میں کیا ہو رہا ہے لیکن آج تک یہ کاروبار مکمل تحفظ اور سکون کے ماحول میں جاری و ساری ہے ان گھروں کے مکین دن کو شاہ نور وغیرہ چلے جاتے ہیں اور رات کو ان کے گاہک یہاں پہنچ جاتے ہیں بعض گھروں میں تو آٹھ دس تک لڑکیاں رہائش پذیر ہیں جو دھندہ کرتی ہیں"۔

نگار خانوں میں کام کرنے والی خواتین نے عموماً قریبی آبادیوں میں رہائش اختیار کر رکھی ہے کیونکہ شوٹنگز عموماً شام کے وقت اور رات کو کی جاتی ہیں اس لئے ان مقامات کے قریب رہائش ایک مجبوری کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔ ایک ایکسٹرا اداکارہ نے بتایا کہ وہ رات دیر تک شوٹنگز میں مصروف رہتی ہے اور اگر اس کو سٹوڈیو سے چھ سات میل دور جانا پڑے تو وہ اگلے روز کام پر نہیں آ سکتی اس لئے اس کو قریب رہائش اختیار کرنا پڑتی ہے۔ اصل میں سٹوڈیو ایک طرح سے شکار پھنسانے کی جگہ ہے جہاں پیشہ ور عورتیں آنے والے لوگوں میں سے اپنا شکار منتخب کرتی ہیں یا پھر تماش بین ان عورتوں میں سے اپنی پسند کی عورت تلاش کرتے ہیں۔ اصل پیشہ ان کو گھر میں ہی کرنا پڑتا ہے۔ ایک مرتبہ جو ان کا گاہک بن گیا دوبارہ وہ ان کے گھر پر ہی آئے گا اور یہیں پر اس کو "مال" ملے گا۔ اس لئے ان عورتوں کی رہائشی بستیاں اصل میں جسم فروشی کے اڈے ہیں۔

یہ بہت کم دیکھنے میں آیا ہے کہ ایکسٹرا رول ادا کرنے والی کوئی عورت گھر سے محض یہ کام کرنے نکلی اور وہ صرف ایکسٹرا رول کر کے مطمئن ہے اور اس کو جو معاوضہ ملتا ہے اس میں اس کا خاندان مطمئن ہے۔ تینوں سٹوڈیوز میں کوئی ایک بھی عورت ایسی نہیں جو یہ دعویٰ کر سکے کہ وہ فلموں میں ایکسٹرا رول ادا کرنے کی خواہشمند تھی، اس رول سے اس کی خواہش پوری ہو گئی اور یہ کام اس کو اتنا پیسہ دیتا ہے کہ وہ کوئی دوسرا کام نہیں کرنا چاہتی اور آج تک اس نے اپنا جسم کسی کو پیش نہیں کیا۔ اگر کوئی عورت ایسا دعویٰ کرتی ہے تو وہ سراسر جھوٹ بولتی ہے اور اگر وہ جسم فروشی سے انکار کرتی ہے تو وہ سٹوڈیوز میں نشہ فروخت کرنے والے گروہوں سے وابستہ ہو گی اور اس کام سے ملنے والا معاوضہ یقیناً جسم فروشی کے بعد حاصل ہونے والے معاوضے سے بہتر ہو گا۔ اس لئے وہ جسم فروشی جیسے تکلیف دہ اور اذیت ناک کام کی طرف متوجہ نہ ہوئی لیکن کوئی عورت یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ وہ ایکسٹرا ہے اور جسم فروشی نہیں کرتی۔ ایکسٹرا اور جسم فروشی کے باہمی تعلق کے لازم و ملزوم ہونے کی کیفیت کا یہ عالم ہے کہ سٹوڈیوز کی زندگی سے واقف کوئی شخص ایکسٹرا اور جسم فروشی میں فرق ظاہر نہیں کر سکتا۔ اس کو معلوم ہے کہ جسم فروشی کیلئے ایکسٹرا کا رول ایک آڑ ہے اور ایکسٹرا رول کیلئے جسم فروشی ناگزیر ہے۔

70 فیصد ایسی عورتیں یہاں ایکسٹرا رول کرتی ہیں جن کے ماضی میں کوئی نہیں

جھانکتا۔ جبکہ تیس فیصد ایسی عورتیں ہیں جن کے والدین کا تعلق بھی اسی پیشے سے تھا اور لوگوں کو ان کے ماضی کے بارے میں معلومات حاصل ہیں۔ اول الذکر 70 فیصد خواتین میں سے اکثریت ان عورتوں کی ہے جو اداکاری کے شوق میں اپنے گھروں سے بھاگ آئیں۔ گھر سے بھاگتے وقت انہوں نے متعدد بار کوشش کی کہ ان کے ساتھ ان کے آشنا ہوں اس صورت میں ان دونوں نے اپنے اپنے گھروں میں چوریاں کیں اور نقدی سمیت زیورات وغیرہ بھی ساتھ لے آئے۔ کچھ عورتیں ایسی بھی ہیں جن کو ان کے گھروں سے بھگانے والی دوسری عورتیں تھیں۔ ایسی عورتیں عموماً بیوائیں، طلاق یافتہ یا پھر کسی وجہ سے کنواری رہ جانے والی ہوتی ہیں۔ ان کو دوسری عورتیں بہلا پھسلا کر شہروں کی طرف لے آتی ہیں جبکہ چند عورتیں ایسی بھی مل جاتی ہیں جو فلموں وغیرہ سے متاثر ہو کر اور گھر کے سخت ماحول سے متنفر ہو کر اگلی زندگی کو انتہائی آسان اور بہتر سمجھتے ہوئے گھر چھوڑنے پر تیار ہو گئیں۔ چونکہ ان کے دل میں فلموں کے ذریعے شہرت اور دولت حاصل کرنے کی خواہش تھی اس لئے ان کا آخری مسکن نگار خانہ ہی تھا۔ نگار خانے میں انہیں فوری طور پر قبول کر لیا جاتا ہے کیونکہ اکیلی عورت اور محض خواہشات اور خوش گمانیوں کے نیچے دبی ہوئی عورت کو استعمال کرنا ایک انتہائی آسان کام ہوتا ہے۔ ایسی عورتیں اپنے پسندیدہ اداکار یا ہدایتکار کے دفتر میں پہنچتی ہیں جہاں عموماً ان کو ان کی مطلوبہ شخصیت نہیں ملتی اور وہاں موجود پیشہ ور لوگ ان کو ملاقات کروانے کا جھانسہ دیکر اپنے دام میں پھنسا لیتے ہیں۔ اکثر عورتوں کے ساتھ مذکورہ افراد جنسی زیادتی کرتے ہیں اور عموماً ان کے پاس موجود رقم اور زیور وغیرہ بھی چھین لیتے ہیں۔ سب کچھ چھن جانے کے بعد ان کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں بچتا کہ یا تو وہ خودکشی کر لیں یا پھر یہیں پڑ کر حالات کا مقابلہ کریں چونکہ اپنے گھروں کو واپس جانا ان کیلئے نہ صرف خطرناک ہوتا ہے بلکہ ان کی عزت میں بھی کمی آنے کا موجب ہوتا ہے اس لئے ایسی عورتیں عموماً واپسی کا دروازہ بند کر دیتی ہیں اور خود کو پیشہ ور لوگوں اور حالات کے سپرد کر دیتی ہیں۔

نجمہ نامی ایک ایکسٹرا اداکارہ نے بتایا: ”میں سندھ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئی۔ میرا والد ایک چھوٹا زمیندار تھا اور ہم پانچ بہن بھائی ہنسی خوشی اس گوٹھ میں رہ رہے تھے۔ میں سب بہن بھائیوں میں بڑی تھی۔ میرا والد سارا دن کھیتوں میں کام کرتا جبکہ

میں اور میری ماں بھی اس کام میں والد کا ہاتھ بٹاتیں۔ میرے ایک ماموں سعودی عرب میں کام کرتے تھے اور انہیں ہمارے ساتھ بہت پیار تھا۔ ماموں ہمارے لئے ایک وی سی آر اور ٹیلی ویژن لیکر آئے تھے۔ پوری گوٹھ میں صرف ہمارا گھر ایسا تھا جہاں وی سی آر اور ٹیلی ویژن تھا۔ میں سارا سارا دن بھارتی فلمیں دیکھنے لگی۔ مجھے اداکار بہت اچھے لگتے اور فلموں میں ان کا کام بہت پسند آتا۔ اسی اثناء میں میری دوستی گاؤں کے ایک لڑکے سے ساتھ ہوگئی۔ وہ مجھے شہر سے فلمیں لاکر دیتا اور دن کو جب میری ماں اور باپ کھیتوں میں چلے جاتے تو میں اور وہ لڑکا دونوں فلمیں دیکھتے اور اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں منصوبے بناتے۔ ہماری دوستی کے بارے میں لوگوں نے باتیں کرنا شروع کردیں تو لڑکے کے والدین نے میرے باپ سے میرا رشتہ مانگ لیا۔ میرے باپ نے صاف انکار کردیا اور میری شادی اگلے روز اپنے ایک بھتیجے سے کردی۔ نہ مجھے جہیز دیا گیا اور نہ کوئی بارات آئی لڑکے والے تین چار افراد کے ہمراہ انتہائی سادگی سے ہمارے گھر آئے اور نکاح کے بعد مجھے ساتھ لے گئے۔ ان کا گھر ہمارے گھر سے بالکل قریب تھا۔ میں نے بہت شور مچایا لیکن والد نے مجھ پر تشدد کیا اور جان سے مار دینے کی دھمکی دیکر چپ کرادیا"۔ نجمہ نے مزید بتایا: "میرے خاوند نے بھی میرے ساتھ بہت برا سلوک کیا اور مجھ پر بدکردار ہونے کا الزام لگادیا۔ اس نے صاف الفاظ میں مجھے کہا کہ اب تیری لاش ہی اس گھر سے باہر جائے گی اور اگر میں نے ان کی بات نہ مانی تو وہ مجھے زنجیروں سے باندھ دیں گے۔ میں نے اپنے دوست سے رابطہ کیا اور ایک رات ہم دونوں وہاں سے فرار ہوگئے۔ مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ ہمارے فرار کے بعد ہمارے خاندانوں میں جو جھگڑا ہوا اس میں میرا خاوند اور باپ قتل ہوگئے جبکہ میرے دوست کے باپ اور بھائیوں کو پولیس پکڑ کر لے گئی۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس وقت کیا صورتحال ہے۔ میں اور میرا دوست شاہ نور سٹوڈیو پہنچے اور یہاں کام کی تلاش شروع کردی۔ جب تک ہمارے پاس پیسے تھے ہم آسانی کے ساتھ گزارہ کرتے رہے۔ جب پیسے ختم ہوگئے تو فلموں میں ایکسٹرا رول کرنے لگے۔ اس کام کے پیسے اول تو ملتے ہی نہیں تھے اور اگر کوئی فلمساز پیسے دینے کی حامی بھرتا تو وہ کئی ماہ کے بعد وعدے سے بھی بہت کم پیسے دیتا۔ ہم دونوں نے یہاں ایک مولوی صاحب کو 1000 روپیہ دیکر نکاح کرلیا اور سید پور میں ایک کمرہ کرائے پر لیکر رہنے لگے۔ ہمارا سارا

دن سٹوڈیوز میں گزرتا۔ ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ میرے خاوند نے نشہ شروع کر دیا ہے۔ میں نے اس کو منع کیا تو اس نے مجھے بہت زیادہ تشدد کا نشانہ بنایا۔ جیسے ہی اس نے نشہ شروع کیا گھر میں فاقوں کی نوبت آگئی۔ ہمارے ہاں کوئی اولاد نہ تھی اس لئے ہمارے اخراجات بہت کم تھے اور فکر بھی زیادہ نہ تھی۔ جب اس کا نشہ بڑھتا گیا تو ہمارے تعلقات کشیدہ ہونے لگے۔ ایک دن اس نے دھوکے سے مجھے کوئی نشہ آور چیز پلائی اور دو غیر مردوں کو گھر لے آیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے محسوس کیا کہ بے ہوشی میں میرے ساتھ زیادتی کی گئی ہے۔ میں نے بہت شور مچایا اور اس سے ناراض ہو کر سٹوڈیو آگئی۔ یہاں..... صاحب نے مجھے رات کو اپنے دفتر میں سونے کی اجازت دیدی۔ دو دن کے بعد میرے اس محسن نے بھی تقریباً زبردستی میرے ساتھ جنسی زیادتی کی۔ میں خاموش رہی کیونکہ اس دفتر کے علاوہ میرے پاس کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ انہوں نے مجھے ایک فلم میں ایک معمولی کردار بھی لے دیا جس کا معاوضہ فلمساز نے 500 روپے دیا۔ مذکورہ شخص روزانہ میرے ساتھ ہم بستری کرنے لگا اور میں نے احتجاج کرنا چھوڑ دیا۔ ایک ماہ کے بعد اس نے مجھے اپنے دفتر سے نکال دیا اور مجھ پر جسم فروشی کا الزام لگایا۔ میں دوبارہ اپنے خاوند کے پاس گئی تو اس نے کھلے دل کے ساتھ مجھے قبول کر لیا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ جسم فروشی کے کام کو مستقل اپنا لیا جائے، میں نے باقاعدہ جسم فروشی اختیار کر لی اور میرا خاوند میرے لئے گاہک تلاش کر کے لانے لگا۔ تین سال تک میں نے باقاعدہ جسم فروشی کی ہے اور ساتھ ہی نشہ بھی کرنے لگی ہوں۔ پچھلے سال میرا خاوند ایک حادثے میں ہلاک ہو گیا تو میں بالکل اکیلی رہ گئی۔ میں نے سید پور والا مکان چھوڑ دیا اور اب چوبیس گھنٹے باری سٹوڈیو میں رہتی ہوں۔ میرے ساتھ ایک اور لڑکی ہے جو سیالکوٹ سے بھاگ کر آئی ہے وہ بھی جسم فروشی کا دھندہ کرتی ہے اور ہم دونوں اپنے دھندہ سے خوش ہیں"۔

یہ تو تھی نجمہ نامی اس عورت کی داستان جو سندھ سے تعلق رکھتی ہے اور فلموں میں کام کرنے کا شوق اس کو اس حال تک لے آیا ہے۔ بہت کم ایسا ہوا ہے کہ اس طرح گمراہ ہونے والی کسی لڑکی کو یہاں کسی شخص نے سہارا دیا ہو اور اس کو اصل زندگی کی طرف واپس موڑ دیا ہو۔ نہ کوئی ادارہ ایسا ہے جو بھٹکی ہوئی عورتوں [illegible] مرلا کر

معاشرے میں ان کی باعزت واپسی کا بندوبست کرے۔ اس کے برعکس ایسا ضرور کئی بار ہوا ہے کہ گھر سے بھاگی ہوئی کسی لڑکی کو اس کے حالات جاننے کے بعد لوگ اپنے گھروں میں لے گئے اور ان سے برائے نام معاوضہ پر گھروں میں کام کرواتے رہے اور ساتھ ہی جسمانی کام بھی لیتے رہے۔ جب ان کی افادیت ختم ہوگئی تو ان کو گھروں سے نکال دیا۔ اس کے بعد ان کی قسمت کہ کون ان کو سہارا دیتا ہے اور ان کی بقیہ زندگی کس طرح گزرتی ہے۔

ایک بڑا فلمساز اور ہدایتکار نام ظاہر نہ کرنے کی شرط پر اس موضوع پر اپنے خیالات بتانے پر تیار ہوا۔ اس کے بقول: "یہ دنیا بہت ظالم ہے، فلموں کے ماحول میں کوئی کسی کا دوست نہیں ہوتا۔ ہر کوئی دھوکے بازی کیلئے تیار رہتا ہے اور جائز و ناجائز طریقے سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ زیادتی کے اس اجتماعی ماحول میں سب سے زیادہ ظلم ایکسٹرا رول کرنے والی لڑکیوں اور لڑکوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان کی کوئی باقاعدہ تنظیم بھی نہیں ہوتی جو ان کے مفادات کا تحفظ کر سکے اور نہ ہی ان میں کوئی اتحاد ہوتا ہے اس لئے ان کے ساتھ ہر کوئی زیادتی کر لیتا ہے۔ فلمساز ایکسٹرا رول کیلئے سفارش پر لوگ بھرتی کرتے ہیں کیونکہ لاتعداد لوگ ایکسٹرا رول کیلئے بلا معاوضہ اپنی خدمات فراہم کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ اس لئے اس پیشے کو اپنانے والے لوگوں کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔ جب آپ کو بازار میں مفت کام کرنے والے بڑی تعداد میں مل جائیں تو وہی کام معاوضہ لیکر کرنے والوں کو کون پوچھے گا۔ میں یہ بات مانتا ہوں کہ یہ ٹیکنیکل کام ہے اور تجربہ کار لوگ ہی بہتر طریقے سے یہ کام کر سکتے ہیں اور اگر ان کو صحیح معاوضہ دیا جائے تو یہ لوگ لگن کے ساتھ کام کرلیں گے اور فلموں کے معیار میں بھی مثبت فرق پڑے گا لیکن ہمارے فلمساز اس حوالے سے سوچتے نہیں۔ وہ گھٹیا معیار پر مفت کام کرنے والوں کو ترجیح دیتے ہیں اسی لئے ہمارے ہاں کوئی معیاری فلم نہیں بنتی۔ اس صورت میں ایکسٹرا اداکار کے طور پر کام کرنے والے بے روزگاری کا شکار ہو جاتے ہیں، پھر وہ اپنا اور اپنے خاندان کا پیٹ پالنے کیلئے جسم فروشی کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے اردگرد جتنی بھی ایکسٹرا عورتیں ہیں وہ اپنا جسم بیچ کر زندگی کے دن پورے کر رہی ہیں۔ ان کی دیکھ بھال یا فلاح کیلئے کوئی کچھ نہیں کرنا چاہتا اور نہ ہی کوئی ادارہ ایسا ہے جو ان مظلوموں کی مدد کرے۔ حکومت کی طرف سے بھی ان لوگوں کیلئے کچھ نہیں کیا جاتا اور

یوں یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے"

اس فلمساز کے پاس اس بحران کا واحد حل یہ ہے کہ فلمساز ایکسٹرا رول کرنے والوں کو بہتر معاوضہ دیں اور جن لوگوں نے اس کام کو ایک پیشے کے طور پر اپنا رکھا ہے انہیں ہی کام دیا جائے اور بروقت معاوضہ ادا کر کے ان کو بھی عام زندگی گزارنے کا موقع دیا جائے۔ اس فلمساز کے بقول اگر ایسا کر لیا جائے تو وہ عورتیں جو جسم بیچتی ہیں، جسم فروشی ترک کر دیں گی اور سٹوڈیوز کا ماحول بہتر ہو جائے گا۔ انہوں نے مزید کہا کہ وہ جسم فروشی اس لئے ترک کر دیں گی کہ ان کو جو معاوضہ فلمساز ادا کریں گے وہ جسم فروشی کے عوض ملنے والے معاوضے سے یقیناً زیادہ ہوگا کیونکہ ان عورتوں کے گاہک عموماً غریب ہوتے ہیں جو زیادہ معاوضہ نہیں دے سکتے اور یہ جسم فروشی کر کے بھی فاقوں مرتی رہتی ہیں"۔

مذکورہ تجویز میں ایک سادہ سی بات یہ ہے کہ اگر فلمساز ایکسٹرا کردار کرنے والیوں کے معاوضے بڑھا دیں اور ادائیگی بروقت کریں تو وہ جسم فروشی ترک کر دیں گی لیکن ایسا ہونا ممکن نہیں کیونکہ پاکستان میں فلمسازی کا شعبہ وہ ترقی حاصل نہیں کر سکا جو دوسرے ممالک میں اس کو حاصل ہوئی ہے۔ اس صورت میں یہ شعبہ جبکہ خود خسارے کا شکار ہے ایسے لوگوں کو بہتر اور بروقت ادائیگی کیسے، کرے گا جن کو ادائیگی کرنے کا یہ عادی نہیں۔ یہ ایک معصومانہ امید ہے جو محض باندھی جا سکتی ہے۔ ایسا ہوتا نظر نہیں آتا۔ سٹوڈیوز میں جسم فروش عورتوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے کیونکہ اجتماعی معاشی بدحالی نے ایسی عورتوں کو بھی گھروں سے نکلنے پر مجبور کر دیا ہے جو عام حالات میں گھر نہیں چھوڑ سکتی تھیں۔ تعداد بڑھ جانے کی صورت میں اس پیشے کی طرف رجحان مزید بڑھے گا اور اس کے انسداد کا کوئی بندوبست نہ ہونے کے باعث کوئی بھی اس کو بڑھنے سے نہیں روک سکتا۔

نہایت کم معاوضوں اور اکثر اوقات ان سے بھی محرومی کے باعث ان فاضل اداکاروں کی حالت بہت خراب ہے۔ جب انہیں فلموں میں کام نہیں ملتا تو پھر ایکسٹرا عورتیں جسم فروشی پر مکمل انحصار شروع کر دیتی ہیں۔ ایکسٹرا مرد حضرات جو کہ مشترک کام کی وجہ سے ان کیلئے عام لوگوں کی نسبت زیادہ قابل اعتماد ہوتے ہیں، دلالی کا شعبہ اپنے

لئے منتخب کرتے ہیں۔ ہر عورت کا ریٹ اس کی عمر اور خوبصورتی کے لحاظ سے طے پاتا ہے اور اگر اس کی ظاہری شکل و شباہت پرکشش نہ ہو تو پھر نہ صرف اس کو انتہائی کم معاوضے پر انحصار کرنا پڑتا ہے بلکہ اکثر اوقات ایسے گاہکوں کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے جو انہیں مختصر کھانے پینے کی اشیاء فراہم کرنے کے عوض ان کے جسموں سے حظ اٹھاتے ہیں۔ ان کے علاوہ فلمسازوں کے دوست اور دیگر ہنر مند بھی ان کی مجبوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کے جسموں سے کھیلتے رہتے ہیں۔

ایک 45 سالہ ایکسٹرا "بولی" نے بتایا: "یہاں پر ہر چیز بعلی اور نقلی ہے، ہر آدمی جھوٹ کے سہارے زندہ رہتا ہے۔ ایک وقت تھا کہ اکثر فلمساز مجھے اچھا رول دینے کی پیشکش کرتے اور ساتھ ہی میرے جسم کے خواہشمند ہوتے جب وہ جسم حاصل کر لیتے تو پھر آنکھیں چراتے پھرتے یا بہت کم معاوضہ کی پیشکش کرتے۔ اب یہ صورتحال ہے کہ کئی فلمساز اور ان کے کارندے ایکسٹرا رول دینے کے بہانے جسم کی خواہش کرتے ہیں اور معاوضہ نہیں دیتے۔ میں نے تو اپنی پوری زندگی اس جہنم میں گزار دی ہے اور دوسری عورتوں کو یہی کہتی ہوں کہ وہ اس شعبے میں نہ آئیں لیکن یہاں ہر کوئی قسمت آزمانا چاہتا ہے چاہے اسے اس کی کتنی ہی بڑی قیمت کیوں نہ ادا کرنی پڑے۔ ہر نئی لڑکی اپنے آپ کو ہیروئن خیال کرتی ہے اور کام دلانے والے اس کا جسم نوچتے پھرتے ہیں۔ دو تین برسوں میں ہیروئن بننے کا خیال تو ختم ہو جاتا ہے لیکن اس ماحول کی ایسی عادت پڑ جاتی ہے کہ کوئی بھی یہاں سے جانے کو تیار نہیں ہوتا۔ آخر کار ان کا جنازہ ہی یہاں سے اٹھتا ہے اور جن لوگوں نے ان کو زندگی بھر استعمال کیا ہوتا ہے وہ کفن کیلئے چندہ دینے کو بھی تیار نہیں ہوتے۔ یہ انجام ہر کوئی جانتا ہے لیکن پھر بھی ہر چیز داؤ پر لگا کر ہر صورت میں یہاں آنا چاہتا ہے"۔

بولی چونکہ ایف اے پاس ہے اور اس کو پڑھنے کا شوق ہے اس لئے دیگر ایکسٹرا لڑکیوں کی نسبت اس کو ذرا بہتر کام مل جاتا ہے لیکن پھر بھی اس کو جسم پیش کئے بغیر معاوضہ نہیں ملتا اور اگر یہ جسم فروشی ترک کر دے تو پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ فاقوں مر جائے۔ فلم انڈسٹری سے تعلق رکھنے والا کوئی بھی فرد ان کی بات کو غور سے نہیں سننا چاہتا کیونکہ اس کی نظر میں ان لوگوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ نہ ان کو اداکاری جیسا ہنر آتا

ہے۔ نہ ان کے پاس پیسہ ہے اور نہ ہی ان کے پاس حسن و خوبصورتی نام کی کوئی چیز ہے چونکہ اسٹوڈیو کے ماحول میں ان کا کوئی تعارف نہیں ہوتا اور لوگ ان کو محض فالتو خیال کرتے ہیں اور ان کے بارے میں عام تاثر یہی ہوتا ہے کہ ان کا ماضی گناہوں سے بھرپور ہے اور ان کا حال بھی جسم فروشی کا دھندہ کر کے آگے بڑھتا ہے، اس لئے ان کو خاطر میں نہ لایا جائے۔

ایکسٹرا کا رول کرنے والوں کا آپس میں اتفاق نہ ہونے کے برابر ہے ان کے روز و شب ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے یا پھر ایک دوسرے کے خلاف دھڑے بندی کرنے میں گزرتے ہیں اور ان کی مجموعی کسمپرسی ان کو ایک دوسرے کے بارے میں زیادہ مشکوک بنا دیتی ہے اس لئے ایک معقول تعداد اور فلموں کیلئے ناگزیر کردار کا حامل ہونے کے باوجود ان کے پاس اپنا کوئی پلیٹ فارم نہیں۔ نہ ان کی کوئی تنظیم یا انجمن ہے جس کے ذریعے یہ اپنے معمولی قسم کے مفادات کا تحفظ کر سکیں۔ اس کی بڑی وجہ ان کا بالکل ناخواندہ ہونا بھی ہے۔ ہر وقت کی مایوسی اور کسمپرسی نے ان کو بہت زیادہ کمزور اعتقاد رکھنے والا بنا دیا ہے۔ ان کو یقین ہے کہ اگر وہ فلموں میں احتجاجاً ایکسٹرا رول کرنے سے انکار کر دیں گے تو فلمساز کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا اور اس کیلئے قطعاً مشکل نہیں کہ وہ چند گھنٹوں میں نئے ایکسٹرا اداکاروں کو اکٹھا کر سکے۔ ان کو معلوم ہے کہ سٹوڈیوز کے باہر ایسے لڑکوں اور لڑکیوں کی ایک پوری قطار منتظر کھڑی ہوتی ہے کہ کب قسمت ان پر مہربان ہوتی ہے اور وہ چند لمحوں کیلئے ہی سہی فلم کی سکرین پر آنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

"جب سے فلم سٹوڈیو بنے ہیں اور فلمیں بننا شروع ہوئی ہیں لوگوں کی ایک بڑی تعداد ہر وقت ایکسٹرا کا رول کرنے کیلئے میسر رہی ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اگر پہلے سے موجود ایکسٹرا اداکار کام کرنے سے انکار کر دیں تو ان کا چھوڑا ہوا خلا پر کرنے میں کوئی دیر لگے۔ اخبار میں تین سو روپے کا ایک اشتہار ہزاروں امیدواروں کو یہاں کھینچ لائے گا۔ بعض لوگ تو ایسے بھی ہیں جو فلموں میں چھوٹا موٹا کام لیکر دینے کے وعدے پر لاکھوں روپیہ کماتے ہیں۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد اپنی جیب سے پیسے دیکر چھوٹا موٹا رول کرنے کو ترستی ہے اس صورت میں اگر یہ ایکسٹرا اداکار کام سے انکار کر دیں گے

تو کوئی فرق نہیں پڑے گا"۔ یہ ایک معروف فلمساز کے خیالات تھے جن کی فلمیں آجکل بہت زیادہ بزنس کر رہی ہیں اور جنہوں نے تقریباً 20 سال پہلے میک اپ اسسٹنٹ کے طور پر شاہ نور اسٹوڈیو میں کام شروع کیا تھا اور پھر اس کی کامیاب حکمت عملی اس کو فلمساز ہوانے میں کامیاب ہو گئی۔ عام لوگوں کا خیال ہے کہ مذکورہ فلمساز دس سال تک جسم فروش اداکاراؤں اور ایکسٹرا لڑکیوں سے پیشہ کراتا رہا اور اس نے اس "کاروبار" سے اتنے پیسے کما لئے کہ آج ایک کامیاب فلمساز بن گیا۔

ہمیشہ ان عورتوں سے "مستفید" ہونے والوں کو ہی فائدہ ہوا ہے اور ان کا جسم ایک آلہ کار کے طور پر استعمال ہوا ہے جس کے نتیجے میں ان سے فیض یاب ہونے والوں کو آسودگی، اپنے حلقوں میں کامیابی اور پیسہ ملا ہے جبکہ ان کے حصے میں، سوائے نفرت، بدنامی اور نظر انداز کئے جانے کے کچھ نہیں آیا۔ لاتعداد عورتیں خطرناک بیماریوں، پے در پے فاقوں اور نامناسب طرز زندگی کے باعث اپنی جان ہار چکی ہیں لیکن ان کے قربان ہو جانے کے بعد بھی ان کا ذکر ایک ملعون اور راندۂ درگاہ کے طور پر ہی آتا ہے اول تو ان کو یاد کرنے والا کوئی نہیں کیونکہ ان کو تو محض استعمال کرنے کیلئے یہاں بھیجا گیا تھا اور اس کے سوا وہ کیا کر سکتی تھیں لہٰذا ان کا بھرپور استعمال ہوا اور آخر وہ اپنے دن پورے کر کے اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گئیں۔ ان کے خاندانوں کا عموماً کچھ پتہ نہیں ہوتا کیونکہ خاندان والے عموماً ان کے وجود ہی سے انکاری ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایسے حالات کا شکار عورتیں بھی اپنے خاندانوں کے بارے میں کچھ نہ بتانے کا عہد کر لیتی ہیں اور دوہرے عذاب میں مبتلا رہتی ہیں۔

جہاں تک ان عورتوں کی نسل آگے بڑھنے کا تعلق ہے تو ایسا عموماً نہیں ہوتا۔ چند ایک عورتیں پیشہ ترک کر کے عام زندگی گذارنے کی کوشش کرتی ہیں لیکن انہیں اولاد جیسی مسلسل دیکھ بھال کی حامل چیز کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ تو اپنی دیکھ بھال میں بھی مکمل طور پر ناکام رہتی ہیں ایسے میں کسی دوسرے وجود کو سنبھالنا ان کو کہاں آتا ہے۔ ایک مرتبہ جو عورت نگار خانوں میں آکر جسم فروشی کے دھندے میں شامل ہو جاتی ہے اس کو آخری سانس تک یہی دھندہ کرنا پڑتا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ اس نے دھندہ کیوں شروع کیا، عام رائے کا سب نہ صرف احترام کرتے ہیں بلکہ اس کو حرف آخر قرار دیتے ہیں اور

اس تماش کی عورتوں کو پیدائشی گناہگار تصور کیا جاتا ہے۔ بہت زیادہ تلاش کے باوجود ایسا کوئی خاندان نہیں مل سکا جس نے اس پیشے یعنی ایکسٹرا کے طور پر اداکاری کو اپنی اگلی نسل میں منتقل کیا ہو۔ اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ اس پیشے کو ایسا کام قرار ہی نہیں دیا جاسکتا جو اپنے کرنے والوں کو عام انسانوں جیسی معاشی یا معاشرتی زندگی گذارنے کی اجازت دے یا اس قابل کر سکے۔ کوئی ایک بھی ایکسٹرا عورت یا مرد یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کو جو کام فلموں میں ملتا ہے وہ اس کے خاندان یا صرف اس کی گذر اوقات کیلئے کافی ہے۔ یہ ایک حیران کن امر ہے کہ اس کام کا معاون کام صرف اور صرف جسم فروشی ہے۔ اگر عورت اس "صلاحیت" کی حامل ہے تو وہ اپنا جسم فروخت کر کے گذر بسر کرے گی اور اگر مرد اس کام سے وابستہ ہے تو دوسری عورتوں کی جسم فروشی میں معاون کا کردار ادا کرے گا۔

عموماً جسم فروش عورتوں کو اس طرح کے مواقع ملتے رہتے ہیں کہ وہ کسی مرحلہ پر اپنے کسی گاہک کے ساتھ ایسا تعلق استوار کر لیں کہ وہ اس کے ساتھ باقاعدہ شادی کر کے اس کو عام گھریلو عورتوں کی طرح زندگی گزارنے کی طرف لیجائے لیکن نگار خانوں میں ایکسٹرا کے طور پر کام کر کے ناگزیر ضروریات زندگی کیلئے جسم فروشی کرنے والی عورتوں کو ایسے مواقع نہیں مل سکتے۔ ان کے دائرۂ اثر یا تعلق داروں میں کوئی ایسا نہیں ہوتا جو ان کے ساتھ عشق کر سکے یا اس کو یہ میلی کچیلی اور مسلی ہوئی عورتیں دل و جان سے اپنی طرف راغب کر سکیں۔

کوئی فلمساز، اداکار یا سرمایہ کار اس بات پر راضی نہیں کہ ایکسٹرا عورتوں کو معاشی و معاشرتی تحفظ دیا جائے۔ تمام کا مشترکہ نقطہ نظر یہ ہے کہ ایسی عورتیں عادی مجرم ہوتی ہیں اور ان کے سدھارنے کے بارے میں نہیں سوچنا چاہئے۔ جہاں ان عورتوں کی حالت زار پر عام لوگوں کو ترس آنا چاہئے، وہاں ان کو غصہ آتا ہے کہ ان کی فلاح کے رے میں اگر کوئی منصوبہ بنایا جائے تو وہ کیوں بنے کیونکہ اس طرح تو ان جسم فروش ورتوں کا حوصلہ بڑھے گا اور وہ زیادہ دھڑلے کے ساتھ جسم فروشی کریں گی۔ "ان کا ب ہی علاج ہے کہ انہیں زبردستی اس پیشے سے روک دیا جائے اور قوانین کے مطابق ی سزائیں دی جائیں تاکہ معاشرے سے ایسے جرائم کا خاتمہ ممکن ہو سکے۔" یہ ایک یسے فلمساز کے خیالات تھے جو خود معروف ہیروئنوں کی سپلائی کا کام کرتا ہے اور اس

کے تعلقات اعلیٰ سیاستدانوں اور بیورو کریسی کے ساتھ یکساں خوشگوار ہیں اور ان تعلقات کی وجہ بھی یہ ہے کہ اس نے گزشتہ 15 برسوں کے دوران مقتدر حلقوں کے نوجوانوں کو فلمی ہیروئنیں بہم پہنچائیں۔

قصہ مختصر، نگار خانوں سے ان عورتوں کو بے دخل نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ان کی عدم موجودگی میں فلمسازوں کا کام نہیں چلے گا۔ اگر بالفرض محال ان کو فارغ کر بھی دیا جائے تو جو عورتیں ان کی جگہ سنبھالیں گی ان کو جسم فروشی کا خیر مقدم کرنا پڑے گا بصورت دیگر ان کو کوئی ایک دن کیلئے بھی سٹوڈیو میں نہیں رہنے دے گا۔ لہٰذا یہاں ان کو کام کرنے کیلئے اپنا جسم ہر صورت میں پیش کرنا پڑے گا اور بدلے میں یا تو نہایت معمولی معاوضہ وصول کرنا پڑے گا یا پھر ان کو فلم میں کام دلانے کا جھانسہ ملے گا لیکن پورے یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ انہیں کام ملے گا بھی یا نہیں۔ باوثوق ذرائع کے مطابق ایکسٹرا اداکاراؤں کی بڑی تعداد خطرناک بیماریوں کا شکار ہے لیکن ان کیلئے علاج کی کوئی سہولت نہیں۔ ان سے مستفید ہونے والوں میں بھی یہ بیماریاں یقیناً منتقل ہوں گی اور معلوم نہیں کہ ایسے لوگ یہ بیماریاں مزید کہاں کہاں لے جاتے ہیں۔ کوئی عورت یہ ماننے کو تیار نہیں کہ وہ بیمار ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی یہ دعویٰ نہیں کرسکتی کہ اس نے کبھی حفاظتی تدابیر کا سہارا لیا ہو یا اس کو معلوم ہو کہ غیر مرد کے ساتھ جنسی تعلقات کے دوران کیا حفاظتی تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں ایک فاضل اداکارہ اور جسم فروش نے بتایا: "جو بھی ہمارے پاس آتا ہے وہ تھوڑے سے وقت میں سب کچھ حاصل کرلینا چاہتا ہے اور اگر ہم کنڈوم وغیرہ کے بارے میں اس سے بات کریں تو وہ برا مان جاتا ہے کیونکہ وہ اس طرح "ادھوری مسرت" نہیں حاصل کرنا چاہتا اور وہ ان حفاظتی تدابیر کو اصل خوشی کے درمیان ایک فاصلہ تصور کرتا ہے اور اس کو غیر حقیقی سمجھتا ہے"۔

نگار خانوں میں ہونے والی جسم فروشی کا تدارک ناممکن ہے کیونکہ ناخواندگی اور غربت کے باعث یہاں پر عورتوں کا آنا جانا لگا رہے گا۔ سماجی عدم مساوات اور گھروں میں غیر متوازن حالات کے باعث والدین اور بچوں میں پیدا ہو جانے والے کھنچاؤ کو دور کرنا ایک تقریباً ناممکن امر ہے۔ ان حالات میں گھر سے بھاگی لڑکیوں اور لڑکوں کو ایسی جگہوں پر پناہ لینے سے نہیں روکا جاسکتا جہاں ان کو جسم فروشی جیسے دھندوں پر مجبور ہونا

اور لوگوں میں بے چینی پیدا کر کے انہیں ایسے کاموں کی طرف موڑ دیا ہے جنہیں وہ عام حالات میں کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

دیگر کاموں کی آڑ میں جسم فروشی

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آج پاکستان میں ہزاروں ایسے نام نہاد ادارے سرگرم ہیں جو بظاہر کوئی معزز پیشہ اختیار کئے ہوئے ملتے ہیں لیکن اس پیشے کی آڑ میں ان اڈوں میں جسم فروشی کا دھندہ کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات ایسے ایسے پیشوں کا پردہ چاک ہوتا ہے کہ آدمی حیرت سے دنگ رہ جاتا ہے کہ مقصد کتنا نیک اور صالح نظر آرہا ہے لیکن اس کے پیچھے کس قدر گند اور گناہ چھپا ہوا ہے۔ پوش علاقوں اور بڑے بڑے شاپنگ سینٹرز سے لیکر بھیک مانگنے والوں تک جسم فروشی کا ایک جال ملتا ہے۔ اگر صرف بھیک مانگنے والیوں کی مکمل تحقیقات کی جائیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ 92 فیصد سے 95 فیصد عورتیں دراصل جسم فروش ہیں اور انہوں نے مانگنے والیوں کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔

اس روایت کو محض بے روزگاری اور نامساعد معاشی حالات کا شاخسانہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے ملک میں گزشتہ دو دہائیوں کے دوران بے تحاشہ بڑھتی ہوئی آبادی کے مسائل میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے لیکن اسی رفتار سے نہ سہی تھوڑے کم تناسب کے ساتھ، روزگار اور دیگر کاموں کے مواقع بھی پیدا ہوئے ہیں۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ دیہات، قصبوں اور شہروں میں ایک عام صحت مند مرد یا عورت محض روٹی کے ہاتھوں مر سکتا ہے۔ ابھی تک اس معاشرے میں یہ گنجائش ضرور موجود ہے کہ کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں کہا جاسکے کہ وہ رزق نہیں کما سکتا اور نہ ہی اس کو رزق کمانے کے مواقع ملتے ہیں اور اس کسمپرسی کے عالم میں اس کی موت واقع ہو سکتی ہے۔ آج بھی اگر محض ایسے لوگوں کا ایک سروے کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ بھی نہیں کرتے، ان کی جسمانی حالت بھی ایسی ہے کہ وہ بہت کچھ کر سکتے ہیں لیکن ان کو کسی نہ کسی حیلے، بہانے یا وسیلے سے روزمرہ کے معمولات چلانے کیلئے نہ صرف تھوڑے بہت پیسے ملتے رہتے ہیں بلکہ ان کو شاید ہی کبھی فاقہ آیا ہو لہٰذا یہ اپنی حالیہ روش پر ہی قائم رہنا چاہیں گے لیکن دوسری طرف ایسے لوگوں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔ جو پندرہ بیس لوگوں کی کفالت محض اکیلے

کرتے ہیں اور کسی بھی طرح کسی دوسرے کے مرہون منت نہیں ہوتے۔

ہاں البتہ گذشتہ دو دہائیوں کے دوران پاکستانی معاشرے میں ایک واضح تبدیلی ضرور آئی ہے اور وہ یہ ہے کہ عام زندگی گزارنے والے لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے کسی نہ کسی طرح نشے کی عادت پختہ کرلی ہے اور انہوں نے نشے کے ساتھ ہی کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ ان لوگوں میں سے 95 فیصد ایسے لوگ ہیں جو جسمانی محنت کرتے تھے لہٰذا جب انہوں نے نشہ شروع کیا اور بہتر خوراک کی عدم دستیابی کے باعث محض نشہ ان کی واحد "خوراک" بن کر رہ گیا تو ان کے جسم اتنے زیادہ لاغر اور نحیف و نزار ہو گئے کہ وہ اپنے گھروں میں یا تو پڑے رہے یا پھر گھر والوں کی ناراضی سے خوفزدہ ہو کر انہوں نے سڑکوں، باغوں اور فٹ پاتھوں پر بقیہ زندگی رینگ رینگ کر گزارنے کا فیصلہ کرلیا۔ ان کو سماج نے قبول کرنے سے انکار کردیا کیونکہ ان کے لواحقین محض ان کی محنت پر بھروسہ کرتے تھے اور ان کا کمایا ہوا استعمال کرتے تھے اس لئے انہیں ایک خاندان کا دشمن قرار دیدیا گیا اور باقی لوگوں سمیت اس کے گھر والوں نے بھی ان کا بائیکاٹ کردیا۔ شاید ان کو ان کی اصلی حالت میں واپس لایا جاسکتا تھا اگر حکومت کا کوئی ادارہ ان کی بحالی کیلئے ان کے گھر والوں کی مدد کرتا کیونکہ ان لوگوں کے لواحقین تو خود ان کے مرہون منت تھے وہ ایک بڑا آسرا ختم ہو جانے کے بعد یا تو بکھر گئے یا پھر اتنی طاقت نہیں رکھتے تھے کہ وہ ان کے سدھار کی طرف رجوع کرتے۔

نشے کی طرف مائل ہو کر اپنے خاندانوں کی کفالت سے دستبردار ہونے والوں کی کسی کو فکر نہ تھی بلکہ اگر کبھی حکومت کی طرف سے ان کے بارے میں کوئی اقدام کیا جاتا تو وہ محض ان کی گرفتاری تھی جو ان کے نشے کے خلاف ایکشن تصور کی گئی۔ گرفتاری کے بعد عموماً ان لوگوں کو عدم پیروی کی صورت میں عدالتیں فوراً قید وغیرہ کی سزا سنا دیتیں اور یوں ایک عادی نشہ باز جیل میں چلا جاتا جہاں سے رہائی کے بعد وہ گھر کی بجائے دوبارہ انہی جگہوں کا رخ کرتا جہاں سے اس کو نشہ مل سکتا تھا۔

گھر کے ایک محنت کش کی نشہ کے بعد معذوری دراصل خاندان کے باقی لوگوں کیلئے مستقبل کی راہیں متعین کرتی۔ عموماً اس خاندان کی عورتیں لوگوں کے گھروں میں کام کاج سے اپنی محنت کی زندگی کا آغاز کرتیں جبکہ ان کے بچے ورکشاپوں وغیرہ پر پوری

زندگی بیگار کرنے کیلئے پہنچ جاتے۔ جو عورتیں لوگوں کے گھروں میں کام کرنے جاتیں ان کو ملنے والا انتہائی کم معاوضہ ان کو ایسے کاموں کی طرف راغب کرتا جو قانونی اور جائز قرار نہیں دیئے جاسکتے تھے۔ مثال کے طور پر یہ عورتیں اپنے کاموں کی ابتداء جہاں یہ ملازمت کررہی ہوتیں ان گھروں میں چھوٹی موٹی چوری سے کرتیں اس کے بعد مزید سہولیات اور پیسہ کمانے کی خواہش ان کو جسم فروشی کی طرف لے جاتی۔ ان میں لاتعداد کیس ایسے بھی ملتے ہیں کہ ان عورتوں کو ان کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جسم فروشی کی طرف لایا گیا۔ عموماً مالک مکان، اس کا بیٹا یا کوئی چہیتا نوکر ان غریب عورتوں کے ساتھ جنسی عمل کرتا اور منہ بند رکھنے کے عوض انہیں کچھ نقدی یا سامان وغیرہ دیتا۔ پہلے تو اس عورت کو اپنی عزت کیلئے دوسرے کی زیادتی کے بارے میں خاموش رہنا تھا لیکن بدلے میں وصول کی گئی یا زبردستی تھمائی گئی قیمتی چیز کیلئے بھی اس کو منہ بند رکھنا پڑتا کیونکہ راز فاش ہوجانے کی صورت میں نہ صرف اس کی نوکری ختم ہوسکتی تھی بلکہ اس کو پولیس کے حوالے بھی کیا جاسکتا تھا۔ یہ وہ مرحلہ ہے جہاں سے جسم فروشی پہلا قدم آگے بڑھاتی ہے۔ شروع شروع میں یہ عورتیں ایک بار کی زیادتی کے بعد جنس مخالف کے بڑھے ہوئے حوصلے کا خراج دیتی ہیں اور اس کے بعد انہیں اس کی عادت پڑ جاتی ہے۔

عادت کے پختہ ہوجانے کے بعد انہیں یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ اگر وہ اپنے چاہنے والوں میں اضافہ کرلیں گی تو پھر ان کی آمدن بھی بڑھ جائے گی لیکن اس طرح کا کام زیادہ دیر نہیں چلتا اور مجبوراً انہیں یا تو جگہ تبدیل کرنا پڑتی ہے یا اپنے گاہک بدلنا پڑتے ہیں لیکن عموماً ہوتا یہی ہے کہ ان کو جگہ ہی بدلنا پڑتی ہے۔ نئی جگہ پر وہ محض ایک کام کاج کرنے والی عورت کی حیثیت سے نہیں جاتیں بلکہ ان کی عادت ان کو ایک دوسرا تعارف بھی مہیا کرتی ہے اور وہ ایسی جگہ کام کرنے کو ترجیح دیتی ہیں جہاں ان کو بہتر حالات کے اندر رہتے ہوئے بہتر گاہک مل سکیں۔ عام آدمیوں کو کسی وقت بھی گاہک بنایا جاسکتا ہے کیونکہ معاشرے کی جنسی گھٹن اور پابندیاں انہیں ہر لمحہ کسی نئے جنسی تعلق کیلئے بے چین رکھتی ہیں۔ اس طرح کی عورتیں عموماً جگہ اس وقت تبدیل کرتی ہیں جب ان کو اچھے اور بروقت ادائیگی کرنے والے گاہک نہیں ملتے۔

اگر مزید تحقیق کی جائے تو ہمیں اس طرح کی جسم فروشی میں بھی درجے مل جاتے۔

ہیں۔ کچھ عورتیں بڑی کوٹھیوں میں کام کرتی ہیں اور اس کوٹھی کے ملازم لوگوں کے ساتھ اپنے تعلقات استوار کرتی ہیں اور ایک طرح سے اپنے ساتھ یہ سمجھوتہ کر لیتی ہیں کہ اس کو وہی کچھ ملے گا جو اس کے گاہک دیگر ملازم اپنی تنخواہوں میں سے یا دیگر چوریوں میں سے بچائیں گے۔ ایک درجہ یہ بھی ہے کہ یہ عورتیں اپنے دوست ملازموں کے ذریعے جسم فروشی کے کاروبار کو افرادی حوالے سے وسعت دے دیتی ہیں وہ ان ملازموں کے دیگر ملازم دوستوں کو بھی اپنا گاہک بنا لیتی ہیں اور یوں تعداد بڑھ جانے کے باعث ان کے معاوضے میں خود بخود اضافہ ہو جاتا ہے۔ جس کوٹھی میں وہ کام کر رہی ہوتی ہیں اسی کوٹھی کے کسی حصہ میں آنے کیلئے وہ دیگر کوٹھیوں کے اپنے دوست ملازموں کو وقت دیتی ہیں۔ ایک تیسرا درجہ بھی ہے جس میں اس طرح کی عورتوں کا براہ راست تعلق گھر کے مالک کے ساتھ بن جاتا ہے اور اس کو اس کی مخصوص تنخواہ کے علاوہ مالک کی بخشیش پر گزارا کرنا پڑتا ہے لیکن ایسا عموماً کم ہوتا ہے کیونکہ اس طرح کے تعلقات سے دیگر ملازمین بھی باخبر ہو جاتے ہیں اور وہ بلیک میل کر کے یا کسی دوسرے بہانے کے ساتھ اس عورت کے ساتھ اپنے تعلقات استوار کر لیتے ہیں۔ اس ضمن میں ایک مزید درجہ بھی ہمیں ملتا ہے کہ عادی ملازم عورتیں گھر کی ایسی مالک عورتوں کی ہمراز بن جاتی ہیں جن کو ان کے ملنے والے ان کے گھروں میں آکر ملتے ہیں۔ اس طرح مالکن اور ملازمہ دھندہ تو اپنا اپنا اور اپنے گاہکوں کی مدد سے چلاتی ہیں لیکن ملازماؤں ملازمت پر جمے رہنے کا انحصار ان کے مالکن سے تعلق کی مضبوطی پر ہے۔ ایک اور مزید درجہ اس ضمن میں مل جاتا ہے کہ بعض اوقات اس طرح کی عورتیں اپنے مالک یا مالکوں کیلئے جسم فروش لڑکیاں تلاش کر کے لاتی ہیں اور خود کو بھی گاہے بگاہے پیش کرتی رہتی ہیں اس لئے ان کا روزگار محفوظ رہتا ہے۔ یہ تو وہ مختلف درجے ہیں جو گھروں میں کام کرنے والی عادی جسم فروش عورتوں کے حوالہ سے متعین کئے جا سکتے ہیں آگے چل کر ان شعبوں کے بارے میں لکھا جائے گا جہاں عورتیں کام تو کوئی اور کرنے آتی ہیں لیکن اصل میں ان سے جنسی کام لیا جاتا ہے اور جب تک ان کے اجسام میں مالکوں کیلئے کشش باقی رہتی ہے ان کی ملازمت چلتی رہتی ہے اور جب ان کی جگہ کوئی دوسری ان سے بہتر عورت آجاتی ہے تو ان کو حقارت کے ساتھ فارغ کر دیا جاتا ہے۔ یہ شعبے اور ان کی صورتحال درج ذیل ہے۔

نمبر شمار	شعبہ	ملازمت کی نوعیت	اصل کام
-1	پرائیویٹ کلینک	i-نرس۔ ii-آیہ وغیرہ	جسم فروشی
-2	شادی دفاتر (عام)	i-کلرک۔ ii-منیجر۔ iii-کمیشن پر رشتے تلاش کرنیوالی	ایضاً
-3	پرائیویٹ دفاتر	i-استقبالیہ ملازمہ۔ ii-سیکرٹری وغیرہ	ایضاً
-4	پرائیویٹ سکول	i-ٹیچر۔ ii-سیکرٹری وغیرہ	ایضاً
-5	اشتہاری کمپنیاں	i-سیلز وومن۔ ii-سیلز منیجر وغیرہ	ایضاً
-6	ٹریول ایجنسیاں	i-کمیشن ایجنٹ۔ ii-سیکرٹری وغیرہ	ایضاً
-7	انشورنس کمپنیاں	i-سیلز وومن۔ ii-منیجر یا کمیشن ایجنٹ وغیرہ	ایضاً
-8	بھکاری عورتیں (گروپ)	کمیشن پر بھیک مانگنے والیاں	ایضاً
-9	چھوٹے اخبار اور میگزین	استقبالیہ ملازمہ + رپورٹرز + سب ایڈیٹرز وغیرہ	ایضاً
-10	ریکروٹمنٹ ایجنسیاں	سیکرٹری + استقبالیہ ملازمہ وغیرہ	ایضاً
-11	ڈرائیونگ سینٹرز	انسٹرکٹرز وغیرہ	ایضاً
-12	بیوٹی پارلرز وغیرہ	کاریگر	ایضاً

اگر ان دفاتر کی فرداً فرداً نوعیت اور نام لکھا جائے تو ان کی تعداد سینکڑوں تک جا پہنچتی ہے لیکن ان میں سے صرف ان اداروں کا نام دیا گیا ہے جو ہر شہر میں بڑی تعداد میں موجود ہوتے ہیں جبکہ مختلف اقسام کے دفاتر کو شق نمبر 3 کے تحت پرائیوٹ دفاتر (عام) کے تحت رکھا گیا ہے۔ اس شق کے تحت ان اداروں کو بھی شامل کر لیا گیا ہے جو کسی ایک شہر میں صرف ایک یا دو کی تعداد میں ہوتے ہیں جیسا کہ خواتین ویٹرز رکھنے والے ریسٹورنٹس وغیرہ۔ ان اداروں میں ملازمت کی آڑ میں جسم فروشی کرنے والی یا جسم فروشی پر مجبور کی جانے والی عورتوں کے بارے میں مکمل تفصیلات اور ان کے کام کی نوعیت کے بارے میں تفصیلاً اگلے صفحات پر بیان کیا جائے گا۔

(i) پرائیویٹ کلینک

پاکستان کا کوئی بھی ایسا شہر، قصبہ یا گاؤں ایسا نہیں جہاں کوالیفائیڈ ڈاکٹروں، حکیموں، نیم حکیموں اور عطائی ڈاکٹروں کے کلینک نہیں ہیں۔ بڑے شہروں میں ان کی تعداد ہزاروں تک جا پہنچتی ہے ان کلینکس پر عموماً دو سے لیکر 30 تک ایسی عورتوں کو ملازمت فراہم کی جاتی ہے جن میں سے کچھ کوالیفائیڈ نرسیں، دایہ اور دیگر تکنیکی کام کی ماہرین شامل ہوتی ہے جبکہ ان کے ساتھ ساتھ ایسی عورتوں کو بھی ملازمت دی جاتی ہے جن کے پاس سوائے اچھی جنسی کشش کے کوئی دوسری تکنیکی مہارت نہیں ہوتی۔ اس قبیل کی عورتیں کلینکس کے مالک ڈاکٹروں، دیگر ملازمین اور اکثر اوقات دولت مند مریضوں اور ان کے لواحقین کو اپنا جسم قیمتاً پیش کرتی ہیں، یوں وہ اس مقدس پیشے کی آڑ میں مجبوراً اور عادتاً جسم فروشی کے دھندے سے منسلک رہتی ہیں۔

پاکستان میں سب سے زیادہ کلینک کراچی اور لاہور جیسے بڑے شہروں میں موجود ہیں جبکہ ان کی ایک بہت بڑی تعداد راولپنڈی، پشاور، کوئٹہ، فیصل آباد، ملتان، ڈیرہ غازی خان، حیدرآباد، سکھر، لاڑکانہ، سانگھڑ، میانوالی، سرگودھا، شیخوپورہ، سیالکوٹ، گوجرانوالہ، گجرات غرض دیگر شہروں اور قصبات میں موجود ہے۔ ان اداروں کا اولین مقصد سرکاری ہسپتالوں میں جگہ حاصل نہ کر سکنے والے اور اچانک بیمار ہو جانے یا حادثات کا شکار ہو جانے والے لوگوں کو طبی سہولیات فراہم کر کے ان سے معاوضہ وصول کرنا ہوتا ہے۔ یہ الگ بحث ہے بلکہ الگ موضوع ہے کہ ان اداروں کی وساطت سے کتنے لوگوں کو کیسی طبی سہولیات کن نرخوں پر دستیاب ہوتی ہیں اور اس میں حکومت کی نااہلی کیا ہے اور سرکاری ہسپتالوں اور ان کے ڈاکٹروں کا کیا کردار ہے؟ ہمارے سامنے صرف ان نجی ہیلتھ کلینکس کا وہ کردار ہے جو اس تحقیق کا موضوع ہے۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق 70 ہزار سے زائد پرائیویٹ کلینک اور مطب کراچی میں لوگوں کو صحت کی سہولیات فراہم کر رہے ہیں۔ ان کلینکس میں سے 80 فیصد ایسے ہیں جن میں ملازم عورتوں سے جنسی کام لیا جاتا ہے اور ان عورتوں کی اکثریت محض اس لئے ملازم رکھی جاتی ہے کہ وہ برائے نام اصل کام کے بجائے (جس کیلئے ان کو ملازم رکھا گیا تھا) ڈاکٹروں، مریضوں اور ان کے لواحقین کو جنسی عیاشی فراہم کریں۔ کراچی صدر،

گلشن اقبال، کلفٹن، ناظم آباد، ملیر، لانڈی اور دیگر علاقوں میں ایسے مطب بھی ہیں جن میں لوگوں کی بڑی تعداد محض اس لئے بھرتی کی جاتی ہے تاکہ ان کو بیماری کی آڑ میں ہسپتال کے آرام دہ اور محفوظ کمروں میں جنس کا سامان مہیا کیا جائے۔ بلکہ پچھلے دنوں سابق وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کے خاوند مسٹر آصف علی زرداری پر الزام عائد کیا گیا کہ انہوں نے جیل سے علاج کی غرض سے کراچی کے ایک پوش علاقے میں واقع اپنے ذاتی دوست ڈاکٹر کے ہاں اپنی منتقلی کروائی۔ اس ہسپتال کے ایک کمرے میں آصف علی زرداری فلم انڈسٹری کی ایک مشہور اداکارہ نور کے ساتھ دار عیش دیتے رہے اور ان کی اس "عیش" سلسلہ چار روز تک چلتا رہا۔ جب آصف علی زرداری کی حفاظت پر ماکور سرکاری عملے کو معلوم ہوا کہ ان کا "مریض" اداکارہ نور کے ساتھ راتیں گذار رہا ہے تو اداکارہ زرداری صاحب کو "خوش" کر کے لاہور واپس آچکی تھی۔

کراچی کے علاقے کلفٹن میں واقع ایک اور پرائیویٹ ہسپتال میں سابق گورنر اور وزیر اعلیٰ سید غوث علی شاہ اور ان کا فرزند ایک طویل عرصے تک عیاشی کرتے رہے۔ ذرائع کے مطابق یہ ہسپتال خصوصی طور پر ایسے مریضوں کو ڈیل کرتا ہے جن کا تعلق وی وی آئی پی طبقہ سے ہوتا ہے۔ اس ہسپتال کا مالک ایک کروڑ پتی شخص ہے جس نے ایم بی بی ایس کرنے کے بعد آج تک ڈاکٹری کی پریکٹس نہیں کی لیکن اس نے کراچی کی بہترین ڈاکٹروں کی خدمات حاصل کر کے ایک شاندار کاروباری ادارہ بنالیا ہے۔ ذرائع کے مطابق سید غوث علی شاہ نے اپنے اقتدار کا زیادہ تر وقت اس کے ہسپتال میں گزارہ ہے۔ ہر تیسرے دن ان کی صحت خراب ہو جاتی اور وہ صوبے کی اعلیٰ ترین انتظامیہ کو ہدایات اس ہسپتال سے جاری کرتے۔ اس دوران اس ہسپتال میں ان کی عیادت کرنے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔ انہی عیادت کرنے والوں میں مذکورہ ہسپتال کا مالک ڈاکٹر شاہ صاحب کی پسندیدہ عورت کو شامل کر دیتا جو کئی راتوں تک شاہ صاحب کی "عیادت" کرتی رہتی۔ جب شاہ صاحب عیادت کروالیتے تو اچانک ہسپتال سے ان کو "مکمل فٹ" کا پروانہ جاری کیا جاتا اور ساتھ ہی ان کے ساتھ وعدہ کیا جاتا کہ جب وہ اگلی مرتبہ "بیماری" کی حالت میں تشریف لائیں گے تو ان کو پہلے سے بہتر "عیادت کنندہ" دی جائے گی۔

اس ہسپتال میں دیگر اہم ترین شخصیات بھی "عیادت" کروانے کے لئے گاہے بگا

ہے تشریف لاتی رہتی ہیں۔ ذرائع کے مطابق ہسپتال کی انتظامیہ ان اعلیٰ عہدے داروں کی "عیادت" کیلئے ٹیلی ویژن کی اداکاراؤں، یونیورسٹی اور کالجوں کی حسین طالبات کی خدمات حاصل کرتی ہے۔ بعض اوقات مہمان شخصیات خود خواتین ڈاکٹرز میں سے کسی ایک کو "عیادت" کے لئے منتخب کر لیتی ہیں جبکہ اکثر ان کو باہر سے مال فراہم کیا جاتا ہے۔ یہ تو محض اس ہسپتال کی روداد تھی جو کراچی شہر کی اشرافیہ کو "صحت" کی اعلیٰ سہولیات فراہم کرتا ہے اور بدلے میں بھاری معاوضہ اور مراعات حاصل کرتا ہے۔

کراچی کے دیگر پرائیویٹ ہسپتالوں اور کلینکس پر کام کرنے والی عورتوں کے ساتھ جس طرح سلوک کیا جاتا ہے اور ان کو جس طرح جسم فروشی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے یہی طریقہ لاہور اور دیگر بڑے شہروں کے ہسپتال اور کلینکس بھی اختیار کرتے ہیں۔ ان ہسپتالوں میں خصوصاً ایسی لڑکیاں نرس، دایہ اور دیگر تکنیکی مہارت کے حامل کاموں کے لئے ملازمت حاصل کرنے آتی ہیں جن کی اکثریت دوران تربیت جسم فروشی کے دھندے کے ساتھ وابستہ رہ چکی ہوتی ہے۔ ان عورتوں کو کس طرح اس پیشے کی طرف راغب کیا جاتا ہے اس کے بارے میں علیحدہ تفصیلات "تعلیمی ادارے اور جسم فروشی" نامی باب میں درج ہیں۔ ہسپتالوں میں ملازمت کرنے والی خواتین کو عموماً رات کی شفٹ کے لئے زیادہ بہتر خیال کیا جاتا ہے اور ان کو ان کی ظاہری شکل صورت کے پیش نظر رات یا شام کی شفٹ میں لگایا جاتا ہے۔ ایسی عورتوں کے ساتھ عموماً ان کے انچارج ڈاکٹر جنسی تعلقات استوار کرنے کی اولین کوشش کرتے ہیں جس میں 90 فیصد سے زیادہ کو کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ ظاہر ہے اگر ڈیوٹی پر موجود کسی خاتون ملازم کی "نااہلی" کی سفارش کوئی ڈیوٹی انچارج ڈاکٹر کرے گا تو اس شکایت کا مطلب یہ ہے کہ مذکورہ خاتون نے شکایت کنندہ کو گھاس نہیں ڈالی اور اگر ایسی صورت حال نہ پیش آئے تو پھر باہمی "تعاون" کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

پرائیویٹ ہسپتالوں اور کلینکس میں خواتین کو ملازمت دیتے وقت اس بات کا یقین کر لیا جاتا ہے کہ پاس کی جانے والی خواتین میں "مطلوبہ معیار" پر پورا اترنے کی کتنی صلاحیت ہے۔ اگر یہ خواتین پاس ہو جائیں لیکن "مطلوبہ معیار" پر پورا نہ اتر سکیں تو انہیں

مد ہی کسی دوسرے ہسپتال یا کلینک پر رجوع کرنے کا حکم دیدیا جاتا ہے۔ نرس کی زندگی نائی حسرت ناک بلکہ عبرتناک زندگی ہے۔ اس کی ڈیوٹی میں بھی اس سے ہونے والی تاہی کو برداشت نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی ڈیوٹی کے علاوہ باقی معاملات میں اس کے عدم ماون کو برداشت کیا جاسکتا ہے۔ اصل میں نرس کی زندگی کا خوفناک المیہ یہ ہے کہ اس کو یک ہمدرد طبی معاون کی جائے ایک شدید ترین جنسی خواہش کی حامل نوجوان لڑکی سمجھا اتا ہے جو جلد ہی جنسی عمل کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ مڈل کلاس میں نرس کا شعبہ ختیار کرنے والی لڑکی کو بدکردار، بولڈ اور جدیدیت کی طرف مائل بے حیا لڑکی تصور کیا اتا ہے یہی وجہ ہے کہ نرس جیسا مقدس پیشہ اختیار کرنے والی خواتین میں زیادہ تر سماندہ طبقات کی عورتیں شامل ہوتی ہیں۔ اگر دوسرے لفظوں میں نرس کے پیشے کی اکستان میں رائج تعریف کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شریف عورت اس پیشے کو اختیار نہیں کر سکتی۔ لوگوں کی بڑی تعداد محض ہسپتالوں کا چکر اس لئے لگاتی ہے کہ جنسی عمل کی بھوکی نرسیں ان کی طرف رجوع کریں گی اگر محض نرسوں کی معاشرے میں جگہ اور ان کی خاندانی زندگی اور شادیوں کے بارے میں معلومات اکھٹی کی جائیں تو حیران لن انکشافات سامنے آتے ہیں۔ مثال کے طور پر کوئی بھی مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والا نوجوان اپنی خوشی کے ساتھ نرس کے ساتھ شادی نہیں کر سکتا۔ اس کو اپنے خاندان اور رشتہ داروں سمیت اہل محلہ کے طعنوں اور نفرت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لوگ اس کے بارے میں خیال کریں گے کہ اس کو کسی شریف خاندان میں رشتہ نہیں ملا اس لئے اس نے ایک نرس کے ساتھ شادی کی ہے۔

سماجی سطح پر نرس کے بارے میں اس طرح کا خیال ہونے کی بڑی وجہ اس کی نامحرم لوگوں کی خدمت اور دیکھ بھال جیسے امور پر مبنی ڈیوٹی ہے۔ عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ایک نوجوان لڑکی غیر مردوں کی دیکھ بھال اور ان کی مرہم پٹی وغیرہ نہیں کر سکتی۔ عورت غیر محرم مردوں کے ساتھ اس قدر آزادی کے ساتھ نہیں مل سکتی جس طرح ایک نرس روزانہ سینکڑوں لوگوں سے ملتی ہے۔ نرس کو پوری پوری رات غیر محرم ڈاکٹروں کے ساتھ کام کرنا پڑتا ہے اس لئے اس کام کو بھی ایک عام خاندان برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ ایک نرس غیر محرم مردوں کو بعض اوقات برہنہ دیکھتی ہے اور ان کے جسموں

کو ہاتھ لگاتی ہے جبکہ عام زندگی میں اس طرح نہیں ہو سکتا۔

یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ کسی پرائیویٹ ہسپتال میں ملازم نرسوں کو کسی قسم کے جنسی تشدد کا سامنا نہ ہو۔ نرسوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے والوں کی چونکہ ایک بڑی اکثریت ہر وقت دستیاب ہوتی ہے اور دوسرے عموماً ان کی تنخواہ بہت کم ہوتی ہے اور ان کو بعض اوقات ایسی شفٹ میں لگایا جاتا ہے جہاں ان کو غیر محفوظ ہونے کا بہت زیادہ احساس ہوتا ہے۔ چونکہ ان کا تعلق عموماً تعلق غریب گھرانوں سے ہوتا ہے اس لئے ان کو پیسے وغیرہ اور بہتر ملازمت کا جھانسہ دے کر جنسی تعلقات کی طرف راغب کیا جاسکتا ہے۔

نرسوں کے حوالے سے ایک بہت اہم بات جو بہت زیادہ قابل افسوس اور قابل مذمت بھی ہے وہ یہ ہے کہ پاکستان میں نرسوں کی ایک بڑی تعداد مسیحی خاندانوں سے تعلق رکھتی ہے۔ ان کا تعلق ایسے مسیحی خاندانوں سے ہوتا ہے جو عموماً غربت کی لکیر کے نیچے زندگی گزارتے ہیں۔ یہ لڑکیاں پوری محنت کے ساتھ اپنی ملازمت کرتی ہیں لیکن اکثر ان کو سرکاری ہسپتالوں میں نوکری نہیں دی جاتی۔ سوائے مشن کے ہسپتالوں کے کرسچین نرسوں کو بہت کم ملازمت دی جاتی ہے۔ ایک ایسی عورت کا نرس ہونا اور دوسرا اس کا غیر مسلم ہونا اس کو مزید غیر محفوظ بنا دیتا ہے۔ اس کو جگہ جگہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

تقریباً اسی طرح کی صورت حال لاہور کے ہسپتالوں میں بھی ہے۔ پرائیویٹ ہسپتالوں میں نرسوں کو عموماً جنسی تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور ان میں سے اکثر اپنے بارے میں قائم شدہ عمومی تاثر کو نفسیاتی طور پر قبول کر کے جسم فروشی کی طرف عملی طور پر آجاتی ہیں۔ بہت ہی کم تنخواہوں اور سہولیات کی عدم موجودگی میں ان کو بے تحاشہ مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کم تنخواہوں اور عمومی رویئے کی وجہ سے وہ کسی ایسے آدمی کے ساتھ جنسی تعلقات کو ترجیح دیتی ہیں جو ان کے مالی مسائل کو کم کر سکے اور ان کو تحفظ دے سکے۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوتا کیونکہ کوئی بھی ان کے ساتھ شادی کر کے زندگی گزارنے کو تیار نہیں ہوتا اور محض ان کے ساتھ جنسی تعلقات استوار کر کے وقت گزارنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔

لاہور کے تقریباً چالیس سے زیادہ پرائیویٹ ہسپتالوں اور کلینکس میں نرسیں جسم فروشی کا باقاعدہ دھندہ کرتی ہیں۔ ان کو پہلے بااثر لوگ اور ہسپتالوں کے مالکان اس طرف لاتے ہیں اور پھر جب ان کے تعلقات کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے تو عموماً ان کو ہسپتالوں سے فارغ کر دیا جاتا ہے۔

کئی ایسے ہسپتال بھی ہیں جن میں خاص طور پر تیار کرائے گئے کمروں میں نرسیں جسم فروشی کرتی ہیں اور ان کے گاہک مریضوں کے طور پر ان ہسپتالوں میں داخل ہوتے ہیں اور ان کو جو کمرے دیئے جاتے ہیں وہاں نرسیں ان کی جنسی خواہش کی تسکین کرتی ہیں۔ ایک ڈاکٹر نے بتایا کہ نرسوں کے ساتھ جو ناروا سلوک روا رکھا جاتا ہے اس کی بڑی وجہ نرسوں کا غریب خاندانوں سے تعلق ہوتا ہے۔ لوگ ان کے ساتھ جھوٹ بول کر ان کو اپنے دام میں پھنسا لیتے ہیں اور پھر وہ ان کی تمام جائز ناجائز خواہشات پوری کرتی رہتی ہیں۔ اس نے مزید بتایا کہ میں نے آج تک کوئی پرائیویٹ یا سرکاری ہسپتال ایسا نہیں دیکھا جہاں ڈیوٹی ڈاکٹر ان کے ساتھ جنسی زیادتی نہ کرتے ہوں لیکن میں نے اپنے پندرہ سالہ کیریئر میں آج تک نہیں سنا کہ کبھی ڈاکٹر نے کسی نرس کے ساتھ شادی کی ہو۔ جب ایک اچھی معاشی و سماجی حالت کا حامل ایک بے چاری مجبور نرس کے ساتھ اپنا "عشق" ظاہر کرتا ہے تو یہ نرس کی زندگی کا شاید حسین ترین لمحہ ہوتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں دراصل یہ لمحہ اس کی زندگی کا بدترین اور منحوس ترین لمحہ ہوتا ہے کیونکہ وہ آنے والے حالات کے بارے میں بے خبر ہوتی ہے۔ چند ماہ تک وہ نرس ہواؤں میں رقص کرتی پھرتی ہے لیکن جب مذکورہ ڈاکٹر کو اس سے بہتر کوئی نرس ملتی ہے تو وہ ایک دم اس کو زمین کی گہرائیوں میں دھکیل دیتا ہے۔ چونکہ ڈاکٹر موصوف اس کی جنسی زندگی میں ہلچل پیدا کر چکے ہوتے ہیں لہٰذا وہ اس کیفیت سے باہر نہیں آسکتی۔ کوئی دوسرا اس کو سہارا دینے کیلئے تیار نہیں ہوتا اور نہیں اس کو اچھا رشتہ ملنے کی امید ہوتی ہے لہٰذا وہ جلد ہی ایسے لوگوں کے جال میں پھنس جاتی ہے جو اس کے جسم کا استعمال ایک مشین کی طرح کرتے ہیں۔ مذکورہ ڈاکٹر صاحب کے بقول شاید 2 فیصد نرسیں اس کربناک صورت حال سے مکمل طور پر بچنے میں کامیاب رہی ہوں جبکہ 98 فیصد کے ساتھ ہمیشہ یہی المیہ رونما ہوتا ہے۔

جن نرسوں کے ساتھ دھوکہ ہوتا ہے وہ ردعمل کے طور پر نفسیاتی طور پر اس

گرداب میں پھنس جاتی ہیں اور کوئی ان کو نکالنے والا نہیں ہوتا۔ وہ باقاعدگی کے ساتھ جسم فروشی کی طرف مائل ہو جاتی ہیں۔ چونکہ ہسپتالوں کی مخصوص عوامی صورت حال کے پیش نظر ان کو گاہکوں کی کمی محسوس نہیں ہوتی اس لئے ان کی جب تک جسمانی صورت حال ٹھیک رہتی ہے انہیں "کام" ملتا رہتا ہے۔ ان کی زندگی کا آخری کربناک لمحہ وہ ہوتا۔ جب ان کے بارے میں محسوس کیا جانے لگتا ہے کہ وہ جسم فروشی کے قابل بھی نہیں رہیں اور لوگ ان سے کنارہ کش ہونے لگتے ہیں۔ اول تو جسم فروشی کا دھندہ کرنے والی نرسوں کی شادی نہیں ہو پاتی اور اگر کسی طرح ان کی شادی ہو جائے تو ڈیوٹی کے غیر متوازن اوقات اور ڈیوٹی کی نوعیت کے ساتھ ساتھ ان کا سابقہ ریکارڈ انہیں ہر وقت اس احساس میں مبتلا رکھتا ہے کہ ان کی ازدواجی زندگی کامیاب نہیں ہو سکے گی اور ایک نہ ایک دن ان کو اس لمحے کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے جب ان کی ازدواجی زندگی واقعی ختم ہو جاتی ہے۔

نرسوں کے علاوہ دوسرا شعبہ جو اپنے کام کی نوعیت سے ہی ناپسندیدہ قرار دیا جاتا ہے وہ دایہ کا ہے دایہ کے طور پر کام کرنے والی عورتوں کو عموماً ٹھیک کردار کی حامل نہیں سمجھا جاتا۔ ان کے پیشے کے پیش نظر یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ چونکہ ان کی مہارت گائنی کے حوالے سے ہے اور ان کی ذاتی معلومات اس حوالے سے بہت زیادہ ہوتی ہیں لہذا یہ عورتیں ان معلومات کے باعث خود بخود جنسی تعلقات کی دلدل میں دھنستی چلی جاتی ہیں۔ ایک تاثر یہ بھی ہے کہ یہ عورتیں ناجائز تعلقات کی حامل عورتوں کو اولاد پیدا نہ ہونے دینے کے بہتر طریقے بتاتی ہیں اور اگر ان کے ہاں اولاد پیدا ہو جانے کا احتمال ہو یا وہ حاملہ ہو جائیں تو یہ ان کی ناجائز اور غیر قانونی مدد کر کے ان سے بھاری رقوم بٹورتی ہیں۔ ایک خیال یہ بھی عام لوگوں میں پایا جاتا ہے کہ دایہ کے طور پر کام کرنے والی عورتیں چونکہ اسقاط حمل کے غیر قانونی عمل کے ذریعے پیسے کماتی ہیں اس لئے ان کا براہ راست تعلق جسم فروش عورتوں کے ساتھ ہوتا ہے اور یہیں سے یعنی اسی تعلق کی مناسبت سے ان کا رابطہ جسم فروشی، اداروں تک اور ان اڈوں کو چلانے والوں سے ہوتا ہے اور یہ بہت جلد جسم فروشی کی طرف مائل ہو جاتی ہیں۔

لاہور میں صفیہ نامی کلینکس کے ایک بڑے کاروباری ادارے کو اس سلسلے میں مثال

کے طور پر لیا جاسکتا ہے۔ صفیہ کلینکس کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ یہاں نرسیں اور دایہ عورتیں غیر قانونی طور پر اسقاط حمل کے کاروبار سے منسلک ہوتی ہیں اور یہ عورتیں خود بھی جسم فروشی کے کاروبار کا ایک حصہ ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ لاہور کے بعض پرائیویٹ کلینکس اور ہسپتالوں میں کام کرنے والی دایہ عورتیں باقاعدہ جسم فروشی کا دھندہ کرتی ہیں۔ ان عورتوں کا براہ راست رابطہ گاہکوں اور جسم فروشوں کے ساتھ ہوتا ہے جس کو یہ اپنے حالات بہتر کرنے کے لئے استعمال کرتے ہوئے اس کام میں شامل ہو جاتی ہیں۔ لیکن زیادہ تر اس قسم کی عورتیں رابطے اور سپلائی کا کام کرتی ہیں اور اپنا حصہ وصول کرتی ہیں۔

ایک مقامی باشندے نے بتایا کہ صفیہ کلینکس اور دوسرے پرائیویٹ گائنی ہسپتالوں میں ملازمت کرنے والی زیادہ تر عورتیں جسم فروشی کا دھندہ کرتی ہیں۔ لوگ ان کو ہسپتالوں میں فون کر کے اپنے ٹھکانوں پر بلا لیتے ہیں یا ہسپتالوں میں خود پہنچ کر ان کے جسموں کا حصول ممکن بناتے ہیں۔ ان ہسپتالوں اور کلینکس کو عموماً پولیس کا مکمل تحفظ اور تعاون حاصل ہوتا ہے اور ان اداروں پر کبھی کوئی چھاپہ نہیں پڑتا اور نہ ہی یہاں ناجائز کام کرنے والوں کو روکا جاسکا ہے۔

پرائیویٹ ہسپتالوں اور کلینکس میں کام کرنے والی نرسیں زیادہ تر ہسپتالوں میں آنے والے لوگوں میں سے اپنے گاہک پسند کرتی ہیں اور پھر اپنی ڈیوٹی کے خاتمے پر ان کے ساتھ انجانی منزلوں کی طرف روانہ ہو جاتی ہیں۔ ذرائع کے مطابق اوباش نوجوانوں اور عیاش افراد کی ایک بڑی اکثریت اس خیال کے تحت نرسوں وغیرہ کے ساتھ جنسی تعلقات کو ترجیح دیتی ہے کہ ان کو جنسی معاملات میں خصوصی مہارت حاصل ہوتی ہے۔ لوگوں کے خیال میں ان کے ساتھ جنسی تعلقات رکھنے میں بڑا تحفظ اور اطمینان یہ ہوتا ہے کہ انہیں ان تمام طبی حفاظتی تدابیر کے بارے میں معلوم ہوتا ہے جو عام پیشہ ور عورتوں کو نہیں معلوم ہوتا اور ان کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرنے سے نہ صرف عام آدمی زیادہ سکون اور لذت حاصل کر سکتا ہے بلکہ اس کو یہ خدشہ بھی نہیں رہتا کہ اس کی ساتھی حاملہ ہو جائے گی اور اس صورت میں اس کے لئے مسائل پیدا ہوں گے۔

ایک ڈاکٹر نے بتایا کہ لاہور میں بعض ایسی دایہ اور نرسیں بھی ہیں جو گائنی کے

معاملات میں خاص مہارت رکھتی ہیں اور وہ باقاعدہ معاوضہ لے کر جسم فروشی کا پیشہ کرنے والی عورتوں کا ایک خاص مدت کے دوران معائنہ کرتی ہیں اور ان کو مشورے اور ادویات فراہم کرتی ہیں۔ انہوں نے مزید بتایا کہ شازیہ نام کی ایک دایہ لاہور میں قائم جسم فروشی کے اڈوں پر کام کرنے والی عورتوں کا ہفتہ وار معائنہ کرتی ہے، ان کو ان کی صحت کیلئے اور گائنی مسائل کے بارے میں مشورے دیتی ہے اور ادویات تجویز کرتی ہے۔ شازیہ اس کام کا بھاری معاوضہ وصول کرتی ہے اور اس کی مہارت کے چرچے جسم فروش عورتوں اور طوائفوں میں عام ہیں۔

اگر "دیگر کاموں کی آڑ میں جسم فروشی" کے دھندے میں کسی شعبے کو اولیت دی جاسکتی ہے تو وہ طب کا شعبہ ہے جہاں ملازم عورتیں عموماً جسم فروشی کے دھندے میں بھی اپنا بھرپور کردار ادا کرتی ہیں اور ساتھ ساتھ ان کا اصل کام بھی چلتا رہتا ہے۔ بعض ذرائع کے مطابق کراچی، لاہور، فیصل آباد اور اسلام آباد میں کئی ایسے ہسپتال اور کلینکس موجود ہیں جہاں علاج کرانے والے لوگوں کی تعداد کم جبکہ اس کے بہانے جسم فروش عورتوں سے مستفید ہونے والوں کی تعداد زیادہ ہے۔ اسلام آباد کے ایک سیکٹر میں ایسا پرائیویٹ ہسپتال بھی ہے جو صرف کشمیر سے تعلق رکھنے والے امیر اور عیاش لوگوں کو سہولیات فراہم کرتا ہے اور اس ہسپتال میں زیادہ تر افغان مہاجر خواتین جسم فروشی کا دھندہ کرتی ہیں۔ اس ہسپتال کا مالک ایک عام آدمی ہے جس نے چھ سات ڈاکٹر اور ایک درجن سے زائد جسم فروش عورتوں کو ترسوں کے طور پر بھرتی کر رکھا ہے۔ ذرائع کے مطابق اس ہسپتال میں ہر وقت کشمیر سے آئے ہوئے "جنسی مریضوں" کا ہجوم رہتا ہے اور یہاں کمرہ حاصل کرنے کے لئے باقاعدہ ایڈوانس بکنگ کروانا پڑتی ہے۔ مقامی پولیس کو اس ہسپتال کے اصل دھندے کے بارے میں معلوم ہے لیکن ہسپتال کا مالک تھانے میں معقول رقم ہر ماہ بھیج کر پولیس کو ہسپتال سے دور رکھتا ہے۔

راولپنڈی میں ایک ایسا پرائیویٹ ہسپتال ہے جس کی فیس دوسرے ہسپتالوں سے تین گنا ہے لیکن یہاں عام طبی سہولیات اور ماہر عملہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس ہسپتال کی زیادہ فیس کا راز اس کے مخصوص مریض ہیں اور ان مریضوں کو بہم پہنچائی جانے والی خصوصی "سہولیات" ہیں۔ اس ہسپتال میں شوقین لوگ جوق در جوق آتے ہیں اور اپنا

'علاج'' کئی کئی دن تک کراتے رہتے ہیں۔ ایک گاہک کو کم از کم تین دن اور راتیں یہاں
اخل ہونا پڑتا ہے اور اس کو راولپنڈی کے کالجوں کی طالبات اور دیگر نوجوان عورتیں
راہم کی جاتی ہیں۔ جب مریض ''ٹھیک'' ہو کر واپس جاتا ہے تو کاؤنٹر پر اس کو 30 سے
40 ہزار روپے کا بل ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس ہسپتال کا مالک ایک غیر معروف ڈاکٹر ہے جس
کی بیوی بھی ڈاکٹر ہے اور دونوں پوری محنت اور جانفشانی کے ساتھ مریضوں کا ''علاج''
کرتے ہیں۔ ان کے ہسپتال کیلئے جو عورتیں لڑکیاں تلاش کر کے لاتی ہیں ان کو بہت زیادہ
کمیشن دیا جاتا ہے اور ان کی دیگر ضروریات کا بھی پورا پورا خیال رکھا جاتا ہے۔

اگر صرف ہسپتالوں اور پرائیویٹ کلینکس میں ہونے والی جسم فروشی کے بارے
میں ہی مکمل تحقیق کی جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار کی جاسکتی ہے۔ کیونکہ ہسپتالوں کی
بہت زیادہ تعداد صرف اس ایک مخصوص دھندے میں ملوث ہے اور جن لوگوں کا ان
ہسپتالوں میں ''علاج'' ہوتا ہے ان کا تعلق اس ملک کی اشرافیہ سے ہے۔ ان کو جو
لڑکیاں فراہم کی جاتی ہیں ان کا تعلق بھی عام گھرانوں کے ساتھ نہیں ہوتا بلکہ ان
میں بھی کئی بڑے گھرانوں اور خاندانوں سے تعلق رکھنے والی عورتیں ہوتی ہیں۔ قانون
نافذ کرنے والے ادارے بخوبی جانتے ہیں کہ ان ہسپتالوں میں کیا ہوتا ہے لیکن ان کو
کس طرح روکا جاتا ہے اور کس طرح ان کا منہ بند کیا جاتا ہے یہ بھی ایک مکمل داستان
ہے۔ لیکن آج تک اس بارے میں کچھ نہیں لکھا گیا اور نہ ہی ابھی تک کچھ منظر عام پر
آسکا ہے۔ تحقیق کرنے والے اور دیگر لکھنے والے اس طرف اگر توجہ بھی دیں تو ان کا
رویہ تنقیدی ہوتا ہے اس لئے وہ بہت سی اصل معلومات تک نہیں پہنچ سکتے اگر یہ رویہ
ہمدردانہ ہو تو پھر شاید زیادہ معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔

(ii) شادی دفاتر

اگر شادی جیسے اہم اور نہایت ذمہ دارانہ کام کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں معلوم ہوتا
ہے کہ سماجی اور مذہبی حوالے سے شادی کرانے اور ایک بہتر جوڑا بنانے والے کو
معاشرے میں کس قدر اہم قرار دیا جاتا ہے اور اس کے کام کو انتہائی نازک اور ذمہ دارانہ
قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے ہاں پیشہ کے طور پر اس کام کو اپنانے والوں
کے بارے میں معاشرے میں بہت زیادہ ابہام پائے جاتے ہیں۔ لوگ آسانی کے ساتھ کہہ

سکتے ہیں کہ شادی دفاتر یا تو فراڈیوں کے اڈے ہوتے ہیں یا پھر جسم فروشی کے اڈے۔ لوگ ان کے ذریعے شادی کے امیدوار ہوتے ہیں اصل میں وہ شادی کے بہانے ایسی عورتوں سے ملتے ہیں جو اصل میں جسم فروش ہوتی ہیں اور اس اہم "رابطے" کے عوض پرکشش کمیشن حاصل کرتی ہیں۔

روزانہ اخبارات میں نہایت امیر اور خوبصورت عورتوں جن میں اکثریت بدقسمتی سے طلاق شدہ، کنواری اور انتہائی معمولی جسمانی نقص کی حامل خوبصورت عورتوں کی ہوتی ہے کے ساتھ شادی کے امیدوار تلاش کرنے کیلئے اشتہارات دیئے جاتے ہیں اس مختصر سے اشتہار میں امیدوار کیلئے فائدے ہی فائدے ہوتے ہیں جبکہ شادی کرانے والے کی نیک نیتی اور خدا ترسی کے بارے میں بھی مطلع کیا گیا ہوتا ہے۔ امیدواروں عموماً اشتہار کے ذریعے ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ بالشافہ ملیں۔ اب بعض ایسے شادی دفتر والوں نے یہ بات بھی لکھنا شروع کر دی ہے کہ "شادی دفتر والوں سے معذرت" جبکہ خود شادی دفتر کھول کر بیٹھے ہوتے ہیں۔

شادی دفتر کو کامیابی کے ساتھ چلانے کیلئے ایک ماہر اور جہاندیدہ عورت کی ضرورت ہوتی ہے۔ زیادہ تر دفاتر جسم فروشی کا دھندہ کرنے والے مردوں کے ہوتے ہیں جبکہ انہوں نے دفتر کو چلانے کیلئے پرکشش تنخواہوں پر ماہر عورتیں خصوصی طور پر بھرتی کر رکھی ہوتی ہیں۔ ان عورتوں میں سے اکثریت کا ماضی بہت اچھا نہیں ہوتا لوگوں کو پرکھنے اور جانچنے کی خصوصی صلاحیت ان کے ماضی کی چغلی کھاتی ہے۔ عورتیں اپنی چرب زبانی اور خصوصی مہارت کو استعمال کرتے ہوئے شادی دفتر کے کاروبار کو کامیاب بناتی ہے۔ شادی دفتر میں آنے والوں کو خصوصی طور پر ایسی عورتوں سے ملایا جاتا ہے جو ان کو بہلا پھسلا کر پھانسنے کی کوشش کرتی ہے۔ شادی دفتر دراصل ایک مہذب "کام کی آڑ میں جسم فروشی کا جدید ترین دھندہ ہیں۔ شادی دفتر والے اپنے اس دفتر کو محض گاہک پھانسنے کیلئے استعمال کرتے ہیں جبکہ قریبی آبادی میں ان کا شاندار گھر جسم فروش عورتوں سے بھرا پڑا ہوتا ہے۔ مجھے ایک شادی دفتر کے متاثرہ شخص نے بتایا کہ اس اخبار میں ایک امریکن شہری عورت جو طلاق یافتہ تھی کی شادی کا اشتہار پڑھ کر عا اقبال ٹاؤن میں واقع ایک شادی دفتر سے رابطہ کیا تو انہوں نے مجھے فوراً اپنے دفتر بلا

ایک ہوشیار اور ادھیڑ عمر عورت دو لڑکیوں کے ساتھ دفتر میں بیٹھی کافی سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ میں نے اپنا تعارف کرایا تو اس نے پاس بیٹھی ہوئی لڑکیوں کو دوسرے کمرے میں بھیج دیا۔ انہوں نے انتہائی مودب انداز میں مجھے میری ممکنہ "منکوحہ" کے بارے میں حیران کن تفصیلات سے آگاہ کیا اور ایک عورت سے فون پر رابطہ کروایا، جس نے بڑے اشتیاق کے ساتھ میرے ساتھ بات کی اور مجھے اگلے روز مال روڈ پر واقع ایک فائیو سٹار ہوٹل میں ملنے کا وقت دیدیا۔ مجھے دفتر میں موجود عورت نے بتایا کہ میں جس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہوں وہ ان دنوں شادی کی ہی نیت سے پاکستان آئی ہوئی ہیں اور مذکورہ ہوٹل میں رہائش پذیر ہیں۔ اخبار میں اشتہار پڑھ کر میری طرح کئی لوگ آئے ہیں لیکن بدقسمتی سے اس عورت کو ان میں سے ایک بھی پسند نہیں آیا اس نے مجھے بتایا کہ وہ اس عورت کی پسند کو جان چکی ہے اور یقیناً وہ عورت مجھے پسند کرے گی اور شادی کر کے مجھے اپنے ساتھ امریکہ لے جائے گی۔ اس طرح میرا نصیبہ کھل جائے گا۔ اس متاثرہ شخص نے مجھے مزید بتایا کہ میں نے جب دفتر والی اس "باجی" سے اس عورت کے بارے میں حیران کن باتیں سنیں اور اس کی جدید تعلیم، اس کی خوبصورتی، جائیداد اور دینداری کے بارے میں مجھے طرح بتایا گیا تو میں اس سے ملاقات کا مشتاق ہو گیا۔

اگلے روز جب میں مذکورہ ہوٹل پہنچا تو دفتر والی "باجی" اور تین چار لڑکیاں ایک میز پر بیٹھی بے تابی کے ساتھ میرا انتظار کر رہی تھیں۔ "باجی" نے مجھے بتایا کہ وہ بیس منٹ سے میرا انتظار کر رہی ہیں۔ میں نے معذرت کی تو ان میں شامل ایک لڑکی نے عجیب و غریب انگریزی میں پاکستانیوں کی اس عادت پر روشنی ڈالی کہ کس طرح امریکہ میں بھی پاکستانی ہمیشہ دیر سے تقریبات میں آتے ہیں اور ان کے بارے میں وہاں کے لوگ کیا کہتے ہیں۔ انہوں نے فوراً ویٹر کو کھانے کا آرڈر دیدیا۔ جب ہم کھانا کھا چکے تو ویٹر بل لے آیا۔ "باجی" نے فوراً ویٹر کو میری طرف موڑ دیا۔ خوش قسمتی سے میری جیب میں تین ہزار روپے تھے جبکہ 2400 روپے کا بل تھا۔ میں نے خاموشی سے بل ادا کیا اور مزید اخراجات سے بچنے کیلئے اجازت طلب کی۔ "باجی" نے مجھے بازو سے پکڑ کر کرسی پر بٹھا دیا اور اس "امریکن" لڑکی کو میرے ساتھ بٹھا کر خود باقی لڑکیوں کے ساتھ وہاں سے اٹھ گئی۔

جاتے ہوئے اس نے معنی خیز انداز میں کہا کہ "اب آپ دونوں ایک دوسرے سے باتیں کریں ہم ابھی آجائیں گی"۔

جب میں نے اس کے ساتھ گفتگو شروع کی تو مجھے معلوم ہوا کہ اس نے زندگی بھر صوبہ پنجاب سے باہر قدم نہیں رکھا اور دراصل وہ ایک جسم فروش عورت ہے جو شادی کا جھانسہ دیکر لوگوں سے رقم بٹورتی ہے۔ اس نے مجھے صاف لفظوں میں جسم کی آفر کی۔ میں نے شادی دفتر کی "باجی" سے رابطہ کیا تو اس نے مشورہ دیا کہ اس کے ساتھ وقت گزارو اور ایک دوسرے کو خوب اچھی طرح "جان" لو لیکن "باجی" یہ ماننے کو تیار نہیں تھی کہ جس عورت کو وہ امریکن شہری اور شادی کی خواہشمند ظاہر کر رہی ہیں وہ اصل میں جسم فروش ہے۔ میں نے اس سے اس کی امریکن شہریت کا ثبوت مانگا تو وہ میرا منہ دیکھتی رہ گئی۔

اسی طرح ان شادی دفتر والوں نے کمیشن پر رشتے تلاش کرنے والی عورتیں بھرتی کر رکھی ہوتی ہیں جو دراصل اس کام کی آڑ میں جسم فروشی کرتی ہیں۔ یہ عورتیں پیشہ ور جسم فروش ہوتی ہیں اور رشتہ کی تلاش میں آنے والوں کو پھنسا کر دھندہ کرتی ہیں۔ ان

عورتوں کو عموماً شادی دفاتر کی مالکن عورتوں نے اپنے گھروں میں جسم فروشی کیلئے جگہ فراہم کر رکھی ہوتی ہے جہاں یہ گاہک کو لے جا کر دھندہ کرتی ہیں۔ اسی طرح شادی دفاتر کی مالکن ایک جسم فروش خوش شکل عورت کو منیجر کے طور پر بھرتی کرتی ہے جو دفتر میں آنے جانے والوں اور فون کرنے والوں کو جسم پیش کرتی ہے۔ دراصل شادی دفتر ایک نیک سماجی کام کی آڑ میں جسم فروشی کا اڈہ ہوتا ہے اور یہ امر ان کے مخصوص اور لگے بندھے گاہکوں کو معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے ان کے جاننے والے لوگ ان کے ساتھ نام نہاد شادی دفاتر کی آڑ میں جنس فروشی کے عمل سے وابستہ رہتے ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق کراچی میں اس طرح کے شادی دفاتر کی تعداد 50 سے زائد ہے جبکہ لاہور میں ان کی تعداد 30 سے زائد ہے جہاں اس کام کی آڑ میں جسم فروشی کا دھندہ کیا جاتا ہے۔

ایک پیشہ ور طوائف نے بتایا کہ دراصل کھلے عام دھندہ کرنے میں بعض اوقات بہت زیادہ رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں۔ اس لئے عموماً پرانی طوائفیں جہاں دیگر کاموں کی آڑ لیکر جسم فروشی کا دھندہ کرتی ہیں وہاں ان کو شادی دفاتر کے نام پر یہ دھندہ کرنے میں زیادہ آسانی محسوس ہوتی ہے۔ شادی دفاتر کے نام پر ان کا رابطہ عموماً آسانی کے ساتھ لڑکیوں، خصوصاً ایسی لڑکیوں سے ہوتا ہے جو یا تو غربت کی وجہ سے شادی کرانے میں ناکام رہتی ہے یا پھر ان میں سے بعض اپنے کردار یا ماضی کے کسی اس طرح کے واقعے کے باعث شادی کی عمر گزار دیتی ہیں۔ ان عورتوں کے لواحقین کا آخری سہارا شادی دفاتر ہوتے ہیں۔ یہاں ان دفاتر کی وساطت سے ان کی شادی تو شاید نہیں ہوتی لیکن جرائم پیشہ عورتیں ان کو اپنے مذموم مقاصد میں استعمال کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔

شادی دفاتر کا تمام کاروبار محض جھوٹ اور نمود و نمائش کے سہارے چلتا ہے۔ جھوٹ کی آمیزش کے باعث ان کو بعض اوقات ایسے مواقع مل جاتے ہیں، جن کی وجہ سے یہ ایسی لڑکیوں کو بھی اپنے فائدے کیلئے استعمال کر لیتی ہیں جو دراصل اس قبیل کی نہیں ہوتیں۔ زائد عمر کی لڑکیوں کو اکثر اوقات اس پر مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ شادی کے خواہشمند شخص کو کسی نہ کسی طرح اپنی طرف مائل کریں تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتی ہیں۔ لڑکیاں بے چاری لالچ کے تحت اس طرح کی کوشش کرتی ہیں تو ان کو مجبوراً اپنا جسم پیش کرنا پڑتا ہے۔ ایک بار کی اس طرح کی جرات کے بعد جب ان کو ان کا مقصد بھی حاصل نہیں ہوتا تو مایوسی کے عالم میں وہ ایک رد عمل کے طور بھی اس دھندے کی طرف مائل ہو جاتی ہیں اور اکثر اوقات ایسا ہی ہوتا ہے اور اس طرح لڑکیاں ان کی مستقل گاہک بن جاتی ہیں۔

(iii) پرائیویٹ دفاتر

یہ ایک وسیع موضوع ہے اور اس میں ہر نوعیت کے ایسے آفس شامل ہیں جہاں عورتوں کو ملازم رکھ کر ان سے آفس کی ضرورت کے مطابق وہ کام نہیں لیا جاتا جس کی ان کے ساتھ تنخواہ ان کو بھرتی کرتے وقت طے کی جاتی ہے بلکہ ان کو کسی نہ کسی طرح جسم فروشی کی طرف لے جا کر ان سے دھندہ کرایا جاتا ہے۔ ان دفاتر میں جن کی نوعیت کچھ بھی ہو سکتی ہے عموماً لڑکیوں کو استقبالیہ کلرک یا ذاتی سیکرٹری وغیرہ کے کام کیلئے رکھا جاتا ہے۔ اخبارات میں اس طرح کی نوکری کیلئے اشتہار دیا جاتا ہے اور ساتھ ہی نرم شرائط کے ساتھ ایک بے روزگار اور غریب لڑکی کیلئے پرکشش تنخواہ رکھی جاتی ہے۔ اشتہار دینے والے ادارے کو اپنی مطلوبہ لڑکی حاصل کرنے کیلئے ذرا بھر بھی تکلیف نہیں کرنا پڑتی کیونکہ اجتماعی بے روزگاری اور غربت کے باعث لاتعداد لڑکیاں یہ نوکری حاصل کرنے کی خواہشمند ہوتی ہیں۔ ان لڑکیوں کا ابتدائی انٹرویو ہی اس نیت کے ساتھ لیا جاتا ہے تاکہ ان میں سے مطلوبہ لڑکی کو تلاش کیا جا سکے چونکہ لڑکی ہر صورت میں ملازمت حاصل کرنا چاہتی ہے، اس لئے وہ شروع کی مشکلات کو عبور کرنے کے عزم کے ساتھ انٹرویو دیتی ہے۔

حتمی کامیابی عموماً ان عورتوں کو حاصل ہوتی ہے جو دفتر کے مالک کی مرضی کے مطابق ہوتی ہیں۔ ان کامیاب عورتوں کو بتا دیا جاتا ہے کہ اگر وہ "محنت" کریں گی تو دفتر کی کامیابی کے ساتھ ساتھ ان کو بھی کامیابی حاصل ہو گی اور یوں یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔

مثال کے طور پر اس موضوع کے تحت آنے والے دفاتر میں اگر کسی دفتر کو اس کی شاخوں کی تعداد اور ملازمہ رکھنے کی تعداد کے حوالے سے اولیت دی جا سکتی ہے تو یہ وکلاء کے ایسے دفاتر ہیں جہاں وہ اپنے لئے ذاتی سیکرٹری کو بھرتی کرتے ہیں۔ ذاتی سیکرٹری کیلئے پرکشش ہونا ایک ناگزیر معیار ہے۔ اس کی خوبصورتی اور ملازمت برقرار رکھنے کی مجبوری اس کو اپنا جسم پیش کر دینے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ایسی عورتیں تنخواہ تو بظاہر اپنے "کام" کی

لیتی ہیں لیکن ان کو معاوضہ دراصل ان کے جسم کے استعمال کا دیا جاتا ہے۔ اکثر اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ مالک دفتر کے دوست اور ملنے والے بھی اس سے مستفید ہونا چاہتے ہیں تو ان کو بھی ایک مخصوص مقدار میں پیسے ادا کر کے اس کام میں شریک کر لیا جاتا ہے۔ ان دفاتر میں مجبور عورتوں کا اصل کام کے بجائے جسم پیش کر کے تنخواہ وغیرہ حاصل کرنا جسم فروشی کے زمرے میں آتا ہے۔ یہاں پر ان کو جو عادت پڑتی ہے وہ آگے چل کر ان کے مستقبل کا تعین کرتی ہے۔ اکثر عورتیں اس وقت جسم فروشی کے دھندے میں ملوث ہیں جو بظاہر وکلاء کے دفاتر میں ذاتی سیکرٹری کی پارٹ ٹائم ملازمت کرتی ہیں اور ان کے مالک بھی ان کے ساتھ اس دھندے میں شامل ہو جاتے ہیں اور اکثر اوقات ان عورتوں کو سپلائی کر کے اعلیٰ افسران سے اپنے کام بھی نکلواتے ہیں۔

اسی طرح لاہور، کراچی، فیصل آباد اور سیالکوٹ وغیرہ جیسے کاروباری اداروں میں کارگو دفاتر اور کسٹم کلیرنس کرانے والوں کے دفاتر میں خصوصی طور پر عورتوں کو ملازمت دی جاتی ہے۔ یہاں بھی لڑکیوں کو سیکرٹری یا استقبالیہ کلرک کے طور پر ملازمت دی جاتی ہے لیکن ان سے اصل کام دفتر کے ملازمین اور مالکان کی جنسی تسکین کا لیا جاتا ہے۔ ان دفاتر میں کاروباری افراد کو استقبالیہ دینے کیلئے خوبصورت لڑکیوں کو استعمال کیا جاتا ہے تاکہ مستقل گاہک بنایا جا سکے۔ "مستقل گاہکوں" کی تعداد کا تعلق ان دفاتر کی خوبرو لڑکیوں کے حسن سلوک سے ہوتا ہے۔ یہ لڑکیاں خصوصی طور پر اپنے "معزز گاہکوں" کو اچھے ہوٹلوں میں ٹھہرا کر وہاں پیش کی جاتی ہیں اور جتنی اچھی یہ لڑکیاں "سروس" فراہم کریں گی ویسا ہی پختہ گاہک ان کے ادارے کو ملے گا۔

ان اداروں میں عموماً شروع میں خود ادارے کے مالکان ان لڑکیوں کو اس پیشے کی طرف لاتے ہیں اور انہیں یقین دلاتے ہیں کہ اگر ان کی کارکردگی اچھی رہی تو پھر سب کا کاروبار اچھی طرح چل نکلے گا اور اگر ان لڑکیوں نے ناتجربہ کاری کا مظاہرہ کیا اور گاہکوں

کو اپنی طرف متوجہ نہ کیا تو پھر نہ صرف ان کے ادارے کا کاروبار تباہ ہو جائے گا بلکہ اس صورت میں لڑکیوں کو بھی بے روزگار ہونا پڑے گا۔ ایسی لڑکیاں، جو اس سے پہلے بے روزگاری کے مسائل دیکھ چکی ہوتی ہیں اور ملازمت کے بعد ان کو جہاں گھر سے آزادانہ دفتر آنے کی سہولت حاصل ہوتی ہے وہاں اپنے لباس اور میک اپ کیلئے بھی ان کو دفتروں سے خصوصی سہولت ملتی ہے، ان مواقع کو ضائع نہیں کرنا چاہتیں اس لئے وہ حتیٰ المقدور یہ کوشش کرتی ہیں کہ ان کا کاروبار چلتا رہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کو حاصل سہولیات بھی برقرار رہیں۔ اسی طرح امپورٹ ایکسپورٹ کرنے والے ادارے بھی اپنے ہاں خصوصی طور پر خوبصورت لڑکیوں کو ملازمت دیتے ہیں اور ان کی مدد سے اپنے کاروبار کو ترقی دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس طرح مذکورہ بالا ادارے کو اپنے کاروبار کی ترقی کیلئے تجربہ کار عورتوں کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح موخر الذکر قسم کے اداروں کو بھی اپنا کاروبار بہتر بنانے کیلئے "اچھی" عورتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

بڑے بڑے سٹورز اور بوتیکوں پر بھی سیلز وومن کے طور پر کام کرنے کیلئے ایسی عورتوں کا انتخاب کیا جاتا ہے جو کاروبار میں معاونت کرتی ہیں۔ ان لڑکیوں کو ان کی مجبوری کا فائدہ اٹھا کر ہمیشہ جسم فروشی کی طرف آنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ عام دفاتر کی طرح مالکان کی طرف سے جنسی تعلقات کے بعد ان کے دفاتر اور دکانوں سے باہر بھی اس طرح کے تعلقات استوار ہو جاتے ہیں اور یہ دفتر آنے سے پہلے اور جانے کے بعد اپنے بیرونی دوستوں کے ساتھ وقت گزارتی ہیں۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق مختلف نوعیت کے عام دفاتر میں ملازمت کرنے والی لڑکیوں میں سے 80 فیصد مالکوں کی رضامندی اور تاکید کے تحت جسم فروشی کی طرف آجاتی ہیں۔ جسم فروشی جہاں ان کے کام میں ان کیلئے ضروری ہوتی ہے وہاں یہ اپنے دیگر اخراجات اور گھر والوں کیلئے زیادہ پیسے کمانے کی غرض سے اس پیشے کی طرف آجاتی ہیں۔

(iv) پرائیویٹ سکولز

نجی اداروں میں بہت معمولی تنخواہوں پر کام کرنے والی لڑکیوں کی سب سے بڑی تعداد پرائیویٹ سکولز میں نوکری کرتی ہے۔ پاکستان میں اس وقت ایسے تعلیمی اداروں (پرائیویٹ) کی تعداد لاکھوں میں ہے جہاں میٹرک سے لیکر ایم اے تک تعلیم کی حامل لاکھوں لڑکیاں بہت معمولی تنخواہوں پر ملازمت کرتی ہیں۔ ہر سکول اپنے ملازمین کیلئے معیار خود مقرر کرتا ہے اور اس ملازمت کے قواعد و ضوابط اور ملازمین کے حقوق کے بارے میں کوئی دستاویز ایسی نہیں ملتی جس کو قانونی یا اخلاقی جواز حاصل ہو۔ اسی طرح پرائیویٹ سکولز چلانے والوں کیلئے کوئی خاص معیار مقرر نہیں ان کو معمولی رقم لیکر رجسٹرڈ کرلیا جاتا ہے اور ایک خاص مدت کے بعد ان پرائیویٹ تعلیمی اداروں کو بورڈز اور یونیورسٹیاں تک الحاق کے سرٹیفکیٹس جاری کردیتی ہیں لیکن رجسٹرڈ اور الحاق شدہ اداروں سے تقریباً دس گناہ زیادہ ایسے ادارے بھی پوری سرگرمی کے ساتھ چل رہے ہیں جن کا کسی ادارے سے الحاق نہیں اور نہ ہی ان کا کوئی خاص تعلیمی معیار ہے۔ ان تعلیمی اداروں کو چلانے والے کیلئے بھی کسی خاص تعلیمی اہلیت کا حامل ہونے کی کوئی شرط معیار نہیں۔ اس لئے ایسے لوگ اس میدان میں آجاتے ہیں جن کا تعلیم اور تربیت کے ساتھ دور دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا لیکن ان اداروں میں ایسے اداروں کو شامل نہیں کیا جاسکتا جو مکمل طور پر سائنسی بنیادوں پر قائم کئے جاتے ہیں اور ان کا تعلیمی معیار نہایت اعلیٰ ہوتا ہے۔ اس طرح کے ادارے اساتذہ بھرتی کرتے وقت کڑے معیار کے حامل لوگوں کو ملازمت دیتے ہیں اور بدلے میں اچھی تنخواہیں دیتے ہیں۔ ان اداروں کو انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے اور ایسے اداروں میں ملازمت حاصل کرنے والی عورتوں کو عام اداروں میں پیش آنے والے حالات اور مسائل سے واسطہ نہیں پڑتا۔ جیسے جیسے تعلیمی اداروں کا تدریسی معیار گرتا جاتا ہے اس کے ملازمین کیلئے معیار کی شرط کمزور پڑتی جاتی ہے اور ایسے لوگوں کو بھی بھرتی کرلیا جاتا ہے جن کے ابھی خود تعلیم حاصل کرنے کے دن ہوتے ہیں لیکن ان کو استاد کی حیثیت سے نوکری دیکر ان کو اپنے مقاصد کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔

پاکستان میں پرائیویٹ تعلیمی ادارے کھولنے والوں کی اکثریت کے سامنے بہت کم محنت اور سرمائے کے بعد بہت زیادہ آمدن کا تصور ہوتا ہے۔ آسانی کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس کام کو شروع کرنے والوں میں سے 90 فیصد خود تعلیمی لحاظ سے پسماندہ ہوتے ہیں۔ ان کا واضح ترین مقصد تعلیم جیسے مقدس پیشے کو اختیار کر کے جدید دور میں تعلیم بہم پہنچانا نہیں ہوتا بلکہ اس کی آڑ میں بہت زیادہ پیسہ کمانا ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جو ادارے ضرورت کو مد نظر رکھتے ہوئے اعلیٰ تعلیمی معیار کو اپناتے ہیں، ان کے مالکان کو بہت زیادہ دولت بھی ملتی ہے اور نیک نامی بھی لیکن اس طرح کام کرنے والے اداروں اور اس طرح کی سوچ رکھنے والے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ایسے اداروں میں چونکہ تعلیم کے حوالے سے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا جاتا اس لئے وہی لوگ ان میں ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں جو ان کے معیار پر پورا اترتے ہیں۔

اس کے برعکس ان تعلیمی اداروں کی تعداد کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا جو ہر شہر، قصبہ اور گاؤں کی گلی گلی میں نجی سطح پر تعلیم دے رہے ہیں۔ ان سکولوں کو اس دور میں عام لوگوں کیلئے زیادہ قابل قبول بنانے کیلئے "انگلش میڈیم" کا دم چھلہ لگایا جاتا ہے۔ ان سکولوں میں نہ تو کوئی تعلیم کا معیار ہے اور نہ ہی ان کے اساتذہ کے پاس کوئی قابل قدر تعلیمی ڈگری ہوتی ہے۔ یہ کاروبار عام طور پر ایسے لوگ کرتے ہیں۔ جن کے پاس ادھوری تعلیم کے باعث اور کچھ کرنے کو نہیں ہوتا نہ ان کو کسی سرکاری ادارے میں کوئی نوکری مل سکتی ہے اور نہ ہی یہ کسی اچھے تعلیمی ادارے میں استاد کے طور پر ملازمت کرنے کے اہل ہوتے ہیں۔ ان سکولوں کو اسی فلسفہ کے تحت کھولا جاتا ہے، جیسے ایک عام پرچون کی دکان کھولنے کیلئے مکمل طور پر کاروباری فلسفہ سامنے رکھا جاتا ہے۔ ظاہر ہے اس صورت میں ان تعلیمی اداروں میں تعلیم جیسے حساس اور نازک کام کو احسن طریقے سے سرانجام دینے کی کوئی صلاحیت نہیں ہوتی۔ سکول کا پرنسپل جو کہ اکثر اوقات اس سکول کا مالک بھی ہوتا ہے یہ اس کی صوابدید پر ہے کہ وہ کس طرح کا تعلیمی ماحول طالب علموں کو فراہم کرتا ہے اور ان کیلئے کس طرح کے

استاد مقرر کرتا ہے۔

پرائیویٹ سکول کھولتے وقت اس بات کا احساس ضرور کیا جاتا ہے کہ زیادہ تر عورتوں کو استاد کی حیثیت سے نوکری دی جائے۔ مڈل اور میٹرک پاس لڑکیاں اور اکثر اوقات میٹرک فیل لڑکیاں بھی بھرتی کرلی جاتی ہیں۔ ایسا زیادہ تر اس وقت ہوتا ہے جب سکول کا مالک یہ سوچتا ہے کہ وہ ان لڑکیوں کو بہت کم تنخواہ دے گا اور اس کی مجموعی آمدن بڑھ جائے گی۔ اس موقع پر بھرتی ہونے والی لڑکی سے خصوصی طور پر کہا جاتا ہے کہ اگر وہ محنت کرے گی اور اچھا نتیجہ دے گی تو اس کی تنخواہ میں بھی اضافہ کردیا جائے گا۔ اول تو لڑکیوں کو ہر صورت میں سکول میں نوکری چاہئے ہوتی ہے۔ اگر شروع میں ان کو تنخواہ نہ بھی دی جائے گی تو ان کو کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ وہ یہ ظاہر کرنا چاہتی ہیں کہ ان کے پاس ملازمت ہے اور وہ ملازمت پر ترقی کررہی ہیں۔ ایسا اس وقت ہوتا ہے جب لڑکیاں معمولی تعلیم حاصل کرنے کے بعد گھر بٹھا دی جاتی ہیں اور ان کا خاندان ان کی شادی نہیں کرسکتا اور ہر گزرنے والا دن ان کی عمر میں اضافہ کرکے انہیں شادی سے دور لے جاتا ہے۔ ایسی لڑکیوں کو بھرتی کرنے کی بڑی وجہ سکول کے مالک کا وہ اطمینان ہوتا ہے کہ لڑکیاں کم عمر کی نہیں ہیں اور یہ اس کے سکول اور بچوں کی اچھی طرح دیکھ بھال کریں گی۔

جب سکول میں پڑھائی کا سلسلہ شروع ہوتا ہے تو سکول کے مالک یا پرنسپل کو اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بھرتی کردہ سٹاف بچوں کو تعلیم دینے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ اس صورت میں سٹاف کیلئے خدشات بڑھ جاتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ پرنسپل اس کو ادارے سے علیحدہ نہ کرے۔ اس خواہش کے پورے ہونے کا انحصار پرنسپل کی شخصیت پر ہوتا ہے۔ اکثر اوقات پرنسپل جو محض تھوڑے سے سرمائے سے ایک بلڈنگ کرائے وغیرہ پر حاصل کرکے ایک سکول کے مالک بن جاتے ہیں، ان کی اصلیت ظاہر ہوتی ہے اور وہ اپنی ملازماؤں کو نفسیاتی طور پر اتنا زیادہ دباؤ میں لاتے ہیں کہ یا تو یہ عورتیں نوکری چھوڑ جاتی ہیں اور اگر نوکری چھوڑنا ان کیلئے اور ان کے

خاندانوں کیلئے سود مند نہ ہو تو پھر یہ اپنی عزیز ترین متاع عفت بھی مالک یا پرنسپل کو پیش کر دیتی ہیں۔ ان کا یہ "تحفہ" فوری طور پر ان کی فراغت کو موخر کر دیتا ہے اور پرنسپل بھی ان کی خراب تعلیمی کارکردگی کو اچھی جنسی کارکردگی کے نیچے چھپا لیتے ہیں اور ان کے تعلقات روز بروز گہرے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح کی کیفیت کسی ایک ٹیچر کے ساتھ ہی پیش نہیں آسکتی بلکہ اس طرح کے حالات تقریباً تمام ٹیچروں کے ساتھ رونما ہو سکتے ہیں۔ اس صورت میں پرنسپل یا سکول کا مالک کوشش کرتا ہے کہ ان میں جو زیادہ پرکشش اور سود مند ہے اس کو باقی رہنے دیا جائے اور دوسری عورتوں کو یا تو چھٹی کرادی جائے یا پھر ان کے کسی اور مصرف کے بارے میں سوچا جائے۔

ان سکولوں میں پڑھانے والی ان ٹرینڈ لڑکیوں کو انتہائی کم تنخواہ پر ملازمت دی جاتی ہے۔ اس تنخواہ میں یہ لڑکیاں سارا دن سکول میں بچوں کو سنبھالتی اور ان کو اپنی بساط کے مطابق تعلیم دیتی رہتی ہیں۔ مثال کے طور پر مڈل کے بعد کسی پرائیویٹ سکول میں ملازمت اختیار کرنے والی لڑکی کو 700 سے 800 روپے ماہوار پر ملازم رکھا جاتا ہے جبکہ میٹرک پاس لڑکی کو 800 سے 1000 روپے تک ملازمت دی جاتی ہے۔ اس تنخواہ میں شاید ان لڑکیوں کے گھر والوں کا کچن وغیرہ تو چل سکے لیکن ان کا ذاتی طور پر گزارہ ہونا ناممکن ہوتا ہے۔ اس صورت میں ان کو سب سے زیادہ ضرورت جس چیز کی پڑتی ہے وہ روزانہ گھر سے نکلنے اور سکول تک پہنچنے کیلئے اچھا لباس، سکول میں دیگر ساتھی لڑکیوں کے سامنے بچوں کو پڑھانے کیلئے اچھی تیاری۔ لیکن ان کی تنخواہ ان کو اس طرح کے چونچلوں کی اجازت نہیں دیتی۔ ظاہر ہے یہ لڑکیاں گھر سے ملازمت کرنے کیلئے نکلی ہوتی ہیں اور اگر یہ گھر میں اپنی تنخواہ وغیرہ نہیں دیں گی تو پھر ان کو کہیں کام کیلئے جانے کی بھی اجازت نہیں دی جائے گی۔ یہاں پر ان کو اخراجات پورے کرنے کیلئے یا تو سکول کے مالک کا مرہون منت ہونا پڑتا ہے یا پھر اپنے تعلقات کو وسعت دیکر ایسے لوگ تلاش کرنا پڑتے ہیں جو ان کی ضروریات کو پورا کر سکیں۔ یہ وہ موڑ ہے جہاں پر ایک کم پڑھی لکھی لڑکی بے راہ روی کا شکار ہو جاتی ہے اور تیزی کے ساتھ باقاعدہ جسم فروشی کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔

مذکورہ بالا دستیاب وسائل اور سہولیات کے ساتھ جو تعلیمی ادارے شروع کئے جاتے ہیں ان کا کامیاب ہونا بھی تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ اس صورت میں سکولوں کے مالکان ایسے حربوں کی طرف سفر کرتے ہیں جن کے اختیار کرنے سے ان کو نقصان پہنچنے کا احتمال نہیں ہوتا۔ زیادہ تر ان کے پاس یہ راستہ ضرور ہوتا ہے کہ اگر وہ اچھی تعلیم دیکر اچھا معاوضہ نہیں کما سکتے تو اچھے طریقے سے مجبور عورتوں کو منظم کر کے سکول کی آڑ میں ایک اچھا جسم فروشی کا اڈہ ضرور چلایا جاسکتا ہے۔ سو ایسا ہی ہوتا ہے اور سکول کے سائے تلے جسم فروشی کا کاروبار شروع کر دیا جاتا ہے۔ شروع میں پرنسپل یا مالک سکول یا مالکن کو اپنے لئے گاہک تلاش کرنا مشکل ہوتا ہے لیکن رفتہ رفتہ یہ مشکل بھی دور ہو جاتی ہے اور ان کو گاہکوں کی کمی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

گاہک تو راستہ چلتے مل جاتے ہیں۔ بس ان کو اچھی طرح سے اکاموڈیٹ کرنا باقی ہوتا ہے جو مالک یا مالکن کے پاس اچھی عمارت ہونے سے حل ہو جاتا ہے۔ لوگ ایک سکول کی آڑ لیکر ان عمارتوں کے اندر داخل ہوتے ہیں لیکن اپنا کام کر کے اور معاوضہ ادا کر کے واپس چلے جاتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ اپنے گاہکوں کو پک اینڈ ڈراپ کی سہولت بھی دیتے ہیں جس سے سکول کے بارے میں مقامی لوگوں میں ابہام پیدا ہونے کی گنجائش ختم کی جاتی ہے اور یوں پرائیویٹ تعلیمی ادارے جسم فروشی کے بہترین مراکز بن جاتے ہیں۔

ایک پرائیویٹ سکول کے پرنسپل نے بتایا کہ ہر وہ لڑکی جس کی تعلیم مکمل ہو چکی ہو یا ادھوری ہو اور اس کی وقت مقررہ پر شادی نہ ہو سکی ہو وہ پڑھانے کیلئے تیار ہوتی ہے۔ بشرطیکہ اس کا تعلق غریب گھرانے سے ہو۔ اس کیلئے کسی تربیت یا تجربے کی ضرورت نہیں۔ والدین تعلیمی اداروں کو خصوصاً محفوظ اور باعزت تصور کرتے ہیں اور اپنی لڑکیوں کو پڑھانے کی اجازت دے دیتے ہیں۔ اول تو نوکری حاصل کرنے کا انحصار ہی اس خاموش معاہدے پر ہوتا ہے کہ ملازمت اختیار کرنے والی پرنسپل یا مالک سکول کی ہر خواہش کا احترام کرے گی کیونکہ وہ سمجھ رہی ہوتی ہے

کہ اس کے پاس نہ تو سکول کا مطلوبہ تعلیمی معیار ہے اور نہ ہی تجربہ ہے۔ اس لئے اس کو ملازمت دینے والے کی اس عمل میں خصوصی مہربانی بھی شامل ہے۔ جب اس طرح ملازمت دی جاتی ہے تو پھر اس لڑکی کا ہمیشہ کیلئے پرنسپل یا مالک کا مرہون منت رہنا لازمی ہوتا ہے۔ شروع میں اس کو کہا جاتا ہے کہ وہ پرنسپل یا مالک کی جنسی ضرورت کو پورا کرے۔ ایک خاص اطمینان کے بعد وہ اس کی جنسی خواہش اور ضرورت کا احترام کرتی ہے اور اپنے آپ کو ملازمت پر مستقل تصور کرتی ہے۔ اس کو یقین ہے کہ اگر اس نے اس عمل سے انکار کیا تو دراصل یہ ملازمت چھوڑ دینے کا ایک طرح سے اعلان ہوگا لہٰذا ملازمت چھوڑ دینے سے اس کو دوبارہ اسی گھر میں بیٹھنا ہوگا جہاں وہ زندگی کے مشکل ترین دن گزار رہی تھی اور پھر اس کی ذاتی آمدن بھی ختم ہو جائے گی لہٰذا یہ تصور اس کو ملازمت چھوڑنے نہیں دیتا اور وہ بہت زیادہ نفسیاتی و ذہنی کشمکش میں بھی ملازمت ترک نہیں کرتی۔

اکثر اوقات ایسا بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ سکول کی انتظامیہ نے ملازمت کرنے والی خواتین کو مجبور کر کے ان سے جسم فروشی کا دھندہ کرایا۔ بعض اوقات انتظامیہ ان عورتوں کو محکمہ تعلیم کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے اعلیٰ افسران کو "خوش" کرنے کیلئے بھیج دیتی ہے اور بعض اوقات امتحانات میں بہتر پوزیشن حاصل کرنے کیلئے امتحانی مراکز کے ذمہ داروں کو یہ عورتیں پیش کی جاتی ہیں۔ اس سے انکار نہیں کہ ان پرائیویٹ تعلیمی اداروں میں پہلے ملازمت حاصل کرنے والی عورتوں کو ان اداروں کے مالکان اور پرنسپل صاحبان اس طرف لاتے ہیں اور ان کی مجبوری کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس کے بعد جب ان کا دھیان اس طرف ہو جاتا ہے تو اس کو باقاعدہ ایک پیشے کی حیثیت سے تسلیم کر لیا جاتا ہے اور سکولوں میں باقاعدہ جسم فروشی کے اڈے کھل جاتے ہی۔ ان اڈوں سے زیادہ تر حاصل ہونے والی آمدنی کا فائدہ بھی سکولوں کے مالکان کو ہی ہوتا ہے جبکہ مجبور عورتیں اس سے کچھ فائدہ بھی حاصل نہیں کر پاتیں۔ ان کو ان کی معمولی تنخواہ پر ہی گزارہ کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے جبکہ ان کو استعمال کرنے والے لاکھوں روپے کما لیتے ہیں۔

(v) اشتہاری کمپنیاں اور ادارے

روزمرہ استعمال اور عام زندگی کی ضروریات کی اشیاء کیلئے تشہیر اور انہیں گھر گھر پہنچانے کی مہم کی آڑ میں بعض ایسے ادارے بھی میدان میں آگئے ہیں جو صرف غریب اور پسماندہ طبقات سے تعلق رکھنے والی عورتوں کو ملازمت فراہم کرتے ہیں۔ ان عورتوں کو معمولی تنخواہ اور حسب کارکردگی کمیشن پر ملازمت دی جاتی ہے۔ یہ عورتیں مختلف کمپنیوں کی اشیاء لیکر گھر گھر جاتی ہیں اور ان کو بیچنے کی کوشش کرتی ہیں۔ یہ اشیاء جو عموماً نہایت کم قیمت اور اچھی کوالٹی کی نہیں ہوتیں ان کو فروخت کرنے کیلئے ان عورتوں کو اپنی نسوانیت اور جنسی کشش کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اگر گاہک صرف مرد ہوں تو ان کو نہ صرف زیادہ محنت کرنا پڑتی ہے بلکہ اکثر اوقات انہیں ان چیزوں کے ساتھ اپنا جسم بھی پیش کرنا پڑتا ہے اور چیزوں کی قیمت کے علاوہ اپنے جسم کی بھی معمولی قیمت وصول کرنا پڑتی ہے۔

اس طرح کی کمپنیوں میں بھرتی کے اشتہار اخباروں میں شائع ہوتے ہیں۔ جرائم پیشہ لوگ چھوٹے چھوٹے دفاتر لیکر ان عورتوں کو بھرتی کرتے ہیں اور عام استعمال کی اشیاء تیار کرنے والے اداروں کے ساتھ ٹھیکے پر کام کرتے ہیں۔ گھریلو استعمال کی ان اشیاء کی چونکہ کوالٹی بالکل اچھی نہیں ہوتی اس لئے ان کو فروخت کرنے کیلئے عورتوں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ سیلز وومن کے طور پر کام کرنے والی ان عورتوں کو پہلے تربیت دی جاتی ہے جو کہ اصل میں کاروبار کے گر سکھانے اور اشیاء فروخت کرنے کے بارے میں دی جانے والی تعلیم نہیں ہوتی بلکہ ان کو اس بات کی تربیت دی جاتی ہے کہ کس طرح انہوں نے گاہک کے مطاق ڈیلنگ کرنا ہے۔

ان اداروں کی عورتیں قابل پرکشش اور جنسی ترغیب دینے والا لباس زیب تن کر کے عام دفاتر اور گلی محلوں میں یہ اشیاء فروخت کرتی ہیں۔ ان عورتوں کی صورتحال دیکھ کر بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ اشیاء فروخت ہوں نہ ہوں ان کے جسم اور خواہش ضرور فروخت ہو جاتی ہیں۔ ان کے گاہکوں میں دفاتر میں کام کرنے والے معمولی درجے کے ملازمین، کوٹھیوں اور گھروں کے مرد ملازمین وغیرہ شامل ہوتے

ہیں۔ ذرائع کے مطابق اس وقت صرف لاہور میں اس طرح کے اداروں کی تعداد 35 سے زائد ہے جو مختلف کمپنیوں سے روزمرہ کی اشیاء حاصل کر کے اپنی ملازم عورتوں کے ذریعے لوگوں میں فروخت کرتے ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ان اداروں کے پاس کمیشن پر کام کرنے والی عورتوں کی تعداد 500 سے زائد ہے۔ اس بات کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا کہ ان کے ہاں کام کرنے والی عورتوں کے مستقل اور غیر مستقل گاہکوں کی تعداد کیا ہے لیکن اس کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ اگر ان عورتوں کو ان کے جسم کے گاہک نہ ملیں تو یہ انتہائی کم کمیشن والی اشیاء فروخت کر کے بالکل گزارہ نہیں کر سکتیں۔ اصل میں یہ اشیاء فروخت کرنا ان کے اصل پیشے کیلئے ایک پردہ ہے، ایک آڑ ہے جس کو وہ بخوبی استعمال کرتی ہیں۔ جہاں وہ ملازمت کرتی ہیں اگر ان کی اشیاء بھی فروخت ہو جائیں تو ان کو بھی اس کمیشن میں سے ایک اچھا حصہ مل جاتا ہے۔

(vi) ٹریول ایجنسیاں

ٹریول ایجنسیوں اور عام طور پر ویزوں وغیرہ کا کاروبار کرنے والے اداروں میں بھی خوبصورت لڑکیوں کو ملازمت محض اس خیال کے تحت دی جاتی ہے کہ ان کی موجودگی اور خصوصاً ان کی جنسی کشش کے باعث ان کا کاروبار زیادہ چمکے گا اور ان کے مستقل گاہکوں میں اضافہ ہوگا۔ ان عورتوں کو بھرتی کرتے وقت سیکرٹری، استقبالیہ کلرک یا کمیشن ایجنٹ کے طور پر رکھا جاتا ہے اور ان کا انتخاب ان کے ظاہری حسن و جمال اور کشش کو مدنظر رکھ کر کیا جاتا ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ملازمت حاصل کرنے والی عورتوں کی کامیابی کی اصل وجہ ان کے کام اور ظاہری حسن و خوبصورتی کے متعلق مالک کا اطمینان ہوتا ہے جو یہ اطمینان کرنا چاہتا ہے کہ ان کی دفاتر میں موجودگی اس کے کاروبار کیلئے سود مند ثابت ہوگی یا نہیں۔ گاہکوں کو اچھے طریقے سے ہینڈل کر لینے والی اور ان کے ساتھ خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آنے والی خواتین کو اہمیت دی جاتی ہے۔